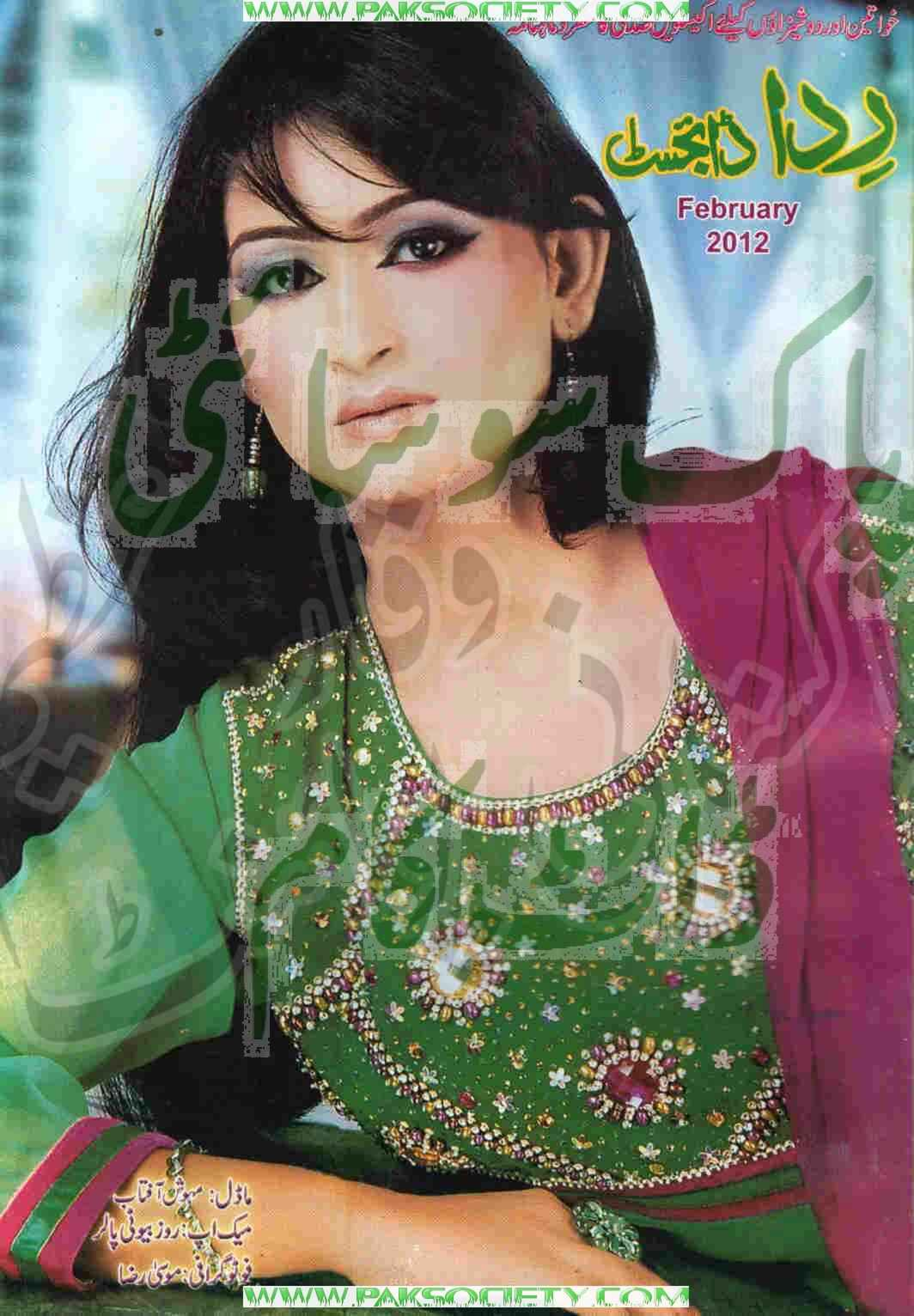


WWW.PAKSOCIETY.COM
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اکیسویں صدی کا منفرد ماہنامہ
ردا ڈائجسٹ
February
2012
ماڈل: سوش آفتاب
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی: موسیٰ رضا
WWW.PAKSOCIETY.COM

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

فروری 2012ء
جلد نمبر 17 شمارہ نمبر ۲
قیمت 50 روپے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
500 روپے

34535726

پبلشر و ایڈیٹر صالحہ محمود نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت: ۱۲۹/ڈی بلاک۔2۔پی۔ای۔سی۔ایچ۔سوسائٹی، کراچی

مستقل سلسلے



صالحہ محمود



فروری کا اداریہ لکھتے وقت یوں محسوس ہو رہا ہے زندگی دبے پاؤں گزر گئی اور ہمیں خبر نہ ہوئی' بے خبری کا عالم جب انسان پر طاری ہوتا ہے اس کے اندر بہت سارے موسم جاگ رہے ہوتے ہیں اور جب خزاں کی رُت پلٹ کر آتی ہے تو یوں لگتا ہے زندگی دبے پاؤں گزر گئی۔ بس ایسے ہی کسی موسم میں قطرہ قطرہ گرنے والے دکھ دریا بن گئے۔ بھیگے موسموں کی رُت نظروں سے سارے منظر مٹا گئی لیکن آنکھوں کا نمکین پانی کبھی نہ خشک ہوا۔ ہمیں اپنی بڑی دیرینہ دوست جسے ہم شفو کہتے تھے ایسے ہی کسی موسم میں انہی فروری کی رُت میں انہی لمحوں میں مجھ سے ہاتھ چھڑا کر ابدی نیند سو گئی۔ بے لوث محبتوں کا اک وہ خزانہ جو دل کے کسی دبیز خانے میں آج بھی بہت سرمائے کی طرح محفوظ ہے وہ ہے اس کی محبتیں' اس کی چاہتیں۔ کسی آباد جزیرے میں ہم ہاتھ پکڑ کر آج بھی گھومتے ہیں۔ خوابوں کے اس نگر میں بہت دور نکل جاتے ہیں اور پھر واپسی کا سفر اتنا سہل نہیں ہوتا۔ لیکن ہم مغفرت کیلئے کہتے ہیں کہ اللہ اس کی مغفرت کردے۔ یہ رُت' یہ موسم سب بدل جاتے ہیں مگر محبت حرفِ آخر ہے جو اپنی تمام شدتوں اور رفاقتوں کے ساتھ آنکھوں کی سمندری لہروں میں جزیرے آباد کرتی ہے۔

چلو پھر ہم ایک بار کسی ایسے ہی موسم میں تمہارے ساتھ چلتے ہیں جہاں تم سب ہمارے ساتھ ہوتے ہو۔ محبتوں کے پھول کھلتے ہیں۔ تمہارے لفظوں کی خوشبو بہت دور تک آتی ہے' اگر مڑ کر دیکھ لوناں تو یوں لگتا ہے میں گھر کا راستہ ہی بھول گئی۔ تمہاری چاہت' تمہاری محبتوں کا وہ فسوں جو جاگ رہا ہے میری چاہتوں میں' بھلا ہم آپ کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ تمہارا ایک ایک لفظ ہماری سوچوں پر دستک دیتا ہے۔ آپ مایوس مت ہوں۔ زندگی کے لمحات بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ جہاں آپ کو کسی کے چھوڑ جانے کا دھڑکا نہیں ہوتا۔

خوش نصیبی ہمیشہ دستک دیتی ہے۔ ہمارا ہر رائٹر اس بات کی گواہی ہے کہ ہماری سوچ کو ہمارے فکر و عمل کو آپ لوگوں نے اپنایا۔ اپنے قلم کی شدت میں اس عمل کا دخل نہ ہو۔ اللہ ہی قادر ہے اللہ ہی موت لکھتا ہے۔ آپ کسی بھی کردار کو کبھی فرضی موت مت دیں یہ اختیار میں نے آپ کو نہیں دیا اور نہ ہی میرے قلم سے آپ نے پڑھا ہوگا۔ اگر واقعی موت ہوئی ہے تو موت لکھئے۔ یہ میری ایک چھوٹی سی بات تھی جس کو تمام رائٹر اپنے دھیان میں رکھیں۔ کہانی کے اختتام کیلئے بہت سارے اور طریقے ہیں۔ سندیسہ لکھئے ہم جواب دینگے' نئے لکھنے والے رابطہ رکھیں۔ ردا ان کا ہے اور رہے گا۔

(آپی)

صالحہ محمود



حضرت اسامہ بن زیدؓ

ہجرت سے سات سال پہلے مکہ معظمہ میں رسول اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ قریش کے ہاتھوں ظلم و ستم کا نشانہ بنتے ہیں' تبلیغی میدان میں مسلسل آپ پر ملال' غم' واندوہ اور مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں' اسی تلاطم خیز دور میں آپ کی حیات طیبہ میں ایک خوشی کی لہر دوڑتی ہے' کسی نے آپ کو خوشخبری سنائی کہ ام ایمن کے گھر اللہ نے بیٹا عطا کیا ہے' یہ خبر سن کر آپ کے روئے انور پر بے انتہا خوشی کے آثار دکھائی دینے لگے' کیا آپ کو معلوم ہے یہ خوش بخت نومولود کون ہیں؟ جس کی ولادت سے رسول خدا ﷺ کو اس قدر خوشی ہوئی۔ "یہ نومولود اسامہ بن زیدؓ تھے"

صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو بھی رسول اکرم ﷺ کی اس بے انتہا خوشی پر تعجب نہ ہوا کیونکہ سبھی اس نومولود کے والدین کا حضور علیہ السلام کے ساتھ قریبی تعلق جانتے تھے' اسامہ کی والدہ برکت نامی ایک حبشی عورت تھیں جو ام ایمن کے نام سے مشہور ہوئیں اور یہ رسول اکرم ﷺ کی والدہ ماجدہ کی کنیز بھی رہ چکی تھیں انہیں یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ جب حضور ﷺ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کو اپنی گود میں لے لیا اور آپ کی نگہداشت کی' آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ام ایمن میری ماں کی مانند ہیں اور یہ میرے اہل بیت میں سے ہیں۔ یہ تو ہے اس خوش نصیب نومولود کی والدہ محترمہ کا تعارف رہے ان کے والد تو وہ ہیں حضرت زید بن حارثہؓ نزول قرآن مجید سے پہلے آپ نے انہیں اپنا بیٹا قرار دیا تھا' حضر و سفر میں انہیں آپ کے ساتھ رہنے کا شرف حاصل ہوا' علاوہ ازیں رازدان رسولؐ ہونے کی سعادت بھی ان کے حصے میں آئی۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ کی ولادت پر سبھی مسلمان اتنے خوش ہوئے کہ کبھی کسی کی ولادت پر اتنے خوش نہیں ہوئے تھے اس لئے کہ جس چیز سے نبی اکرم ﷺ کو خوشی حاصل ہوتی صحابہ کرامؓ کے لئے بھی وہ خوشی کا باعث بنتی۔

صحابہ کرام نے اسامہ کو لقب حب النبیؐ دے دیا' انہوں نے اس نومولود کو یہ لقب دینے میں کسی مبالغے سے کام نہیں لیا تھا حقیقتاً رسول اللہ ﷺ کو ان سے اتنا پیار تھا کہ سب مسلمان اس پر رشک کناں تھے۔

جس طرح بچپن میں حضرت اسامہؓ سے آپؐ نے پیار کیا اسی طرح جوانی میں بھی ان کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔ جب اسامہ بن زیدؓ جوان ہوئے تو عمدہ عادات اور اعلیٰ اخلاق سے متصف تھے' اس کے علاوہ حد درجہ کے ذہین' بہادر' دانشمند' پاک دامن' نرم خو اور پرہیزگار تھے' ان اوصاف حمیدہ کی بناء پر وہ لوگوں کی نگاہ میں پسندیدہ شخصیت قرار دیئے گئے' غزوہ احد میں اسامہ بن زیدؓ اپنے ہم عمر بچوں کے ہمراہ میدان جہاد کی طرف نکلے ان میں بعض کو تو جہاد کے لئے قبول کرلیا گیا اور بعض کو بہت چھوٹی عمر کی بناء پر شامل جہاد نہ کیا گیا جنہیں شامل نہیں کیا گیا ان میں اسامہ بن زیدؓ بھی تھے جب یہ واپس لوٹے تو زار و قطار رو رہے تھے کیونکہ انہیں رسول اکرم ﷺ کے جھنڈے تلے راہ خدا میں جہاد کرنے کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔

غزوہ خندق میں حضرت اسامہ بن زیدؓ اپنے ہم عمر نوجوانوں کے ہمراہ میدان کی طرف نکلے تو اپنے پنجوں کے بل اونچے ہو کر چلنے لگے کہ کہیں آج بھی نوعمری کی بناء پر جہاد میں شریک ہونے سے محروم نہ کردیئے جائیں' ان کی یہ حالت دیکھ کر نبی اکرم ﷺ بہت خوش ہوئے اور انہیں جہاد میں شریک ہونے کی اجازت دے دی' جب حضرت اسامہؓ نے راہ خدا میں جہاد کے لئے تلوار اٹھائی اس وقت ان کی عمر صرف پندرہ برس تھی۔

غزوہ حنین میں جب مسلمان شکست سے دوچار ہوئے تو اس نازک ترین موقع پر اسامہ بن زیدؓ حضرت عباسؓ ابوسفیان بن حارثؓ اور دیگر چھ صحابہ کرامؓ میدان کارزار میں ثابت قدم رہے اس چھوٹے سے بہادر جتھے کی بناء پر رسول اکرم ﷺ کے لئے یہ آسانی پیدا ہوئی کہ اللہ نے شکست کو فتح میں بدل دیا اور بھاگنے والے مسلمانوں کو ہزیمت سے بچالیا۔

جنگ موتہ میں حضرت اسامہؓ نے اپنے والد زید بن حارثہؓ کی قیادت میں جہاد کیا اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال سے بھی کم تھی' اپنی آنکھوں سے اپنے والد کی شہادت کا منظر دیکھا لیکن حوصلہ نہ ہارا' بلکہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی قیادت میں کفار سے نبرد آزما رہے' یہاں تک کہ یہ سپہ سالار بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ پھر عبداللہ بن رواحہؓ نے لشکر اسلام کی قیادت سنبھالی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد یہ بھی شہید ہو گئے تو حضرت خالد بن ولیدؓ کے جھنڈے تلے کفار سے نبرد آزمائی کا موقع آیا انہوں نے ایسی جنگی حکمت عملی اختیار کی کہ جس سے یہ لشکر اسلام کو روم کے مضبوط آہنی پنجے سے چھڑانے میں کامیاب ہو گئے۔

11 ہجری کو رسول اکرم ﷺ نے رومیوں سے جنگ کرنے کے لئے لشکر اسلام کی تیاری کا حکم صادر فرمایا اور اس لشکر میں حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ جیسے جلیل القدر صحابہؓ موجود تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس لشکر کا امیر حضرت اسامہ بن زیدؓ کو مقرر کیا' جبکہ ان کی عمر ابھی صرف بیس سال تھی' انہیں حکم دیا کہ علاقہ بلقاء اور قلعہ داروم کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالیں جو کہ بلاد روم کے غزہ نامی شہر کے قریب واقع ہے' لشکر ابھی تیاری میں مصروف تھا کہ رسول اکرم ﷺ بیمار ہو گئے' جب مرض نے شدت اختیار کی تو لشکر اس صورتحال کو دیکھ کر روانہ نہ ہوا۔

حضرت اسامہؓ فرماتے ہیں جب نبی اکرم ﷺ پر بیماری کا شدید حملہ ہوا تو میں اور میرے چند ساتھی تیمارداری کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے بیماری کی شدت کی بناء پر آپ بالکل خاموش تھے آپ اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتے پھر اسے مجھ پر رکھ دیتے' میں سمجھ گیا کہ آپ میرے حق میں دعا کر رہے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد حبیب کبریاؐ اللہ کو پیارے ہو گئے اب حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔ تمام صحابہؓ نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی آپ نے خلیفہ منتخب ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ کی قیادت میں لشکر اسلام کو اس مشن پر روانہ کیا جس کا حکم رسول اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں دیا تھا لیکن انصار میں سے چند صحابہؓ کی یہ رائے تھی کہ لشکر کی روانگی میں کچھ تاخیر کر دی جائے تو بہتر ہوگا' انہوں نے حضرت عمر بن خطابؓ سے کہا کہ وہ اس سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ سے بات کریں اور ساتھ ہی یہ مشورہ دیا کہ اگر حضرت ابوبکرؓ لشکر کی فوری روانگی پر مصر ہوں تو ہماری طرف سے انہیں یہ پیغام پہنچا دیں کہ ہمارا امیر کسی ایسے شخص کو بنایا جائے جو اسامہؓ سے زیادہ عمر رسیدہ اور تجربہ کار ہو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کی زبانی انصار کا یہ پیغام سنا تو غضبناک ہو گئے اور غصے کی حالت میں فاروق اعظمؓ سے فرمایا۔

''اے ابن خطابؓ کتنے افسوس کی بات ہے رسول اللہ ﷺ نے تو اسامہؓ کو امیر لشکر بنایا اور تم مجھے مشورہ دیتے ہو کہ میں اسے معزول کر دوں' خدا کی قسم یہ کبھی نہیں ہو سکتا''۔ جب حضرت عمر فاروقؓ لوگوں کے پاس واپس لوٹے تو انہوں نے دریافت کیا کہ خلیفۃ المسلمین نے کیا جواب دیا؟

حضرت عمرؓ نے فرمایا' تمہیں تمہاری مائیں گم پائیں' جلدی سے اپنے مشن پر چل نکلو' میں نے آج تمہاری وجہ سے خلیفہ رسول کو ناراض کیا۔

جب یہ لشکر اپنے نوجوان قائد کی زیر کمان روانہ ہوا تو خلیفہ رسول سیدنا ابوبکر صدیقؓ انہیں الوداع کہنے کے لئے تھوڑی دور تک پیدل ساتھ چلے جبکہ حضرت اسامہؓ گھوڑے پر سوار تھے' حضرت اسامہؓ نے کہا اے خلیفہ رسولؐ! بخدا یا تو آپ بھی گھوڑے پر سوار ہو جائیں ورنہ میں گھوڑے سے اترتا ہوں' صدیق اکبرؓ نے ارشاد فرمایا بخدا! نہ تو آپ نیچے اتریں گے اور نہ ہی میں سوار ہوں گا پھر فرمایا کیا میرے لئے یہ اعزاز نہیں کہ کچھ عرصے کے لئے اپنے پاؤں اللہ کی راہ میں غبار آلود کروں؟ حضرت اسامہؓ کو دعائیں دے کر جہاد پر روانہ کیا اور کہا رسول خدا ﷺ نے تمہیں جو وصیت کی ہے اس کے مطابق سرگرم عمل رہنا پھر سرگوشی کے انداز میں فرمایا اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو میری معاونت کے لئے میرے پاس رہنے دیں تو بہتر ہوگا' حضرت اسامہؓ نے آپ کی رائے سے اتفاق کیا اور حضرت عمرؓ کو وہیں رہنے دیا۔ حضرت اسامہ بن زید لشکر کو لے کر چل پڑے اور اس مشن کی کامیابی کے لئے ہر وہ کوشش کی جس کا رسول خدا ﷺ نے حکم دیا تھا۔

حضرت اسامہؓ اس مہم کو سر کر کے بڑی شان و شوکت سے اپنے والد گرامی کے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہوئے اور کثیر مقدار میں مال غنیمت کے ساتھ بخیر و عافیت لوٹے' یہاں تک کہ یہ بات لوگوں میں مشہور ہو گئی کہ حضرت اسامہؓ کے لشکر سے بڑھ کر آج تک کوئی لشکر اتنی کثرت سے مال غنیمت نہیں لایا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا مسلمانوں کے دلوں میں حضرت اسامہؓ کی قدر و منزلت بڑھتی گئی اور یہ عزت و وقار اور عظمت و شان رسول اکرم ﷺ کے ساتھ وفاداری کے نتیجے میں آپ کو میسر آئی۔

فاروق اعظمؓ نے اپنے دور خلافت میں حضرت اسامہؓ کے لئے اپنے بیٹے سے زیادہ وظیفہ مقرر کیا تو بیٹے نے عرض کی ابا جان آپ نے اسامہ کے لئے چار ہزار اور میرے لئے تین ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا حالانکہ اس کے باپ کو وہ فضیلت حاصل نہ تھی جو آپ کو حاصل ہے اور اسامہ کو وہ مقام حاصل نہیں جو میرا ہے' بیٹے کی یہ بات سن کر فاروق اعظمؓ نے ارشاد فرمایا بیٹے افسوس تجھے علم نہیں' سنو! اس کا باپ تیرے باپ سے زیادہ رسول خدا ﷺ کو عزیز تھا' اور یہ خود بھی آنحضرت ﷺ کو تجھ سے زیادہ پیارا تھا۔

یہ جواب سن کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ خاموش ہو گئے اور اسی وظیفہ پر راضی ہو گئے جو ان کے لئے مقرر کیا گیا تھا' حضرت عمر بن خطابؓ جب بھی حضرت اسامہؓ سے ملتے تو خوشی سے پکار اٹھتے خوش آمدید میرا سردار آ گیا' جب کوئی ان سے اس والہانہ انداز پر تعجب کرتا تو فرماتے' تمہیں معلوم نا ایک موقع پر رسول اکرم ﷺ نے اسامہ کو میرا امیر بنایا تھا۔

ان قدسی نفوس پر رحمت خدا اپنی برکھا برسائے' بلاشبہ رسول اکرم ﷺ کے صحابہ کرامؓ انسانیت کے اعلیٰ و اکمل اور افضل مقام پر فائز تھے' تاریخ نے کبھی ان جیسے قدسی انسانوں کو نہیں دیکھا۔

☆☆☆



صالحہ محمود

قسط نمبر 2۔

سلسلے وار ناول

رگِ جاں سے جو قریب تھے

''ادھر آؤ اشمل!'' وہ بہت غور سے اسے دیکھتی ہوئی پلٹ کر گئی تھیں۔ جب سے اشمل باہر سے آیا تھا اس کا زیادہ تر وقت دادی کے ساتھ ہی گزر رہا تھا لیکن صبا کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی کہ ان کا بیٹا دادی سے اتنا قریب رہے خاص طور پر جب رومی گھر آئی ہوئی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں دادی کے کمرے کے چکر لگانا' اشمل کے دادی سے سوالات صبا کی نظروں میں کھٹک رہے تھے۔ بات کوئی بھی ہو ابتدائی مراحل میں آ کر اپنے شک وشبہات کو ظاہر ہونے سے پہلے ہی روک دیا جائے تو حالات وہیں پر رک جاتے ہیں۔ ان کی سوچ کا محور بہت شدت سے غالب تھا اسی لئے اس بار اشمل سے انہوں نے بڑے سخت لہجے میں پوچھا۔

''اشمل......! یہ کیا مذاق ہے؟ میں نے دیکھا کہ جب سے وہ لڑکی گھر آئی ہے تم اس کے ارد گرد چکراتے رہتے ہو' کیا بات ہے؟ کیا تم سب کچھ بھول گئے ہو اور ہر وقت دادی کے کمرے میں چکر لگاتے رہتے ہو''۔

''اونو مام! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ''۔ اس نے بھاگتی ہوئی ایزل کو پکڑ لیا تھا۔

''چھوڑو اس کو' بچوں جیسی حرکتیں کرتے ہو' جو بات کر رہی ہوں اس کا جواب دو''۔

''مام! کیا جواب دوں' آپ تو ہر بات میں شک کرتی ہیں''۔ ایزل ہاتھ سے اچھل کر نکل گئی۔

''او مام! آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟'' اس نے ہاتھ اپنی ماں کے گرد حمائل کیے تو انہوں نے ہنس کر اس کے بازو کو اپنے سامنے کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''دیکھو اشمل! ہم نے اپنے اسٹیٹس کے اندر ہی رہنا ہے' تمہارا باپ ہو یا تمہاری دادی ان سب کو ایک احساس کمتری سا ہے' یہ ہائی اسٹیٹس پر تو پہنچ چکے ہیں لیکن ان کے ارد گرد بسنے والے ابھی بھی وہ لوگ ہیں جن سے اپنا یہ تعلق نہیں توڑ سکے''۔

''مام پلیز......! یہ ٹاپک بہت پرانا ہو گیا ہے۔ بھائی' بہن' خاندان یہ ایسی چیزیں نہیں ہوتیں کہ ہم انہیں توڑ سکیں ورنہ میں پاپ کی ایک کال پر بھی نہیں آتا''۔ وہ بڑی معصومیت سے بولا۔

''اسی بات کا تو مجھے دکھ ہے''۔ ان کے اندر کی تمام نفرت لہجے سے چھلک پڑی تھی۔

''مام پلیز......!'' اشمل نے ساری تلخی محسوس کر لی تھی۔

''کیوں نہیں ولید نے حذیفہ کو بلایا؟ تمہیں ڈسٹرب کرنا کیا ضروری تھا''۔ ان کے لہجے میں تلخی تھی۔

''ماما! حذیفہ کا سمسٹر بہت قریب تھا وہ تو خود آنا چاہ رہا تھا لیکن میرا دل چاہ رہا تھا اس لیے میں آ گیا''۔ اس کا لہجہ بہت راحت رساں سا تھا لیکن نا جانے کیوں صبا کے اندر ایک اضطرابی کیفیت اور خوف سا غالب تھا۔ ان کی پوری

زندگی ولید کے ساتھ اسی خوف میں گزری' ولید حیدر کا سخت مزاج' اصول پسندی' ان کی طرز زندگی اور سوتیلے بیٹے حذیفہ کی موجودگی انہیں ہمیشہ بے قرار رکھتی تھی۔

بے حد آرائش کی زندگی کے باوجود ان کے دل کے اندر ایک خلا تھا اور ذہن پر لفظ ''کاش'' حذیفہ نہ ہوتا...... اور جہاں لفظ ''کاش'' آ جائے تو بس ایسا ہے کہ پوری کائنات الٹ پلٹ جاتی ہے۔ انسان اپنے وجود کے اندر ہی خوف اور خدشات میں گھرتا رہتا ہے۔ بے سکونی جب حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو رشتوں کے درمیان بھی فاصلہ پیدا ہوتا جاتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ صبا' ولید حیدر کے ذہن کے مطابق خود کو نہ ڈھال سکیں' وہ چاہتی تھیں کہ ولید حیدر رشتے داروں سے تعلق توڑ لیں جبکہ ولید حیدر بے حد دولت مند تھے مگر انہیں اپنے رشتے داروں میں بیٹھ کر اپنی پچھلی باتوں پر ہنسنا اور سوچنا اچھا لگتا تھا۔ غریب رشتے دار بہت زیادہ انہیں اہمیت دیتے تھے کہ ولید حیدر اتنے بڑے آدمی بن گئے ہیں مگر اپنی رشتے داری کو ابھی تک نبھاتے رہتے ہیں۔ ولید حیدر جوں جوں دولت مند ہوتے گئے اتنا ہی وہ اللہ سے قریب تر ہوتے گئے۔ ہر تقریب میں بیٹھ کر رشتے داروں کو بتاتے۔

''جنتی کی چار نشانیاں ہیں۔ رشتے داروں سے جڑے رہو' تہجد پڑھتے رہو' بھوکوں کو کھانا کھلاؤ' سلام دعا کرو''۔

وہ خود بھی اس پر عمل کرتے تھے جبکہ صبا بالکل برعکس تھیں ان کی کوشش ہوتی کہ ولید حیدر کے رشتے داروں میں وہ نہ جائیں اور نہ ہی ان کے رشتے دار ولید حیدر ہاؤس آئیں' کچھ دنوں سے رومی آ جا رہی تھی۔ رومی کا رنگ روپ دیکھ کر انہیں تھوڑا سا خوف آنے لگا تھا۔ وہ اڑتی پڑتی خبر سعیدہ اور ولید کے بارے میں سن چکی تھیں۔ خیر سعیدہ کی حالت دیکھ کر تو انہیں کبھی خوف نہیں ہوا لیکن سعیدہ کی بیٹی جب سامنے آئی' وہ بھی ساس کے کمرے میں آتے جاتے اشمل سے ٹکرائی تو رومی کی اچھل کود ایزل کے ساتھ اور اشمل کے ساتھ بالکل انہیں پسند نہیں تھی۔

''بس اشمل! تمہارا باپ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے تمام رپورٹس کلیئر ہیں' اب تم اپنا بوریا بستر باندھو اور جاؤ امریکا''۔ وہ کہہ کر مڑیں تو اشمل نے ان کا آنچل تھام لیا۔

''مام پلیز! یہاں مزہ آتا ہے پاکستان میں' جو کچھ ہے میں یہیں پر کرلوں گا' اب پاپ بھی یہی چاہتے ہیں''۔

''حذیفہ کافی ہے جو کچھ ہے وہی کرے گا''۔ انہوں نے اپنا دوپٹہ ایک جھٹکے سے چھڑا لیا۔

''میں تمہیں اس گھٹے ہوئے ماحول میں نہیں رکھنا چاہتی' تم فوراً یہاں سے واپس جاؤ' تمہارے ماموں کا پلان ہے کہ تم وہیں سیٹ ہو جاؤ انڈر اسٹینڈ اور اس کے علاوہ ارج پاکستان میں رہنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی' اس کا مزاج' اس کا اسٹائل یہاں کے لوگوں سے مختلف ہے''۔

''لیکن مام! مجھے تو پاکستان پسند ہے' ارج کو تو میں مجبور کردوں گا''۔ وہ گھگھیا کر بولا تھا۔

''کوئی ضرورت نہیں الٹی سیدھی حماقت کرنے کی انڈر اسٹینڈ۔ تمہارا باپ کبھی بھی پسند نہیں کرے گا کہ تم ارج سے شادی کرو''۔ تو بڑے غصے سے اشمل ماں کی بات کاٹتے ہوئے پلٹ کر بولا تھا۔

''مام! آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ بس پاپ کے بارے میں ایک لفظ مت بولیے گا' حذیفہ بھی آپ کی باتوں سے بہت ہرٹ ہوتا ہے۔ مام! آپ کیوں ایسا سوچتی ہیں' آج ہم یہاں تک پہنچے ہیں تو یہ سب پاپ کی بدولت ہے اور دادی کی دعاؤں کا نتیجہ ہے''۔

''جی نہیں...... میں نے بھی اس بزنس میں خون' پسینہ' دماغ سب تمہارے باپ کو دیا ہے وہ تنہا وارث نہیں ہیں اور حذیفہ کا اس میں کچھ بھی نہیں ہے''۔ وہ غصے کی انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔

''مام بس پلیز...... ایسی باتیں مت کریں جس سے دادی ہرٹ ہوتی ہیں''۔ وہ بہت سنجیدگی سے بولا تو صبا ایک گہری سانس لے کر تڑپ کر بولیں۔

''ہوتی ہیں تو ہو جائیں' اب جان بھی چھوٹے۔ 70 سال کی ہوگئی ہیں بڑی بی' ابھی تک جان کو اٹکی ہوئی بیٹھی ہیں' جانے کہاں سے گاؤں گوٹھوں کے لوگ اکھڑ اکھڑ کے آ رہے ہیں۔ اس لڑکی سے کوئی رشتہ ہے اف میرے خدا...... تمہاری دادی کی نند کی بیٹی سعیدہ' اس کی بیٹی یہاں گھوم رہی ہے اگر' چلو کوئی قریبی رشتہ ہو تو میں ایکسپیٹ کرلوں۔ فخریہ کل تمہارے ملازموں کو بتا رہی تھیں تمہاری دادی کہ شاید تمہیں یاد ہے کہ بی بی کی بیٹی سعیدہ تھیں' ہم سب اکٹھے رہے تھے یہ اس کی بیٹی ہے' سعیدہ کی بیٹی ہے...... بتاؤ ڈھوبیوں سے رشتہ بتا رہی ہیں تمہاری دادی۔ دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے ان کا''۔ اشمل نے ایک گہرا سانس لیا تھا اور جاتے جاتے ماں سے پھر بولا تھا۔

''مام پلیز...... پاپ بیمار ہیں' ان کی رپورٹس صحیح نہیں ہیں' آپ گھر کا ماحول ٹھیک رکھئے اور اگر آپ چاہیں تو کچھ دنوں کیلئے ماموں کے پاس چلی جائیں''۔

''جی ہاں...... تاکہ تمہارا باپ ولید ہاؤس کو یتیم خانہ بنا دے اور ہونا بھی یہی ہے ایک دن۔ میں ولید کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں اور تمہاری دادی ہر وقت ولید کے کان بھرتی ہیں کہ...... وہ نانا اور نانا کے چچا کی بھتیجی کے گھر شادی ہے ولید اس کی مدد کرو۔ ولید چیک پکڑا دیتا ہے' وہ لوگ واہ واہ کرتے ہیں اور ولید کے آگے بھنگڑا ڈالتے ہیں' ہوتا یہی ہے کہ لنگڑے لولے سب ولید سے رشتے داریاں نکالتے ہیں۔ او ہو' او ہو...... اس وقت ولید ہواؤں میں اڑ رہے ہوتے ہیں' مت پوچھو کچھ اور یوں تمہاری دادی جنت کما رہی ہوتی ہیں' اپنے پچھلے گناہوں کو دھوتی ہیں' پہلے تو سسرال والوں کے ساتھ ظلم کرتی رہیں' جس بی بی کا کلمہ پڑھتی ہیں ناں مجھے سب خبر ہے اور ولید بھی کم نہیں ہیں''۔ وہ پیر پٹخ کر آگے بڑھیں تو اشمل بہت تیزی سے ان کے پیچھے بڑھا' صبا غصے سے پلٹ کر اندر گئی تھیں' اشمل پلٹ کر چلا گیا تھا۔

''ہیلو ارج! میں پھپھو بول رہی ہوں''۔ انہوں نے اندر جا کر فوراً ہی کال کی تھی۔

''جی پھپھو! آپ کیسی ہیں؟''

''میں ٹھیک ہوں مگر یہ اشمل یہاں آ کر بیٹھ گیا ہے تم اس کو فوراً کال کرو اور اس کو بلاؤ۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ یہ زیادہ دن یہاں رہے''۔ ان کے لہجے میں خوف اور غصہ بھی تھا۔

''لیکن پھپھو! کل رات بھی میں نے اشمل سے بات کی ہے وہ نہیں آنا چاہتا بلکہ الٹا یہ کہہ رہا ہے کہ تم یہاں آ جاؤ''۔ وہ ہنس کر بولی۔

''اس کا تو دماغ خراب ہے' اگر تم نے اس کو کنٹرول ابھی سے نہیں کیا تو میں بتا رہی ہوں کہ وہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ دو مہینے سے وہ یہاں گھوم رہا ہے' کبھی باپ کی بیماری' کبھی دادی کی بیماری ایزل کے بہانے بہانے سے وہ لڑکی کے پیچھے بھاگ رہا ہے' وقت سے پہلے ہی تم اسے روک لو''۔

''اوہو پھپھو! آپ اشمل کو نہیں جانتی ہیں' وہ میرے بغیر ایک پل رہ ہی نہیں سکتا۔ پھپھو! میں جب چاہوں گی وہ آ جائے گا ڈونٹ وری۔ پھپھو! وہ بہت جولی نیچر ہے ہر لڑکی سے وہ فری ہو جاتا ہے لیکن جب کوئی اس کے قریب آتی

ہے تو وہ بھاگ جاتا ہے''۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

''نہیں ارج! مرد کی ذات پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے' یہ ایک پل میں بدل جاتے ہیں''۔ صبا نے پھر اسے خوف دلایا تھا۔

''تو پھپھو..... تو پھپھو! وہ ان میں سے نہیں ہے آپ پریشان مت ہوں' میری اور اس کی بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے' وہ ایک ایک بات جانتا ہے کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کل بھی وہ بہت دیر تک یہی کہہ رہا تھا کہ میں تھوڑے دن کیلئے پاکستان آجاؤں''۔ وہ تسلی بھرے لہجے میں بولی۔

''تم اس کو بولو کہ وہ جلد واپس آجائے''۔

''پھپھو! آجائے گا کچھ دن بعد''۔ وہ پھر بولی تھی تو صبا بولیں۔

''ارج! مجھے ایک پل بھی اچھا نہیں لگتا کہ میرا بیٹا ان لوگوں کے بیچ میں رہے آ کر اور ننھے بھائی کیسے ہیں؟''

''بابا تو ٹھیک ہیں البتہ مام بیمار ہیں۔ فلو اور نزلہ کھانسی ہے' اوکے پھپھو! اس سے کہیے کہ مجھے کال بیک کرے میں سمجھا دوں گی''۔ وہ بہت پرسکون لہجے میں صبا سے بولی تھی۔ صبا کو ارج سے بات کر کے تھوڑا سا اطمینان ضرور ہوا تھا مگر دل ابھی تک مضطرب سا تھا' نیند بھی انہیں نہیں آرہی تھی۔

ولید حیدر بے حد مصروف انسان تھے ان کا کئی ممالک میں پھیلا ہوا بزنس جس کی وجہ سے وہ بہت مصروف رہتے تھے ملک سے اکثر وہ باہر رہتے تھے' چند دن کیلئے وہ پاکستان آتے تھے لیکن اپنے فرائض سے کبھی بھی غافل نہیں ہوئے۔ ماں کی دیکھ بھال کیلئے انہوں نے فل ٹائم میڈ کا بندوبست رکھا ہوا تھا' اس کے علاوہ بھی رشتے دار آتے جاتے تھے' وہ اتنے مصروف تھے کہ انہیں اشمل کے آنے جانے کی کوئی خبر نہیں تھی بلکہ آج جب میڈ نے اشمل اور صبا کے درمیان ہونے والی بات دادی کے گوش گزار کی تو دادی بھی چونک سی گئی تھیں۔

رات سرسری طور پر ولید حیدر سے انہوں نے اشمل کا ذکر کیا تھا لیکن اس وقت بھی وہ اتنے مصروف تھے بار بار فون پر کال آرہی تھی۔

''کون امی کون.....'' تو وہ مسکرا کر بولی تھیں۔

''سعیدہ گاؤں سے آئی ہوئی ہے''۔ تو ولید حیدر تھوڑی دیر کیلئے چپ سے ہوئے اور نظر انداز کر کے امی سے دوبارہ مخاطب ہوئے۔

''ارے امی! وہ بشیر چچا نہیں تھے یاد آیا آپ کو جو پرانے والے گھر میں ابا کے پاس آیا کرتے تھے' آج آفس میں ان کا بیٹا آیا تھا کوئی مسئلہ تھا اس کا ٹرانسپورٹ کا کام کرتا ہے' انکم ٹیکس کا معاملہ تھا۔ میں نے کچھ دے دلا کر رفع دفع کرادیا''۔

''اچھا کیا ولی! تم اپنوں کے کام آتے ہو۔ سعیدہ بھی بے چاری گاؤں سے آئی ہوئی ہے' اپنی بیٹی کیلئے پریشان ہے' وہاں تو کوئی رشتے ملتے نہیں ہیں' وہ چاہ یہ رہی ہے کہ اپنی بیٹی کو یہیں بیاہ کر واپس چلی جائے۔ صورت شکل کی بہت پیاری ہے' پھپھو کے گھر رشتہ چل رہا ہے اس کا' اللہ کرے ہو جائے' جو کچھ ہوگا ہم دے دلا دیں گے۔ میں نے تو سعیدہ سے کہہ دیا ہے کہ فرنیچر تو ولید دے گا تم فکر نہ کرو''۔

''کیسی ہے وہ امی؟'' ولید نے دبے دبے لفظوں میں نظر اٹھا کر امی کی طرف دیکھا تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! اپنے گھر خوش ہے' بس بیٹی کی طرف سے پریشان ہے گاؤں میں مسئلے ہیں وہاں اس کو نہیں

رکھنا چاہتی''۔

''کیا نام ہے امی! اس کے شوہر کا.....''

''عادل..... شکیل کے گھر سعیدہ کی بیٹی رہ رہی ہے' کبھی کبھار تمہاری خالہ میرے پاس بھیج دیتی ہیں''۔ انہوں نے آہستہ سے بیٹے کو بتایا۔

''امی! آپ جو کچھ دینا چاہتی ہیں بتا دیجیے گا''۔ وہ بھی آہستہ سے بولے تھے کہ صبا نہ سن لے۔

''چھوڑیں امی!'' ولید کے پاس خود اتنا وقت نہیں تھا کہ پیچھے مڑ کر دیکھتے' آگے ہی بڑھتے چلے گئے' قدم قدم پر انہیں خوشیاں ملتی چلی گئیں' دولت کے انبار لگتے رہے۔ صبا سے پہلے خوبصورت ترین بیوی ان کی زندگی میں ماں کی اپنی پسند سے زیبا آ گئی لیکن نا جانے کیا ہوا کہ زیبا' حذیفہ کی پیدائش پر زندہ نہ رہیں۔ ولید خوف سے مذہب کی طرف مائل ہو گئے کہ ایسا کیوں ہوا ان کے ساتھ اور پھر وقت کی رفتار نے ان کے زخموں پر مرہم رکھ دیا تو صبا آہستہ سے ان کی زندگی میں آ گئیں۔ خود ماں بھی خوفزدہ سی رہنے لگیں' اللہ سے ڈر کر توبہ کرنے لگیں کہ یہ کیا ہوا؟ زیبا ان کی پسند ایک پل میں آنکھوں سے دور ہو گئی اور صبا نے وہ جگہ لے لی تب سعیدہ کا چہرہ آہستہ آہستہ انہیں خوفزدہ کرنے لگا' تب سے وہ اپنے سسرال کی فیملی سے زیادہ قریب ہو گئیں۔ انہیں ہر وقت سعیدہ کا خیال رہنے لگا کہ سعیدہ کیسی ہے؟ سعیدہ کب آرہی ہے؟ سعیدہ کب جائے گی؟ ان کے حواسوں میں بس یہی نام سمایا رہا لیکن ان کے دل کے بھید کو کوئی نہیں جان سکا۔ کبھی کبھی ان کا دل چاہتا کہ وہ سعیدہ سے معافی مانگ لیں لیکن وہ چپ ہو جاتیں۔ وہ راز جو پورا خاندان نہ جان سکا سوائے ان کے اور سعیدہ کے' اچانک بی بی اپنے بچوں کو لے کر ولید حیدر ہاؤس سے کیوں چلی گئیں؟ لوگ آج بھی ماضی کی طرف پلٹ کر سوچتے اور یہی کہتے تھے کہ پتہ نہیں ایسا کیا ہوا کہ راتوں رات بی بی نے اپنا سامان اٹھایا اور گھر سے چلی گئیں۔ ولید تو سعیدہ پر جان دیتے تھے اچانک ان کے بیچ ایسا کیا ہوا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر سعیدہ کے جانے کے بعد اچانک زیبا آ گئی اور سعیدہ اور ولید کی وہ کہانی یوں خاموش ہو گئی کہ جیسے کوئی بات نہ تھی' کوئی لفظ بھی نہ نکلا' کوئی آواز بھی نہ آئی۔

ایک مرد کی سرشت نے بچپن کی محبت کو ایک پل میں ہوا میں اڑا دیا جیسے مشت غبار ہو اور سعیدہ بھی اپنی زندگی میں یوں پلٹ گئی کہ جیسے کوئی بات نہ ہو' کوئی خیال نہ تھا' کوئی احساس نہ تھا' دل کی آہٹ کی کسی کو خبر نہ تھی' ہونٹ صدائے جرس نہ دے تو قافلے والوں کو خبر کیا ہوتی' ایک محبت تھی جو خاموش کہیں سو گئی تھی۔ زندگی اپنے درمیان فاصلوں کو پھر سمیٹ لائی تو سنگ ریزے محبت کی داستان بھلا کیا بتاتے۔ ایک دیوار بن گئی کوئی جان ہی نہ سکا کہ سعیدہ کے چہرے پر ملال کیوں نہ آیا اور ولید دیوانہ وار سعیدہ کے پیچھے کیوں نہ بھاگا لیکن ولید حیدر ہاؤس میں زیبا کے بعد صبا کا روپ ابھر کر سامنے آیا تو ولید تو نہیں البتہ امی جان آہستہ آہستہ اپنے جرم اور گناہ کے بیچ دوڑتے دوڑتے تھک گئیں۔ تھکن جب زیادہ بڑھی تو ہر وقت سعیدہ اور بی بی کی خبر گیری کرنے لگیں۔ رشتوں سے قریب ہو گئیں' محبتوں کے ڈھیر میں ہر لمحہ گرجتی ہوئی' شور کرتی ہوئی صبا کے چہرے میں سعیدہ کی معصوم آنکھیں ہر وقت دیکھنے لگیں' تب امی جان نے گھبرا کر اپنی بڑی بہن کو فون کیا تھا۔

''آپا! سعیدہ آئی ہے کیا؟ کیسی ہے سعیدہ؟ کیا کر رہی ہے سعیدہ؟'' پھر ساری زندگی کے مسائل سعیدہ کے وہ بانٹنے لگیں۔ رومی کی شکل دیکھ کر سینے سے لگا کر روئی تھیں۔

''یہ تو بالکل سعیدہ کی شکل ہے۔ تمہاری شکل کی تھی تمہاری ماں۔ میرے ہی پاس تو وہ پل کر بڑی ہوئی ہے' کبھی

سعیدہ نے بتایا کہ وہ میرے پاس رہتی تھی؟''

''جی چھوٹی دادی...... !امی ذکر کرتی رہتی ہیں''۔ رومی نے ہنس کر بتایا تھا۔

''کوئی شکایت کرتی ہے وہ؟'' تو رومی نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''پھر بھی بیٹا! سعیدہ کچھ تو کہتی ہوگی''۔

''نہیں دادی! بس ماموں کی باتیں زیادہ کرتی ہیں کہ ماموں ہر وقت مجھے آواز دیتے تھے''۔ وہ ہنسنے لگی تو گھبرا کر دادی نے اپنا رخ موڑ لیا تھا۔

''آؤ میرے پاس بیٹھو' میرے پاس رہا کرو' میں نے تمہاری دادی سے بات کرلی ہے۔ یہاں بور تو نہیں ہوتیں' چلو اچھا ہوا اشمل آیا ہوا ہے' اشمل سے بات چیت کرلیا کرو' تم حذیفہ سے ملوگی ناں تو وہ بھی اشمل کی طرح ہے۔ آئے گا چھٹیوں میں اس کا ابھی سمسٹر چل رہا ہے۔ اشمل تو تمہارے ماموں کی بیماری کا سن کر آگیا''۔

''جی دادی!''

''اور تمہاری پھپھو سب ٹھیک ہیں؟ سنا ہے سعیدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی' تم اس کا خیال رکھا کرو''۔

''ولید بالکل اشمل کی طرح ہے' شکل تمہارے دادا سے ملتی ہے' اشمل کے دادا اور وہ ایشل ہے ناں اس کے دادا دونوں سگے بھائی تھے اور تمہاری دادی اور ہم دونوں سگی بہنیں ہیں۔ ان کی ایک ہی بہن تھیں بی بی' بہت پیار تھا آپس میں ان کا' بس سب ادھر اُدھر ہوگئے بیٹا! تم آجاتی ہو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میری بہن بہت نصیبوں والی ہے جسے سعیدہ ملی اور تم جیسے اچھے سعیدہ کو بچے ملے''۔ رومی بڑی دلچسپی سے دادی کے قریب بیٹھی ہوئی گزرے دنوں کی کہانی سن رہی تھی۔ دادی کو بھی بڑا اچھا لگتا تھا کہ کوئی تو ہے جو اُن کے پاس آکر بیٹھ جاتا ہے اسی لئے انہوں نے فون اٹھا کر اپنی بڑی بہن سے رابطہ کیا تھا۔

''آپا! رومی کیسی ہے؟''

''کیوں ہماری رومی کی تمہیں یاد آرہی ہے؟ دیکھو زبیدہ! کتنی پیاری ہے رومی' پھپھو نے مانگ لیا ہے اسے۔ آج کل تو میرے پاس آئی ہوئی ہے''۔

''سچ پوچھو تو آپا! رومی تو ہے بڑی پیاری بچی' میرا دل تو چاہتا ہے کہ ہمیشہ کیلئے رکھ لوں''۔

''ارے چھوڑو زبیدہ! صبا مکھی کی طرح نکال کر پھینک دے گی اسے' کہاں رومی چلے گی تمہارے گھر میں' جب تک تم ہو تو یاد کرلیتی ہوں' کہاں ولید کہاں ہم لوگ''۔ وہ بہت دکھی لہجے میں بولیں۔

''کیوں ہمارے ولید کو کیا ہوا ہے' بس مصروف ہے' کئی بار تمہیں پوچھ چکا ہے''۔ وہ بات بنا گئیں۔ لیکن حقیقت تھی کہ اب ولید کے پاس وقت نہیں تھا' وہ بے حد مصروف تھے۔ ماموں سے اور خالہ سے انہیں اتنی قربت نہیں تھی البتہ چچا اور تایا سے میل جول رکھتے تھے۔ خالہ کو ہمیشہ شکایت رہی کہ ولید گھر نہیں آتا۔

◈............☆............◈

بجلی کا بحران اپنے عروج پر تھا۔ لائٹ صبح سے غائب تھی۔ شام ہوتے ہوتے اماں نڈھال ہوکر گر گئیں۔ Asthma کی مریضہ تھیں شدید اٹیک ہوا تھا' دوائیں اور ان ہیلر بھی کام نہیں کر رہا تھا اور اماں بڑی گہری گہری سانسیں لے رہی تھیں۔ ماہم کو یوں لگ رہا تھا کہ زندگی کی ڈور ٹوٹ رہی ہے' اندھیرا بڑھتا جائے گا اور زندگی ختم ہوجائے گی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا' رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ابا بے بسی سے اپنی جگہ

اٹھتے نظر آئے۔ گھر میں پیسے نہیں تھے کہ ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔ اماں بے بسی سے تڑپ رہی تھیں' ابا سر جھکائے مایوسی سے بول رہے تھے۔

''حماد نے پیسے تو بھیج دیئے ہیں لیکن عماد جیب میں لئے ہوئے گھوم رہا ہے''۔ اماں نے بھی اٹکتی ہوئی سانسوں میں اسی جملے کو دہرایا تھا۔ ماہم بہت تیزی سے باہر کی طرف دوڑی تھی۔ برابر میں دھوبیوں کا دروازہ کھلا ہوا نظر آیا جو وہ گھبرا کر بولی تھی۔

''میری ماں مرجائے گی' مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے' مجھے رکشے کے پیسے چاہئیں' مجھے تھوڑے سے پیسے دے دیں''۔ بولتے وقت اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ وہ پیسے لے کر بہت تیز سڑک کی جانب دوڑ رہی تھی کہ رکشے والے سے بھی اس نے یہی کہا تھا کہ اگر جلدی نہیں کی تو ماں مرجائے گی۔ رکشہ والا بھی اس کی مدد کیلئے جلدی بھاگا تھا' اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' وہ دوڑتی ہوئی اماں کے کمرے میں آئی۔

''جلدی کریں اماں! جلدی کریں۔ میں رکشہ لے کر آئی ہوں ڈاکٹر کے پاس چلنا ہے''۔ اس نے شانزہ کی مدد سے اماں کو رکشہ میں بٹھایا تھا۔

''ڈاکٹر! اماں کو بچائیے''۔ اسے بس یوں لگ رہا تھا اماں ہاتھ سے نکل گئیں۔ ڈاکٹر اماں کی تکلیف دیکھ کر گھبرا گئی۔ اماں کو انجیکشن دیتے ہوئے وہ ماہم سے بولی۔

''کیا گھر میں عماد نہیں ہے؟'' تو ماہم کچھ نہ بول سکی۔

ڈاکٹر عماد کو جانتی تھی۔ اکثر ماہم ہی اماں کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جاتی تھی۔ اماں کی طبیعت تھوڑی دیر میں ہی سنبھل گئی تھی۔ جب وہ اماں کو گھر لے کر آئی تو ابا نے اسے بڑی محبت اور فخریہ انداز میں دیکھا تھا۔ شانزہ بھاگ کر اماں کے پاس آئی تھی۔

''عماد بھائی گھر آگئے ہیں۔ زوبیہ بھابی نے ساری کہانی انہیں سنادی ہے' تمہیں برا بھلا کہہ رہے تھے''۔ شانزہ نے بہت آہستہ سے بتایا تھا۔

''مجھے کوئی پرواہ نہیں' میری ماں کو تکلیف تھی میں نے جو کیا ان کیلئے کیا' کیوں نہیں دیتے پیسے جبکہ بھائی نے بھیج دیئے ہیں' بس ان کو تو تڑپانے کی عادت ہے''۔ وہ بہت غصے میں تھی۔

◈............☆............◈

ایشل روز روز رشتے کروانے والوں کے ہاتھوں ہرٹ ہوئی تھی۔ زندگی کے نئے سفر کیلئے اتنی دشواریاں۔ تنہائی میں چھپ کر آنسو بہاتی اور کچھ کرنے کا عزم اس میں جاگ پڑتا۔

''کیا ضروری ہے کہ شادی کی جائے' ماں باپ کیوں ہمیں تماشا بنارہے ہیں۔ ہر آنے والا رشتہ نئی ڈیمانڈ کررہا ہے''۔ یہ رشتہ بھی زیادہ دن قائم نہ رہ سکا۔ ایک بار پھر وہی لوگ پلٹ کر گھر آئے۔ یہ چوتھی بار تھا تو امی اور دادی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اب کے آؤ تو لڑکا ساتھ آئے۔ اس بار شاہانہ اپنے بھائی کو لے کر ساتھ آئی تھی۔ امی براہ راست سوال کرنا چاہتیں تو شاہانہ پلٹ کر جواب دیتیں' آج خاص طور پر کلثوم نے اپنی بھتیجی کو بلایا تھا کہ وہ کچھ لڑکے سے سوالات کرسکے۔ لڑکے سے جتنے بھی سوالات مائرہ کرتی شاہانہ پلٹ کر جواب دیتیں۔

''کیا ہے...... کیا آپ کا بھائی بول نہیں سکتا؟ میں ان سے سوال کرتی ہوں اور جواب آپ دیتی ہیں''۔ مائرہ نے بہت گہری نظروں سے شاہانہ کو دیکھا تھا۔

’’نہیں نہیں ......ایسی تو کوئی بات نہیں‘ جو پوچھنا ہے پوچھ لیں آپ‘‘۔ تو مائرہ لڑکے کی جانب پلٹ کر بولی۔

’’آپ نے کہاں سے اپنی تعلیم مکمل کی؟‘‘

’’گورنمنٹ ڈگری کالج سے‘‘۔ شاہانہ پھر پٹ سے بول پڑیں۔

’’دیکھیں پھر آپ بول پڑیں‘‘۔ مائرہ ہنس کر بولی۔ اتنے میں کلثوم نے چائے کے لوازمات ٹرالی میں سجا لیے تھے اور ایشل ٹرالی تھامے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔ اچانک ایشل کی نظر لڑکے پر پڑی‘ اس کا دل دھک سے ہوا تھا یہ تو وہی شخص ہے جو ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا ہوتا تھا‘ اس کے تن بدن میں آگ سی لگ رہی تھی۔ دائیں بائیں چلا کر نظر اٹھا کر اور اب اسے اندر لے کر آئی ہیں۔ ٹرالی وہیں چھوڑ کر وہ ناگواری سے الٹے پاؤں چلی گئی تھی۔ کلثوم پلٹ کر جلدی سے اس کے پیچھے بھاگی تھیں۔

’’یہ کیا بات ہے تم ٹرالی چھوڑ کر بھاگ کر آ گئیں‘ چلو واپس‘‘۔

’’نہیں امی......! میں مزید انسلٹ برداشت نہیں کر سکتی‘ آپ جائیں‘ خود اپنی شکل دیکھی ہے عالم چنا کی طرح تو لمبا ہے‘‘۔

جمعہ کا دن تھا‘ سفید کڑک دار شلوار قمیض پہنے اندر بیٹھے ہوئے عاصم کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لڑکی کو پسند نہیں آیا ہے۔ کلثوم تو پھر بھی گریں جا رہی تھیں کہ یہ کھالو وہ لے لو۔

’’بس امی......! بس انہیں صاف صاف جواب دے دیں۔ میں خود انہیں پسند نہیں کرتی‘‘۔

پھر وہ لوگ اٹھ کر چلے گئے تھے اور انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایشل کو یہ رشتہ پسند نہیں آیا تھا۔

’’اور ہاں امی......! رشتے والی آنٹی سے کہہ دیں کہ الٹے سیدھے رشتے لے کر ہمارے گھر نہ آیا کریں‘‘۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔

کیسا کیسا تماشہ رشتے لانے والیاں کرتی ہیں۔ گھر میں ایک ہنگامہ شور ہوتا ہے‘ ایسا لگتا ہے بارات آ رہی ہے۔ صبح سے دھلائی صاف ستھرائی اور کونے کونے کو چمکایا جاتا ہے۔

ایشل بہت ہرٹ ہوئی تھی‘ اس وقت بھی آنسوؤں سے وہ رو رہی تھی جب امی نے اسے پیار سے سمجھایا تھا۔

’’دیکھو ایشل......! تمہارا باپ بوڑھا ہے ہر روز تمہارا بھائی یہی کہتا رہتا ہے کہ ان لوگوں کی جلدی شادیاں کرو۔ اب بتاؤ میں کہاں سے لاؤں رشتے؟ لوگوں کی تو ڈیمانڈ ہے جہیز میں انہیں گھر چاہیے‘ کوئی کہتا ہے دبئی بھجوا دو‘ ہر لڑکے کو ڈاکٹر MBA چاہیے‘‘۔ کلثوم بہت ڈپریشن میں بول رہی تھیں۔

’’تو امی......! ہم کیا بھیڑ بکریاں ہیں جو ہر روز یہاں تماشہ ہوتا ہے‘ کہہ دیں بھائی سے نہیں کرنی مجھے شادی‘ کر لوں گی نوکری‘‘۔ وہ ماں کے آنسو نہ دیکھ سکی اس لئے رخ پھیر کر بولی تھی۔ کلثوم دوپٹے سے آنسو پونچھ کر اٹھ گئی تھیں۔ بوڑھی دادی تو پہلے ہی اندر جا چکی تھیں۔ اجالا بہن کے آنسو پونچھ رہی تھی۔

’’آپی......! امی کی بھی مجبوری ہے‘ روز کا تماشہ مجھے بھی اچھا نہیں لگتا لیکن کیا کریں ہماری مجبوری ہے۔ آپی! امی کی بات مان لیا کریں‘‘۔ وہ بہت پیار سے سمجھا رہی تھی لیکن ایشل تھی کہ اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے اپنی ذلت پر‘ روز روز کے تماشے پر۔ ماں کی بے بسی‘ ابا کی لاچاری‘ بڑھاپا‘ دو بہنوں کی ذمے داری اور بھائی کا ہر وقت کا گلہ شکوہ کہ جلدی کریں۔

’’کیا کروں ہر جگہ میں نے فیس دے کر نام لکھوا دیا ہے۔ ارسلان بیٹے! رشتے نہیں مل رہے ہیں‘ جو آتے ہیں واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ رشتہ خود ایشل کو پسند نہیں آیا۔ وہ رو رہی ہے دو دن سے بیٹھے‘ کہتی ہے

کہ نہیں کرنی مجھے شادی‘ یہ انسان کو انسان نہیں کھلونا سمجھتے ہیں۔ وہ تو کل بھی آئیں تھیں جواب بھی مانگ رہی ہیں‘‘۔

’’تو پھر کیا تکلیف ہے ایشل کو؟ آپ ہاں کہہ دیجیے‘‘۔ ارسلان نے بڑی آسانی سے مسئلہ حل کر دیا تھا لیکن ایشل نے صاف انکار کر دیا۔ کلثوم بھی زیادہ زبردستی نہ کر سکیں۔

ایشل اپنی بے بسی پر ہفتوں کیا مہینوں اس بات کو نہ بھول سکی کہ کس طرح گاڑی میں بیٹھ کر رونمائی کروائی گئی اور وہی شخص ہر بار اسے ہر روپ میں دکھتا رہا لیکن کلثوم نے بھی ہمت نہ ہاری‘ پھر نئی جستجو میں کسی دوسرے رشتے والی کے پاس دو ہزار فیس دے کر نام لکھوا آئی تھیں اور فوراً ہی رشتے والی نے ایک رشتہ بھی بتایا تھا۔

’’بیوی مر چکی ہے‘ بچوں کی کوئی ذمے داری نہیں‘ سب بچے الگ الگ سیٹ ہیں‘ بیٹی بھی شادی شدہ ہے‘ اچھا کھاتا پیتا لڑکا ہے‘ گاڑی بھی اپنی ہے اگر کہو تو ملوا دوں؟‘‘ کلثوم کے پیروں تلے سے زمین ہلنے لگی۔

’’اب ایسی بھی ایشل نہیں کہ میں کسی بڈھے کے ساتھ کر دوں‘‘۔ ان کا دل کانپ کر رہ گیا۔

’’ایسا کیجیے گا اس رشتے کو تو رہنے دیں کوئی اور دیکھ لیں‘‘۔

’’چلو ٹھیک ہے‘ نمبر تو ہے دو‘ چار دن میں کوئی اور بتاؤں گی‘‘۔ اور جو لیں۔

’’لڑکی کو نئے کپڑے پہناؤ اور ناشتہ ذرا اچھا ہونا چاہیے اور روشنی کے سامنے لڑکی کو بٹھاؤ تاکہ رنگ نکھر کر نظر آئے اور ہاں ایک بات اور بتاؤں کہ فیس واش کروالیں بیوٹی پارلر جا کر‘ رنگ نکھر جاتا ہے‘‘۔ رشتے والی نے آخر ٹپ کلثوم کو بتائی تھی۔ کلثوم نے سارے ٹپ استعمال کیے۔



’’کیا ہوا دادی! آپ نے مجھے بلایا ہے‘‘۔ اشمل اندر داخل ہوتے ہی جلدی سے بولا تھا۔ دادی تو پہلے اسے دیکھ کر مسکرا پڑیں‘ بلیو جینز ریڈ شرٹ میں وہ انہیں بہت پیارا لگ رہا تھا۔

’’کیا ہوا دادی؟‘‘ وہ ان کے اس طرح سے مسکرانے پر چونک پڑا تھا۔

’’ماشاءاللہ...... ریڈ کلر تم پر بہت بجتا ہے‘‘۔

’’ارے دادی! بس آپ محبت سے دیکھتی ہیں اس لیے‘‘۔ وہ ہنستے ہوئے دادی کے بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔

’’دیکھنا اشمل! میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے‘ تمہاری بڑی دادی سے بات ہو رہی تھی لائن کٹ گئی‘ آن ہی نہیں ہو رہا‘‘۔ انہوں نے موبائل اشمل کے ہاتھ میں تھما دیا۔

’’چارج ہی نہیں ہے دادی تو آن کیسے ہوگا‘‘۔ اشمل ہنس پڑا۔ اٹھا کر اس نے سیل کو ٹیبل پر چارج کرنے کیلئے رکھ دیا تھا۔

’’اور دادی! اب آپ کیسی ہیں؟ آپ کی نئی میڈیسن......‘‘

’’ہاں درد تو کچھ کم ہے لیکن بڑھاپا ہے‘ اللہ سے دعا ہے سوائے اس رب کے کسی کا محتاج نہ بنائے‘‘۔ دادی کے لہجے میں تنہائی کا دکھ تھا۔

’’ارے دادی! آپ کیسی باتیں کرتی ہیں‘ کیسی محتاج؟ اور کس کی محتاج؟ ولید حیدر تو آپ کا غلام ہے۔ جب باپ کو پیار کرتے دیکھتا ہوں ناں تو یقین جانئے دادی! میں اپنے آپ سے شرمندہ ہو جاتا ہوں‘ شاید میں اپنی ماں سے اتنی محبت نہیں کرتا‘‘۔

’’تو سیکھ لو تم‘‘۔ دادی کے انداز میں محبت چھلک پڑی تھی۔ پھر بولیں۔

''اللہ نے مجھے اتنے پیارے بیٹے دیئے ہیں تم بھی تو مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو''۔

''بس دادی!'' وہ دونوں ہاتھ ان کی گردن میں ڈال کر ان سے لپٹ گیا تھا۔

''دادی! آج بھی آپ کے لحاف میں سونا اچھا لگتا ہے''۔ وہ ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا تھا۔

''لیکن مجھے اتنا اچھا نہیں لگتا' جب سے تم بڑے ہوکر کتے' بلیوں میں گھسنے لگے ہو''۔

''اونو دادی!'' وہ ان کے گھٹنے پر سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔ ان کی انگلیاں آہستہ آہستہ اس کے بالوں پر چلنے لگی تھیں۔

رات نرس ڈیوٹی ختم کر کے جانے کیلئے آئی تھی اور دادی نے اشارے سے اسے جانے کی اجازت دی۔

''دادی! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مام' پاپ آپ کے روم میں رات کو کیوں نہیں سو سکتے؟ آپ کے پیروں میں پرابلم ہے' آپ گر جائیں' کچھ ہو جائے' وہ بوڑھی نرس کیا کر سکتی ہے؟'' ان کے سوال پر وہ بولیں۔

''شکر کرتی ہوں میں تو' دنیا کے بچوں نے تو اپنے والدین کو اولڈ ہوم میں ڈال رکھا ہے' ابھی تھوڑی دیر ہی پہلے ٹی وی پر اولڈ ہوم سینٹر سے بوڑھی خواتین کا انٹرویو آ رہا تھا''۔ وہ آبدیدہ سی ہو کر بولی تھیں۔

''دادی! ایک آئیڈیا''۔ وہ اٹھ کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

''آپ اس لڑکی کو اپنے پاس رکھ لیں' ہو گیا فیصلہ' میں مام اور پاپ دونوں سے بات کر لوں گا''۔ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا تھا۔

''ہاں ہاں...... جیسے وہ فالتو پھر رہی ہے' اس کے ماں باپ ہیں' بہن بھائی ہیں' کچھ دن میں اس کی شادی ہو جائے گی' اپنے گھر کی ہو گی' کیسے رکھ سکتی ہوں بیٹا؟'' دادی آنسو پونچھ چکی تھیں۔

''دادی! کل سے میں آپ کے ساتھ شفٹ ہو رہا ہوں''۔ وہ ہمدردی سے بولا۔

''جی ہاں...... دو چار دن کے بعد بیگ اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ گے کہ دادی' اللہ حافظ میں جا رہا ہوں۔ بس تم دونوں جلدی جلدی پڑھائی ختم کر کے یہاں آ جاؤ''۔ دادی پیار سے بولیں۔

''جی دادی! میرا پڑھائی میں دل نہیں لگتا۔ حذیفہ ہی پڑھائی کیلئے کافی ہے' میں تو پاپ کے بزنس میں دلچسپی لے رہا ہوں' بس ایک مسئلہ ہے دادی ورنہ میں یہاں پلٹ کر آ جاؤں''۔ وہ سوچ کر بولا۔

''کیا مسئلہ ہے تمہارا بیٹا؟ اللہ کا شکر ہے میرے بیٹے کے پاس سب کچھ ہے' اللہ ہر ایک کو ایسی اولاد دے''۔

''دادی! بس ایک پرابلم ہے۔ مام کو ہمارے لئے پاکستان پسند نہیں ہے بٹ آئی لو پاکستان''۔

''جانتی ہوں میں''۔ وہ اشمل کی طرف پلٹ کر بولیں۔ سیل پر بیپ ہوئی تو وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بھاگا تھا۔

''دادی! ایک منٹ''۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور Skype آن کیا۔ سامنے ارج بیٹھی ہوئی اسے نظر آئی تھی۔

''ہائے ارج''۔ بے ساختہ بولا تھا۔

''تم تو پاکستان میں ہی جا کر بیٹھ گئے۔ پھپھو کہہ رہی تھیں کہ تم دن رات دادی یا ایزل کے چکر میں رہتے ہو''۔ وہ بہت زور سے ہنسی تھی۔

''اونو...... مام کے سامنے تو میری اس گھر میں کوئی پرسنل لائف ہے ہی نہیں یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔ مام ہر وقت اسی فکر میں رہتی ہیں۔ ویسے میرا اس بار اتنی جلدی آنے کا ارادہ نہیں ہے۔ میں پاپ کے ساتھ جاتا ہوں آفس''۔ اس کے لہجے میں بہت اطمینان تھا۔

''اشمل کے بچے فوراً جلدی چلے آؤ بس بہت ہو گئی ورنہ میں اس کے بعد تم سے بات نہیں کروں گی۔ دیکھو اپنا حلیہ کیا ہو رہا ہے''۔ اشمل نے چونک کر اپنے اردگرد نظر ڈالی۔

''میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں' ابھی تو دادی میری اتنی تعریف کر رہی تھیں''۔ وہ پراؤڈلی مسکرایا۔

''بوڑھے لوگ اسی طرح دوستی کا حلقہ قریب کرتے ہیں''۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اشمل اس کی آواز پر بولا تھا۔

''میری دادی ہیں میں انہیں اچھا لگتا ہوں''۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔

''اچھا اچھا بس کرو' میں سب کچھ جانتی ہوں' پھپھو کو انہوں نے کبھی چین نہیں لینے دیا''۔ وہ ہنس کر چھیڑ گئی۔

''چھوڑو تم...... بکواس نہیں کرو' کیا الٹا سیدھا بولے جا رہی ہو۔ دادی کے بارے میں ایک لفظ نہیں بولنا''۔ وہ مصنوعی غصے میں بولا تھا۔

''تو چلو ایزل کی بات کر لیتے ہیں''۔ اس نے مڑ کر بیڈ کی جانب دیکھا تھا' ایزل ابھی تک سو رہی تھی۔

''وہ بہت گہری نیند میں ہے اس وقت''۔ اشمل ہنسا تو وہ جل کر بولی۔

''پلیز اشمل! آتے وقت اپنے سارے کپڑے وہیں چھوڑ کر آنا ورنہ میں تمہیں اپنے گھر میں نہیں گھسنے دوں گی''۔ تو وہ بہت تیز ہنسا اور بولا۔

''ہو سکتا ہے وہ میرے ساتھ ہی وہاں آ جائے''۔ وہ ہنسنے لگا۔

''کیا کیا...... میں تمہیں اور ایزل کو شوٹ کر دوں گی''۔ وہ غصے سے بولی تو وہ ہنسنے لگا۔

''خیر چھوڑو ارج......! اور سب کیسے ہیں۔ ماموں' مامی کیسے ہیں؟ اور زوہیب کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' وہ سب کی خیریت معلوم کرنے لگا۔

''وہ سب ٹھیک ہیں اشمل! مجھے بہت ڈر لگتا ہے جب تم پاکستان جاتے ہو' اشمل! تمہیں ڈر نہیں لگتا''۔

''نہیں''۔ وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔

''مجھے تو تمہارے پاپ سے بڑا ڈر لگتا ہے''۔

''کچھ نہیں ہو گا''۔ وہ بولا۔

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ تمہاری دادی سے بھی مجھے خوف آتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے بس حکمرانی چلانے لگتی ہیں''۔ وہ دادی کی برائی پر اتر آئی تو اشمل بات کاٹ کر بولا۔

''دیکھو ارج! دادی کے بارے میں کچھ مت کہنا' وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں''۔ تو وہ بولی۔

''مجھ سے تو نہیں کرتیں وہ''۔ وہ ہنس پڑی تاکہ بات مذاق میں اڑ جائے۔ تھوڑی دیر کیلئے اشمل بھی حیران ہوا تھا۔ کافی دیر ادھر اُدھر کی اشمل اور ارج بات کرتے رہے' یوں تو روز ہی کال کرتی تھی لیکن اس وقت ارج نے خاص طور پر اشمل سے بات کی تھی۔ اسے اتنے دن ہو گئے تھے پاکستان میں رکے ہوئے۔ اشمل کی خواہش تھی کہ وہ پاکستان سیٹل ہو جائے جبکہ حذیفہ وہاں اسٹڈی کر رہا تھا۔ ارج ماموں زاد بہن تھی' وہ لوگ امریکا میں سیٹل تھے۔ ارج کو پاکستان پسند نہیں تھا اکثر یہی اختلاف کی وجہ بنتا لیکن تھوڑے وقفے کے بعد ارج اسے خود ہی اپروچ کرتی۔ ارج جس معاشرے میں رہ رہی تھی وہاں پر بزرگوں کا احترام نہیں کیا جاتا تھا۔ جبکہ اشمل اپنی دادی سے بہت محبت کرتا تھا

لیکن صبا ان کی ذرا سی بات برداشت نہیں کرتی تھیں بلکہ ہر وقت ہر ایک سے شکایت ہی کرتی رہتی تھیں۔ ہر چند کہ وہ اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں' ان کے بیٹے ولید حیدر ان کا بے حد خیال کرتے تھے اور یہی وجہ تھی اشمل بھی باپ کو دیکھ کر دادی سے محبت کرتا تھا بلکہ بے حد قریب تھا۔ یہ بات صبا کو پسند نہیں تھی' وہ زیادہ سے زیادہ اشمل کے لیے یہی چاہتی تھیں کہ وہ امریکا میں رہے اور وہیں سیٹل ہو۔



ہلکی ہلکی دھوپ دیواروں پر باقی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ شام ہونے والی ہے۔ اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ عماد کمرے سے نکل کر ماں کے کمرے میں آئے تھے۔ جلوہ بی بی بڑی سے گول میز پر رکھے پاندان کی صفائی میں مصروف تھیں۔ تب وہ وہیں دروازے پر کھڑے کھڑے بولے تھے۔

''ابا کو دیکھو کان سے ریڈیو لگائے بیٹھے ہیں۔ ارے اب اللہ اللہ کرو' نہیں سارے اخبار لگا کر بیٹھے ہیں' سارا دن اخبار پڑھتے ہیں' اس وقت بھی نیوز ضرور سنیں گے' آپ سمجھائیں ناں' سفید بالوں کو ڈائی کرتے ہیں بیٹھ کر''۔ جلوہ بی بی خاموش بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھیں۔ ماہم نے تڑپ کر عماد کی طرف دیکھا تھا مگر وہ جا چکے تھے۔ ماہم اپنی کتابیں اٹھا کر غصے سے اسٹور کے اندر چلی گئی تھی' آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ عماد بھائی کی باتوں پر اس کا دل تڑپ تڑپ کر رو دیا تھا۔

''میرے باپ کو ایسا کیوں کہا''۔ اس نے یہ بات دبے دبے لفظوں میں اماں کو بتا دی تھی۔

''عماد بھائی کہتے ہیں کہ ابا بال ڈائی کیوں کرتے ہیں''۔ وہ روتے ہوئے بول رہی تھی۔

پھر ابا نے بال ڈائی کرنے چھوڑ دیئے تھے۔ ماہم کی جب نظر پڑتی تو نا جانے کتنی اداسیاں اس کے دل کے اندر ٹوٹ کر گرتیں اور وہ جب اماں سے شکایت کرتی تو اماں یہی کہتیں۔

''عماد تو ایسے ہی بکتا رہتا ہے تم خوامخواہ دل کو لگا کر بیٹھ جاتی ہو''۔ اماں نے سفید ساڑھی کے آنچل سے منہ پونچھا تھا لیکن یہ ملال' یہ دکھ ماہم کی زندگی سے کبھی دور نہ ہو سکا کہ میرا باپ بوڑھا دکھائی دیتا ہے۔ بچپن سے آج تک وہ اسی کمپلیکس میں مبتلا رہی کہ میرا باپ بوڑھا کیوں ہے؟ اور اب جب سے گاؤں سے شہر میں آئے تھے اتنی بڑی تبدیلی تھی کہ ابا گھر میں بیکار ہو کر بیٹھ گئے تھے' گاؤں میں تو پھر بہت ساری مصروفیات تھیں' ان کے دوست مل کر ہنٹنگ کرنے جاتے' ابا ملازم کے ساتھ گن لے کر رات ڈھائی بجے شکار کھیلنے جاتے' واپسی پر ہرن اور مرغابی اور ہرے ہرے ہریل ساتھ لاتے۔ صبح اکثر ہی ابا بیٹھک میں چلے جاتے جہاں شطرنج کھیلتے' شام ہوتے ہی اپنا گرم چیسٹر پہن کر اپنے دوست حکیم یا ڈاکٹر کے پاس چلے جاتے تھے۔ ماہم کو اپنے ماں اور باپ دونوں سے عشق تھا۔ ان دونوں کے علاوہ اس کی زندگی میں کچھ بھی نہیں تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک وہ ایک ہی خوف میں مبتلا تھی کسی کی ماں کو مرتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تھا' ہر لمحہ اسے یہی دھڑکا لگا رہتا کہ اماں نہ مر جائیں کہیں...... ذرا سی دیر کیلئے اماں سانس روک لیتیں تو ماہم کا دم گھٹنے لگتا۔ وہ آہستہ سے اماں کے دل پر ہاتھ رکھ کر آہٹ سنتی' اماں مسکرا کر آنکھیں کھول دیتیں اور کہتیں۔

''تم آہستہ آہستہ ہمارے دل کو چیک کر رہی تھیں کہ کہیں میں مر تو نہیں گئی''۔

''نہیں نہیں اماں! ایسا تو کچھ نہیں ہے''۔ وہ ہنس کر بات ٹال جاتی۔

''اس دن تم مجھے اٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گئیں ورنہ واقعی مجھے لگ رہا تھا کہ میری سانس اکھڑ رہی ہے اور میں نہیں بچوں گی''۔

''نہیں اماں! ایسا نہ کہیں''۔ ماہم پیار سے ان سے لپٹ گئی تھی۔ اماں کے وجود کی خوشبو نے اس کے دل کے ملال کو وقتی طور پر دھو ڈالا تھا لیکن وہ تنہائی میں بیٹھ کر اکثر اداس ہو جاتی۔

میری ماں بیمار رہتی ہے اور میرا باپ بوڑھا کیوں ہے؟ پھر اسے نانی کی کوئی بات یاد آ جاتی جب گرم لحافوں میں کہانی سناتے ہوئے بتاتی تھیں۔

''پتہ نہیں ایسا کیا ہے ہمارے خاندان میں مرد پہلے مر جاتے ہیں عورتیں بیٹھی رہتی ہیں''۔ تو ماہم کے سامنے فوراً اس کے باپ کا چہرہ آ جاتا' دل دھک سے ہوتا اور وہ اپنی سانس روک لیتی۔ کہانی کے ہر سرے پر اسے صرف اور صرف اپنی ماں کا چہرہ نظر آتا۔ نانی اسے سونا چاندی کی کہانی سناتیں اور سونا کے روپ میں اسے اپنی ماں کا پرانا چہرہ نظر آتا۔ وہ چہرہ جس کو اس نے اپنی تصویروں میں دیکھا تھا۔ سب سے خوبصورت ترین اس کی ماں کا چہرہ تھا جس کو ہر بار اس نے خیال ہی خیالوں میں چوما اسی لئے آج بھی وہ عماد کی باتوں سے ہرٹ ہوئی تھی۔ ابا کیلئے نا جانے کیا کیا کلمات کہہ کر باہر چلے گئے تھے۔ ناک سے پانی بہہ رہا تھا وہ بار بار اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی اور کتاب کے ہر صفحے پر کبھی اماں کی کبھی ابا کی تصویریں بنا رہی تھی۔ اس کی سوچ کے محور میں نا جانے کتنے رنگ بکھر رہے تھے تب ہی اسے آواز آئی تھی۔

''سمعیہ باجی آئی ہیں''۔ سمعیہ باجی نے اسے بڑی دبی دبی سی مسکراہٹ سے دیکھا تھا۔ اسے باجی کی مسکراہٹ بڑی بے رحم سی لگتی۔ باجی کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ اسے یاد آتا تو سب سے زیادہ دکھ اسے اسی بات کا ہوتا کہ باجی کی وجہ سے اس کا باپ مقروض ہو جاتا اور اماں پریشان ہو جاتیں۔ باجی کا آنا بہت تکلیف دہ عمل تھا' اس وقت بھی باجی کا آنا اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اماں نے بھاگ کر پان منگوائے تھے۔ باجی بڑی بے چین سی دکھائی دے رہی تھیں۔

''کیا ہوا؟'' باجی مسکرا کر ماہم سے بولی تھیں۔

''کیا......'' ماہم حیران ہو کر بولی تھی۔ باجی اس وقت بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ کانوں میں سونے کی بالیاں' کلرنگ بال' ناک میں فیروزے کی لونگ اور دونوں ہاتھ میں سونے کی چوڑیاں بھری ہوئی تھیں' ڈارک گرین ساڑھی اور ڈارک گرین فل آستین کا سوئٹر اور لمبی چوڑی سی سمعیہ باجی اس وقت بڑی پیاری لگ رہی تھیں' لیکن ان کے ہونٹوں کی ہنسی اور مسکراہٹ ماہم کے ذہن میں دھماکے کر رہے تھے۔ وہ جنگ جو ماہم اور باجی کے درمیان خاموشی سے جاری تھی جس میں کوئی بھی شامل نہیں تھا جس میں ماہم کا دماغ اور باجی کا جس میں صرف باجی' ماہم کو تکتی تھیں اور نا ماہم باجی کو۔ اماں سے پان کی گلوری لے کر باجی نے دانتوں سے دبا کر ماہم کو بڑی شوخ نظروں سے دیکھا تھا۔ ان کی نظروں کی تپش کہہ رہی تھی کہ میں تمہیں مات دلوا کر رہوں گی اور اب دیکھو کیا ہوتا ہے؟ واقعی باجی نے بڑی مات دی تھی۔ ماہم کا سارا فلسفہ' ساری سوچ ایک پل میں باجی نے درہم برہم کر دی۔ ابا کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے باجی پوچھ رہی تھیں۔

''ابا...... حماد کا خط آیا ہے ذرا ہمیں بھی تو دکھائیں''۔

اماں کے چہرے پر بہت گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ ماہم کا دل دھک سے ہوا تھا' یہ بھلا کیا بات ہوئی پہلے خود خط لکھوا کر بھیجا اب جواب دیکھنا چاہتی ہیں۔

ابا نے اپنا بلیک رنگ کا لیدر کا فولڈر کھول کر خط نکالا تھا۔ باجی' ابا کے سامنے کرسی پر بیٹھیں خط کو فولڈ کر کے باجی نے بیگ میں رکھا اور ابا یہ بھی نہ پوچھ سکے کہ یہ تم کیوں رکھ رہی ہو؟ ماہم کا دل ضرور دھڑکا تھا مگر شاید وہ بھی اس بات

کواتنی اہمیت نہیں دے رہی تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔ باجی کی شوخ کالی کالی آنکھوں میں بڑی گہری چمک تھی، ایک شرارت تھی، ایک فاتحانہ انداز تھا۔ ماہم کو نا صرف فیس ریڈنگ پڑھنی آتی تھی بلکہ باجی کی باڈی لینگویج سے ماہم واقف تھی۔ شانزہ کہتی تھی دیکھ لیجیے گا باجی، حماد کا رشتہ نہیں ہونے دیں گی اور ماہم کہتی تھی کہ نہیں اماں، ابا جو چاہیں گے وہی ہوگا۔ ماموں گاؤں سے صرف اس لئے شہر آئے ہیں کہ رومی کا رشتہ کرسکیں پھر یہ ممکن نہیں ہوگا لیکن باجی کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ ماہم تم ہار گئیں، جیت ہماری ہے۔ باجی تھوڑی دیر بیٹھی رہیں، بیٹھ کر جانے لگیں تو چلتے چلتے زوبیہ بھابی سے کہنے لگیں۔

''اور شلو......! کیا پکایا ہے''۔ باجی ہر ایک کے عجیب وغریب نام رکھ دیتی تھیں۔ پرس اٹھا کر باجی چلنے کیلئے کھڑی ہوئیں تو اماں نے کھانے پر روک لیا۔

''نہیں...... بچے آتے ہوں گے ٹیوشن سے، جو کچھ ہے ٹفن میں ڈال دو اور ہاں دیکھو شلو......! ڈنڈی نہ مارنا، ویسے کھانا دیتے ہوئے تمہارا دم نکلتا ہے''۔ باجی ہنس کر زوبیہ بھابی سے بولی تھیں، زوبیہ بھابی نے بھی برا نہ مانا تھا۔ بات مذاق میں کی تھی انہوں نے لیکن ماہم کے چہرے پر 12 بج رہے تھے۔ سمعیہ باجی کی شوخ نظریں اور دبے دبے ہونٹوں کی ہنسی ماہم کے خوف کو بڑھائے جا رہی تھی۔ ابا اس وقت بھی اخبار کے کسی کالم پر جھکے ہوئے تھے۔ اماں گرمی کی وجہ سے کھجور کا پنکھا جھلے جا رہی تھیں، ماہم بڑے اونچے سے تخت پر بیٹھے جس پر ڈھیروں لحاف تہہ کیے ہوئے رکھے تھے کسی گہری سوچ میں تھی، باجی ٹفن اٹھا کر کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔

☆

کلثوم بہت دیر سے کام میں مصروف تھیں، دروازے پر بڑی دیر سے دستک ہو رہی تھی، بچیاں تو گھر پر تھیں بھی نہیں وہ ہاتھ پونچھتی ہوئیں دروازے کی سمت بڑھیں، دروازہ کھولتے ہی وہ ہکا بکا سی ہوگئیں، ذیشان کی ماں تہمینہ سامنے کھڑی تھیں۔

''آپ......'' وہ حیران ہو کر راستہ دیتے ہوئے بولی تھیں۔

''بس آج ہم تمہاری طرف آگئے، آپ کی بہن نے ذکر تو کیا ہوگا''۔ حالانکہ کلثوم کو تو سب کچھ پہلے ہی یاد آ گیا تھا اور آنے کا مقصد بھی سمجھ آ گیا تھا لیکن پھر بھی وہ جی جی کر رہی تھیں۔

''بس اللہ کی مرضی، نصیب یہی لکھا ہوگا، ہم دوبارہ ایشل کیلئے آپ کے پاس آ ہی گئے''۔ وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے بولی تھیں تو کلثوم جھٹ بول پڑیں۔

''آپ ہی کا گھر ہے یہ تو ہوتا رہتا ہے''۔ تہمینہ ایک برس پہلے ذیشان کیلئے ایشل کو دیکھنے آئی تھیں۔ کلثوم کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اماں تو پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ تہمینہ کے جانے کے بعد ایشل گھر میں داخل ہوئی تھی۔ کلثوم، ایشل کو دیکھ کر ایک دم ہنس پڑیں، دادی بھی ہولے ہولے مسکرا رہی تھیں، ایشل ان سب کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی، پھر کلثوم نے ایشل پر انکشاف کیا تھا کہ ذیشان کا رشتہ آیا ہے۔ وہ کیا سارے گھر والے حیران اور خوشی سے چہک رہے تھے۔ تہمینہ تو بال کی کھال نکالتی پھرتی تھیں، ہر گھر میں جھانکتیں۔ انہیں بہو کے روپ میں کوئی لڑکی پسند نہ آئی، کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق تھا، لڑکا بھی اچھی پوسٹ پر تھا اور خاندان بھی دیکھا بھالا تھا۔

''لو بھئی وہ تو چلتے چلتے بات بھی پکی کر کے گئی ہیں، اس لئے چھان بین کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی، فوراً ہاں، چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات ہوئی تھی''۔ کلثوم کے گھر میں وہ چار دن میں خوشی اتر آئی تھی، ابھی ہفتہ نہ گزرا کہ منگنی کی

بات طے ہوگئی۔ سوچنے سمجھنے کی گنجائش کب تھی۔ یہ کلثوم کے اپنے لوگ تھے اور وہاں برادری سسٹم تھا۔ کرنی ہے تو شادی اپنی برادری میں ہی کرنی ہوگی، رشتہ بھابی اور خالہ کے ذریعے آیا تھا۔

دوسرے تیسرے دن ذیشان کی طرف سے فون آیا تھا وہ جمعہ کے دن رسم کرنے آ رہے تھے۔ جمعہ کے دن سادہ سی تقریب میں رنگ پہنا کے وہ لوگ چلے گئے تھے۔ جب یہ بات خاندان میں پھیلی تو سب لوگ حیران سے رہ گئے۔

''ہیں...... انہیں ایشل پسند آ گئی''۔ ایشل کو ایک سال پہلے بھی دیکھ کر چلے گئے تھے لیکن گھر گھر جھانکنے کے بعد پھر ایشل یاد آئی تھی، بیگم تہمینہ دوبارہ آئی تھیں، انہیں اپنے بیٹے اپنی دولت پر بڑا گھمنڈ تھا، صاحب حیثیت تھیں اور بیٹا بھی پڑھا لکھا تھا اسی لئے ہائی فائی لڑکی ڈھونڈتی پھریں۔ ایشل والے ہائی فائی تو نہیں تھے مگر ایشل بڑی نازک سی بڑی خوبصورت لڑکی کا نام تھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ انہیں پسند تو آ گئی تھی مگر خوب سے خوب تر کی تلاش میں وہ ماری ماری پھرتی رہیں۔ آج سب کو حیران کر کے رسم کر کے جا چکی تھیں۔ خاندان والے نا صرف خاصے حیران بلکہ حسد کر رہے تھے، حسد انسان کی خوشیوں کو تباہ و برباد بھی کر دیتی ہے، ارد گرد رہنے والے اپنے ہی آگ لگانے کیلئے تیار بیٹھے ہوتے ہیں، یہ انسان کی عین فطرت کے مطابق ہے کہ اپنے سے بہتر کسی کو نہیں دیکھ سکتے۔

☆

ایک بہت سوگوار سی شام تھی جب جلوہ بی بی گرمی سے نڈھال، یوں لگتا تھا شاور لے کر باہر آئی ہیں، سارا بلاؤز اور پیٹی کوٹ پانی سے شرابور تھا، وہ منہ ساڑھی کے پلو سے رگڑ رگڑ کر اپنی گردن، بازو اور چہرے کو صاف کر رہی تھیں۔ ڈھک کی آدھی سفید کاٹن کی ساڑھی پانی سے شرابور ہوگئی تھی، ان کے سفید ملکوتی چہرے پر بہت شفاف سی الوہی مسکراہٹ کھیل رہی تھی جس کی ماہم دیوانی تھی۔ اماں کی مسکراہٹ، اماں کے وجود کی خوشبو، اماں کے لباس کی خوشبو، ان کی بانہوں کا حصار سب کچھ ماہم کو بے حد پسند تھا۔ بہت ہی نفاست پسند سی جلوہ بی بی خاتون تھیں، ان کے سامنے ان کے بیڈروم کا صوفہ جو خاص مہمانوں کیلئے بنا تھا وہ آنے جانے والوں کیلئے استعمال ہوتا تھا۔ آج کل ثروت باجی دو چار دن سے سسرال سے میکے رہنے آئی تھیں، صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں، ثروت باجی نے دونوں پیر اٹھا کر اماں کے بیڈ پر رکھ لئے تھے۔ جلوہ بی بی کو تو یہ بات پسند ہی نہیں تھی کہ کوئی ان کے بیڈ پر پیر رکھے۔ ماہم نے بڑی خاموشی سے ثروت باجی کو اشارہ کیا تھا جس پر ثروت اندر سے کھول اٹھی تھیں۔ پیر تو انہوں نے اٹھا لیے تھے لیکن ماہم کو سنا رہی تھیں۔ ماہم بھی تو اس وقت حجت اور بحث میں مختلف دلیلیں دے رہی تھی۔

ماہم اور ثروت کی کبھی بھی نہیں بنی۔ ثروت کو ہمیشہ شکایت رہی کہ انہیں پڑھنے نہیں دیا گیا۔ وہ جلی کٹی ہمیشہ سناتی تھیں، آج گھر میں پھر نیا ایشو اماں کے سامنے اٹھ کر آیا تھا۔

''کیا کرتی ہیں ثروت باجی کی ساس؟'' شانزہ نے ماہم سے پوچھا تھا۔

''بڑی خطرناک ہیں وہ''۔ ثروت آپا رو کر اماں کو بتا رہی تھیں۔

''ہر وقت ابا کا نام لے کر گالیاں دیتی ہیں وہ، ذرا سا جواب دے دیا تو پورے گھر نے ان کا بائیکاٹ کر دیا اور کہا کہ معافی مانگو امی سے اور پھر سب کے سامنے جھک کر ناک سے لکیر بناؤ۔ اتنی ذلت دیتے ہیں وہ لوگ''۔ ماہم کو اندر شدید غصہ آ رہا تھا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان کا سر جا کر توڑ دے۔ ثروت نے سب کو منع کر دیا تھا کہ کوئی [illegible]، کوئی کچھ نہ بولے سب لوگ چپ رہ گئے تھے۔

بھیگی بھیگی یہ سہ پہر تھی ابھی کچھ دیر پہلے ہی بارش تھم چکی تھی‘ شدید حبس اور بجلی غائب‘ اماں کے سرخ سرخ باریک دانوں میں جلن ہونے لگی‘ اماں کھجور کے پنکھے کی ڈنڈی سے پیٹھ کھجا رہی تھیں کہ سامنے سے ماہم بولتی ہوئی آ رہی تھی۔

”آج اللہ میاں نے میری سن لی‘ میں نے کتنی دعائیں کی تھیں کہ بارش ہو جائے اور ہوگئی“۔ اماں نے کھجور کے پنکھے کی ڈنڈی سے ماہم کو ادھیڑ ڈالا تھا کہ لو اور کرو بارش کی دعا‘ اماں نا جانے کس بات پر اتنا کھسیائی ہوئی بیٹھی تھیں۔

”اماں پلیز...... اماں پلیز......“ وہ ان کے ہاتھوں کو روک رہی تھی۔ ماحول میں اچانک ایک گھٹن سی چھا گئی پھر تھوڑی دیر میں سمعیہ باجی اپنے بچوں کو لئے ہوئے گھر آ ئیں۔ اماں‘ ابا انہیں دیکھ کر کھل اٹھے تھے‘ یوں لگا جیسے وہ حج کر کے آ رہی ہیں۔

”خوب تیز بارش ہوئی‘ تھوڑی دیر کیلئے رکی تو میں نے کہا گھوم کے آتے ہیں اماں کے گھر۔ موسم خوبصورت ہو رہا ہے‘ ایسے میں پکوڑے کھانے چاہئیں“۔ بس پھر کیا تھا باجی نے کہا اور اماں کا آرڈر پاس ہو گیا۔ زوبیہ بھابی نے ایسی گرمی میں جا کر پکوڑوں کیلئے کڑھائی چڑھا دی تھی۔

بھینی بھینی پکوڑوں کی خوشبو‘ صحن میں دھوئیں کے بگولے ہر طرف پانی اور کیچڑ ہی کیچڑ نظر آ رہا تھا۔ ماہم نے صحن میں کھلنے والا دروازہ کھول کر دیکھا تھا‘ بلی کا بچہ جس کا پیر زخمی تھا‘ پورے میدان میں دھوبیوں کی دور موٹی رسی دھیمی دھیمی پھوار میں بھیگ رہی تھی‘ دھوبن جسے وہ سب صغرا خالہ کہتے تھے گیلی چادر کو لپیٹ رہی تھیں۔ وہ بلی کو اٹھا کر اندر لے آئی۔ بھیگی ہوئی بلی کو اس نے صاف کپڑے سے پونچھا تھا۔ ابا کی ہدایت پر مرہم لگا کر لکڑی سے اس کے پیر کو باندھ دیا تھا اور اٹھا کر اس نے اسٹور کے کونے میں بٹھا دیا اور خود اٹھ کر کمرے میں آئی تو سمعیہ باجی پکوڑے‘ چٹنی سے لگا کر کھا رہی تھیں اور سامنے گول میز پر گول سا پاندان کھلا رکھا تھا اور اماں بڑے بڑے پان سمعیہ باجی کے لیے لگا کر لپیٹ رہی تھیں۔

”اور اماں! رومی کہاں ہے؟“ ان کے ہونٹوں پر دبی دبی ہنسی تھی۔

”دو چار دن کیلئے اپنے تایا کے گھر گئی ہے“۔ اماں سنجیدہ ہو گئیں لیکن سمعیہ باجی چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ لئے صرف ماہم کو دیکھ رہی تھیں۔ شانزہ نے اشارہ کیا کہ باجی اپنی کامیابی پر ہنس رہی ہیں‘ پھر دبے دبے لفظوں میں سمعیہ باجی‘ امی سے بولی تھیں۔

”کل صفدر گھر آیا تھا“۔ اماں ان کی بات سن کر چپ ہو گئیں‘ تھوڑی دیر بعد بولی تھیں۔

”دیکھو سمعیہ! صفدر کے ماں باپ تیار نہیں ہیں‘ یہ بات اچھی نہیں ہے کہ بعد میں لوگ لڑکی کو طعنہ دیں گے کہ تم لوگوں نے اپنی مرضی سے شادی کی ہے“۔ سمعیہ باجی نے منہ میں پان کی گلوری رکھی اور ہنس پڑی تھیں‘ اماں کے مڑتے ہی سمعیہ باجی آہستہ سے بولی تھیں۔

”عادل ماموں جو چاہ رہے ہیں وہ میں ہونے نہیں دوں گی‘ حماد کو پھر خط لکھوں گی“۔ اصل میں باجی کو ایک ضد سی تھی یا یہ انا کا مسئلہ تھا کہ وہ جو چاہیں گی وہی ہوگا۔ باہر سے ٹومی کے بار بار بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ عماد اپنے کتے کو رات کا کھلا رہے تھے۔ ابا گھبرا کر باہر واک کرتے ہوئے قبرستان والی سڑک پر نکل گئے تھے۔

”اور کیا پکایا ہے تم نے شبو رانی“۔ سمعیہ باجی نے زوبیہ بھابی کو پیار سے چھیڑا تھا۔

”اروی گوشت“۔

”چلو پھر ٹھیک ہے ہم شام کا کھانا لے کر جائیں گے‘ ویسے تو میں اپنے ملازم کو بتا کر آئی تھی کہ شام کیلئے اسٹو بنا کر رکھے۔ کل دو اصلی گھی کے کنستر اور چار بوری چاول یہ لے کر آئے ہیں......“ باجی کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ماہم بولی تھی۔

”باجی! رشوت ہے“۔

”میں کہتی ہوں کہ تم اپنی زبان بند رکھا کرو“۔ باجی کو بہت غصہ آیا تھا۔

”ہاں...... رشوت میں آیا تھا‘ تم بھی تو ٹھونستی ہو‘ یہ جو مکھن اور گھی لے کر آئی ہوں یہ بھی تو رشوت کا ہی ہے‘ مت کھانا تم“۔ باجی بہت غصے سے اٹھ کر جانے لگیں تو اماں نے گھور کر دیکھا تھا‘ وہ بہت تیز قدموں سے کمرے سے نکل گئی تھیں۔



ولید حیدر کو دبے دبے لفظوں میں صبا نے یہ تو بتا دیا تھا کہ اشمل کسی لڑکی کو امریکا میں پسند کرتا ہے اسی سے شادی کرنا چاہتا ہے‘ اس کو سن کر ولید خاصے برہم ہوئے تھے‘ انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔

”امریکا میں پلی بڑھی لڑکی ہماری فیملی کا حصہ نہیں بنے گی اور اس نے میری مرضی کے خلاف کیا تو میں سب کچھ حذیفہ کے حوالے کر دوں گا‘ تم جا کر اسے بتا دو میری مرضی کیخلاف کچھ نہیں ہو سکتا“۔

ولید حیدر آفس سے آ چکے تھے‘ اشمل بہت خوفزدہ تھا۔ یہ بات صبا کے علم میں آ چکی تھی کہ اشمل نے ارج سے وہاں شادی کر لی ہے اور وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ ان کے بھائی نے ولید کے خلاف سازش کی ہے صرف ولید کو نیچا دکھانے کے لئے۔ یہ صحیح ہے کہ ارج ان کی بھتیجی ہے‘ ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی ہے مگر ولید‘ ان کی بیٹی کو قبول نہیں کریں گے‘ اسی لیے صبا‘ بھائی کے انکشاف پر ہی خوفزدہ ہو کر اشمل سے الجھ پڑی تھیں کہ تم نے کیا کیا؟

”تم اپنے باپ کو نہیں جانتے‘ وہ کسی صورت یہ شادی قبول نہیں کریں گے۔ پھر بھی میں ولید سے بات کروں گی“۔

پھر وہ بیٹے کی طرفداری میں طرح طرح کے جواز ڈھونڈ رہی تھیں۔

”دیکھو ولید! آج اور کل میں بہت فرق ہے‘ ارینج میرج میں بہت ساری مشکلات ہوتی ہیں‘ میں تو اس کے خلاف ہوں“۔ اس طرح انہوں نے ولید کا دل ٹٹولا۔ جواب کیلئے وہ ولید کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔

”میں سمجھتا ہوں ارینج میرج‘ لو میرج سے بہتر ہے‘ جوش و جذبات میں آ کر جو فیصلے کیے جاتے ہیں ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا“۔ وہ سگار کا کش لے کر بولے تھے۔

”کیوں؟ کیا ہماری لو میرج نہیں تھی؟ امی جان نے تو مجھے ہنس کر گلے لگا لیا تھا“۔ ان کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ اور لبھانے والا شوخ انداز تھا۔

”لیکن تم نے کبھی ہماری فیملی کو قبول نہیں کیا“۔ وہ کسی گہری سوچ میں بولے۔

”ولید! کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ انہی باتوں نے آپ کے اور ہمارے درمیان فاصلے پیدا کر دیئے ہیں“۔ ان کے لہجے میں بڑی لگاوٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے ایک نظر ڈالی صبا پر اور منہ پھیر کر بولے۔

”کبھی کوئی ماں یہ سزا نہیں دے سکتی اپنے بچے کو کہ یہ بچہ شریر ہے تو اس کو ہاسٹل بھیج دیا جائے۔ تم شاید بھول رہی ہو تم نے زندگی حرام کر دی تھی کہ حذیفہ اس گھر میں رہے گا یا اشمل۔ اشمل صرف 2 برس کا تھا اور حذیفہ 6 برس کا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اشمل تمہارے بغیر کیسے رہ سکتا تھا لہٰذا دل پر پتھر رکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ حذیفہ کو ہاسٹل میں ڈال دوں‘ شاید تم بھول گئیں۔ میری ماں کا تڑپنا‘ میرے بچے کا رونا‘ اتنا آسان نہیں تھا صبا بیگم! میں صرف اشمل کی وجہ سے کمپرومائز کر گیا‘ میں نے جو غلطی کی تھی وہ میں اپنے بیٹوں کو نہیں کرنے دوں گا‘‘۔ وہ چپ ہو گئے۔

’’ولید! یہ تو بچوں والی بات کر رہے ہو‘ اگر اشمل یا حذیفہ کی کوئی پسند ہے تو اسے قبول کرنا ہوگا‘‘۔ وہ بولیں۔

’’کم از کم میں تو نہیں کر سکتا‘ فیصلہ وہی ہوگا جو اب سے کافی برس پہلے ہوا تھا‘ یا اشمل یا پھر حذیفہ۔ ایک کو ہماری زندگی سے جانا ہوگا۔ بائی داوے...... وہ لڑکی ہے کون؟‘‘ ولید نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

’’یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم‘ بس اتنا مجھے اس نے بتایا ہے کہ وہ کسی کو پسند کرتا ہے‘‘۔ وہ بے حد نروس اور گھبرا کر بولی تھیں۔ ان کی باڈی لینگوئج ان کے اندر کے خوف کو ظاہر کر رہی تھی جس کو ولید حیدر نے پڑھ لیا تھا۔ وہ بے حد ذہین انسان تھے جب ہی اتنے وسیع کاروبار کے مالک بنے۔ ان کا ایک بزنس نہیں تھا‘ انہوں نے نا جانے کتنے کاروبار کر رکھے تھے‘ جو ان سے ملتا ان کی شخصیت‘ ان کے ذہن سے امپریس ضرور ہوتا۔ وہ سادہ لباس‘ سادہ گفتگو‘ مذہبی وضع کے انسان تھے لیکن ان کی وسیع ترین پراپرٹی جس پر وہ رہائش پذیر تھے‘ ان کی آنکھوں کی چمک ان کے اسٹیٹس کو ظاہر کرتی تھی۔

اشمل ماں اور باپ کے درمیان ہونے والی گفتگو کی کنسوئیاں لیتا ہوا بڑی بے نیازی سے اپنے روم کی جانب بڑھا۔ ولید حیدر کے جانے کے بعد اشمل ولید باپ کی کرسی گھسیٹ کر صبا کے قریب بیٹھا پوچھ رہا تھا۔

’’مام! میں اگر پاپ سے بات کر لوں تو......‘‘ صبا کو ایک کرنٹ سا چھو گیا‘ اشمل نے غور سے دیکھا۔

’’ہرگز نہیں‘ ایسا کبھی سوچنا بھی نہیں‘ دو خاندانوں کی جنگ جو سرد ہو چکی ہے جس میں تمہارا باپ جیت چکا ہے اور اسی میں تمہاری جیت ہے۔ یو نو...... تمہارے ماموں تمہیں حاصل کر کے ایک نئی جنگ کا آغاز کرنا چاہتے ہیں‘ چپ ہو جاؤ‘ چپ ہو جاؤ اشمل! جس دن انکشاف ہوگا اس دن تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ ولید حیدر کیا کرے گا۔ اس کو اپنے پیسے پر گھمنڈ ہے‘ اپنی دولت سے وہ دوسروں کو جھکانا چاہتا ہے‘ وہ پورے خاندان کو زیر کر دے گا‘ وہ تمہارا باپ ہے لیکن یہ مت بھولو کہ وہ ایک کامیاب ترین انسان ہے۔ دوسرے کی حیثیت اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔ یو نو کہ وہ ہمیشہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے خلاف جاتی ہوں‘‘۔ وہ اشمل کی سمت مڑ کر اپنی باڈی لینگوئج سے اپنے اندر کا کتھارسس ولید حیدر کے خلاف ظاہر کر رہی تھیں۔ اشمل ولید کے بھی اعضا ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ ولید حیدر کی شخصیت کے سامنے کوئی شخص بھی سر نہیں اٹھا سکتا تھا۔ بیوی کیا بیٹے بھی سب ہی یہ بات جانتے تھے‘ وہ بے حد اصول پسند انسان تھے لیکن کسی انسان کو اپنی کمزوری نہیں بتاتے تھے اور اس وقت مبین عباسی نے جو چال چلی تھی وہ ارج کے ذریعے اپنا پچھلا حساب ولید حیدر سے کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات صبا ولید اچھی طرح سے جانتی تھیں اس لئے وہ بے حد خوفزدہ ہو کر اشمل سے بات کر رہی تھیں‘ وہ اس قیامت سے ڈر رہی تھیں جس دن ولید حیدر کو یہ بات پتہ چلے گی۔

’’مام! میں ارج سے محبت کرتا ہوں‘ میں واپس امریکا چلا جاؤں گا‘ پاپ کی اصول پسند زندگی میں افورڈ نہیں کر سکتا‘ جگہ جگہ یہ پھیلا ہوا بزنس‘ آج امریکا تو کبھی بینکاک میں ہوتے ہیں‘ میں پاپ کی زندگی نہیں جی سکتا‘ میں واپس امریکا چلا جاؤں گا‘‘۔ وہ جھنجھلا کر اٹھ چکا تھا۔ اس کے اندر ایک بے بسی اور آنکھوں میں ارج کے لئے محبت کی تپش پگھل رہی تھی۔ صبا کے چہرے پر مایوسی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

☆......☆......☆

کمرے میں ایک اداسی کا منظر تھا۔ ابا اور اماں بیٹھے تو تھے لیکن آج عادل ماموں وائٹ شرٹ‘ براؤن پینٹ میں سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے بہت اداس دکھائی دے رہے تھے‘ ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ابا شاید انہیں فیس نہیں کر سکتے تھے‘ وہ بہانے سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ ماہم کالج سے پلٹ کر اندر آئی تھی‘ ریک پر فائل رکھتے ہوئے اس کی نظر اماں کی بھیگی آنکھوں پر پڑی۔ سفید ساڑھی کے آنچل سے اماں چہرہ پونچھ رہی تھیں‘ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ عادل ماموں‘ ماہم اور شازمہ کی موجودگی میں کوئی بات چھپا رہے تھے۔ ماہم اور شازمہ کی موجودگی میں اماں سے بولے۔

’’اچھا آپی! اللہ حافظ‘‘۔ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ اماں سر بھی نہ اٹھا سکیں۔ ماہم کے قدم من من بھر کے ہو گئے‘ ذہن میں نا جانے کتنے ہی سوالات تھے جو گردش کر رہے تھے لیکن ایسا ہوگا اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ سمعیہ باجی اتنی بڑی کھلاڑی ہیں‘ بڑی خاموشی سے اماں کے کمرے سے وہ نکل گئی تھی۔ اماں نے پلٹ کر جاتے ہوئے ایک نظر اس کو دیکھا‘ اماں کچھ کہنا تو چاہ رہی تھیں لیکن وہ باورچی خانے میں جا کر پلیٹ میں دال اور چاول لے کر آئی تھی۔

اماں کے کمرے میں ابا کی گول میز پر پلیٹ رکھتے ہوئے اماں کی جانب دیکھا تھا۔ اماں ابھی تک خاموشی سے آنسو بہا رہی تھیں۔ اماں کی آنکھوں میں اس سے پہلے اس نے کبھی آنسو نہیں دیکھے تھے۔ ماہم کو یاد آیا‘ ہاں ایک بار اماں کی آنکھوں میں اس نے آنسو دیکھے تھے چھوٹے بھائی جلو کی موت پر‘ اماں اسی طرح سے افسردہ‘ خاموش اور بغیر آواز کے آنسو بہا رہی تھیں اور آج بھی اسی طرح سے آنسو بہہ رہے تھے‘ پھر ماہم کی جانب دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔

’’سمعیہ نے اچھا نہیں کیا‘ حماد کا خط جو تمہارے باپ کے نام آیا تھا وہ لے جا کر عادل کو دیا ہے کہ یہ دیکھو...... کہ حماد تمہاری بیٹی سے شادی نہیں کرنا چاہتا‘‘۔ وہ اداسی سے بولیں۔

حماد نے تلخی سے لکھا تھا کہ ’’عادل صاحب سے کہہ دیں کہ اپنا ڈیرہ اٹھائیں اور واپس چلے جائیں‘ میں رومی سے شادی نہیں کر سکتا‘ صاف صاف ابا انہیں بتا دیں اور ہمارے گھر سے جائیں‘‘۔

’’اونو...... اماں! سمعیہ باجی نے وہ خط حماد بھائی کا ماموں کو دے دیا‘‘۔ تو اماں کی بے بسی سے اور آنسو نکل آئے اور بولیں۔

’’عادل کہہ رہا تھا‘ آپی خط پڑھ کر ایسا لگا کہ زمین پھٹے اور ہم سما جائیں‘ ہم کل ہی اپنے گھر لوٹ جاتے ہیں۔ یہ سمعیہ نے اچھا نہیں کیا‘ جتنی دیر عادل بیٹھا رہا نظریں جھکی ہوئی تھیں‘ تمہارے ابا بھی کچھ کہہ نہ سکے‘ کیسی چوٹ دی ہے سمعیہ نے میرے بھائی کو‘ کتنے برسوں کے بعد وہ یہاں آیا تھا‘ اس کو کیا ضد ہے کہ حماد اور رومی کا رشتہ نہ ہو‘‘۔ اماں بڑے دلگیر لہجے میں آنچل سے آنسو پونچھ کر بولی تھیں۔

’’انا پرستی‘ چوہدراہٹ کہ ہم جو کہیں گے وہی ہوگا‘ ابا نے اور آپ نے انہیں سر پر بٹھا کر رکھا ہے‘ اگر وہ مالی مدد کر دیتی ہیں تو ایسا کون سا احسان ہے اماں! جس کی وجہ سے آپ چپ ہو جاتی ہیں‘‘۔ ماہم بڑے شکستہ لہجے میں بولی تھی۔

’’مجبوری نہیں ہے بیٹا! سوچ نہیں سکتے تھے کہ وہ ایسا کرے گی اور حماد کہ اتنا سخت لہجہ‘‘۔ اماں کی آواز روہانسی ہو رہی تھی۔ ماہم ابھی تک لائٹ براؤن قمیض وائٹ شلوار دوپٹے میں بیٹھی تھی۔ پلیٹ میں پڑے دال چاول ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ باجی کی وہ پراسرار مسکراہٹ ماہم کو یاد آ رہی تھی۔

دوسرے دن ہر ایک کو باجی یہی بتا رہی تھیں کہ حماد نے رومی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اچھے خاصے

عادل ماموں یہاں پڑے تھے اب اپنے گھر کو لوٹ رہے ہیں۔ رومی کی شادی تو ہم صفدر سے کریں گے۔ پھر بڑی ہمدردی سے باجی گھر بھی آئی تھیں اور پان چبا چبا کر کھا رہی تھیں' ان کے نچلے ہونٹ پر باریک سی لکیر اور پان کی پیک جو ماہم کو بھی اچھی لگتی تھی ایک زہر کی طرح رگوں میں سرایت کرنے لگی۔ سمعیہ باجی نے اسے ہنس کر دیکھا اور پرس اٹھا کر چلی گئی تھیں۔

رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی' ماہم کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ ڈرائنگ روم کا اس نے پردہ کھول کر باہر دیکھا' دور تک سناٹا تھا' سامنے شیر شاہ کی پہاڑیوں پر دہکتا ہوا چاند روشنی پھینک رہا تھا' گہری نیند میں سوئے ہوئے درخت' پاگل کتوں کی طرح بھونکتی ہوئی یہ اندھیری رات دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اِکا دُکا کتے یا بلیاں نظر آ رہے تھے۔ ماہم قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر ایک سادہ سی کاپی میں نا جانے کیا کیا لکھ رہی تھی۔

انسان کے کتنے روپ ہیں' ایک بہن ایسی بھی ہو سکتی ہے۔ سمعیہ باجی کا اتنا بڑا دماغ کہاں سے آیا اور میرا باپ اتنا بڑا ریٹائرڈ پولیس آفیسر کے پاس سے باجی خط کیسے لے گئیں۔ اس کے ذہن میں اتنے سارے سوالات تھے کہ وہ بار بار اپنے کالج کی فائل میں ایک ہی شعر کو لکھے جا رہی تھی۔

''اغراض کے گہرے پردے میں ہر شخص محبت کرتا ہے
حالانکہ محبت کچھ بھی نہیں''

تب بچپن سے لے کر آج تک باجی کے دیئے گئے زخم جو اس کی روح پر لگے تھے یاد آ رہے تھے۔ ابا کا مقروض ہو جانا' ابا کے پاجامے میں پیوند لگانے کا کام ماہم ہی تو کرتی تھی۔ وہ گاؤں میں آئے ہوئے باجی کے اخراجات' پھول اور گجرے کی ٹوکریاں' مٹھائی کے ٹوکرے' گرم گرم تلی ہوئی مچھلی کے وہ پیس' بھاپ نکلتی ہوئی دودھ پتی کی چائے' خاطر مدارت میں لگی ہوئی ثروت' شانزہ اور ماہم اور اماں کی وہ شاہ خرچیاں' سمعیہ باجی کے وہ عیش و عشرت اور ماہم سے چھوٹی سی ایک ڈیل کی تھی باجی نے کہ ''یہ باکس مجھے دے دو جب تم کراچی آؤ گی تو یہ ہم تمہیں واپس کر دیں گے ورنہ جب تم لوگ یہاں سے شفٹ ہو گے تو یہ سب عادل ماموں کے گھر دیا جائے گا'' اور وہ کیسے ٹریپ ہوئی تھی' جب اس نے شہر آ کر اپنے باکس کا مطالبہ کیا تو باجی مکر گئیں۔ وہ آنسوؤں سے روئی تھی تب ابا نے کہا تھا۔

''بیٹا! ہم تمہیں دوسرا لا دیں گے''۔

''نہیں ابا! باجی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ واپس کر دوں گی''۔ لیکن وہ کسک وہ یاد آج بھی اس کے دل میں باقی تھی حالانکہ اس بات کو برسوں بیت گئے تھے' یہی بات تھی کہ وہ آج تک نہیں بھول سکی تھی۔

رات کا نا جانے وہ کون سا پہر تھا' وہ اپنی کالج کی بک پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی۔



عادل ماموں اپنے بھائی شکیل کے گھر آئے تھے۔ بجھا بجھا چہرہ اماں سے چھپا ہوا نہ رہ سکا۔ ماں کا وہ زاویہ نگاہ کیا جو بچوں کے دل کو نہ پڑھ سکے۔ پرت در پرت ماں کے سامنے وہ بھید کھل جاتے ہیں جو انسان دوسروں سے چھپائے پھرتا ہے۔

سمجھ تو اماں بھی گئی تھیں لیکن کچھ نہ بولیں۔ سمعیہ باجی کی لگائی ہوئی آگ تھی یا وہ حسد جو کلثوم کے دل میں چپکے سے در آئی تھی کہ اتنی بنی سنوری ایشل خاندان میں کسی کو پسند نہ آئی اور رومی ایک پل میں سب کی آنکھوں کا تارہ بن گئی۔ بس عادل ماموں نے اپنے جانے کا فیصلہ سنایا تھا کہ وہ تھوڑے ہی دنوں میں چلے جائیں گے لیکن وہ رومی کو

ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ وہ ماں سے کھل کر تو بات نہ کر سکے البتہ دبے دبے لفظوں میں اپنے دل کی بات کہہ گئے تھے کہ ارسلان جو کہ کلثوم کا سب سے بڑا بیٹا تھا اس سے نسبت کر لیں۔ اماں نے آہستہ سے یہ بات کلثوم کے کان میں ڈالی تھی وہ ایک لمحے میں چراغ پا ہو گئیں۔

''اماں! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ؟ یہ ذکر بھی گھر میں نہیں نکالیے گا آپ۔ ہمارے گھر میں خود دو بیٹیاں بیٹھی ہوئی ہیں' ابھی ہمیں انہیں بیاہنا اور دیکھنا ہے' آپ کے تو اتنے ہوتے سوتے خاندان میں بکھرے پڑے ہیں' ابھی تھوڑے ہی دنوں کی تو بات ہے کیسا رومی کو بنا سنوار کے اس تقریب میں پیش کیا تھا' ہائی فائی لوگ ہیں' بولیے ان سے وہ کروا دیں گے''۔ کلثوم اپنے دل کی بھڑاس نکال گئی تھیں۔ مہنگائی کے دور میں شاید عادل کی فیملی انہیں بھی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

''بس کلثوم بس! کسی کی بیٹی کے لئے اتنے بڑے بڑے بول مت بولو' ہر ایک کا نصیب اللہ نے لکھا ہے' مجھ سے غلطی ہو گئی مگر کلثوم! تجربے کی بات کہہ رہی ہوں اپنے اپنے ہوتے ہیں' غیر پھر غیر ہیں۔ اب تمہارا ارسلان صرف ایک ہی بیٹا ہے تمہارا بڑھاپے کا سہارا''۔ اماں کا لہجہ بہت غمگین سا ہوا تھا۔ وہ بہت خدا ترس خاتون تھیں۔ دوسروں کی مصیبت میں کام آ جانا اللہ ہر ایک کے نصیب میں نہیں لکھتا لیکن انہوں نے ہمیشہ یہ اجر پایا تھا۔ رومی تو ان کی پوتی تھی اور اس وقت بھی سعیدہ ان کی نند کی بیٹی تھی جب ولید حیدر ہاؤس میں سے نکل کر چھوٹی سی بستی میں گئی تھیں۔ بے بس سی سعیدہ اور مظلوم سی نند بی بی جو یہ نہ کہہ سکی تھیں کہ ولید ہاؤس سے کیوں نکلی تھیں اور جس دن ان کے نکلنے کے ایک ہفتے بعد جب ولید حیدر کا کارڈ ملا تھا تو حیران تو ہوئی تھیں لیکن آنسوؤں سے بھی روئی تھیں اس لئے نہیں کہ ولید حیدر کی شادی ہے اس لئے کہ وہ جانتی تھیں کہ سعیدہ اور ولید ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور آنسو پونچھ کر انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ انہی دنوں سعیدہ کا رشتہ عادل سے کریں گی اور پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ عادل کے لئے سعیدہ کو مانگ لیا تھا۔

برسوں پرانی ایک کہانی تھی جو اتنی خاموشی سے آہستہ سے ولید حیدر ہاؤس سے باہر نہ آئی اور وہیں دب کے رہ گئی اور آج اماں کو پھر رومی کو دیکھ کر خیال آیا تھا' رومی ان کے سامنے آئی تھی اس کو نہ حماد مل سکتا تھا نہ ارسلان۔ رومی انہیں بے حد پیاری تھی اس لئے انہوں نے کلثوم سے یہ بات کی۔ کلثوم کے جواب سے انہیں دکھ اور ملال تو ہوا تھا لیکن انہوں نے ساتھ ہی اللہ سے رومی کے نصیب کی دعا مانگی تھی۔

''اللہ! رومی کا نصیب اچھا کرے''۔ ان کے سامنے سعیدہ کا چہرہ بار بار آ رہا تھا۔

''ایسا کیا ہوا ان کے درمیان کہ بی بی نے کبھی کوئی ذکر نہیں کیا اور سامان اٹھا کر عیش و آرام چھوڑ کر کورنگی کے معمولی سے مکان میں شفٹ ہو گئیں' کئی بار پوچھا بی بی سے لیکن وہ ہر بار ٹال گئیں' بھلا سعیدہ سے یہ بات پوچھنے کی تھی خیر تجسس تو تمام عمر مجھے بھی رہا' پورے خاندان کو رہا اور آج بھی ہے کہ معاملہ کیا تھا۔ ولید تو سعیدہ پہ جان دیتے تھے اور سعیدہ' ماموں کی بھی جان تھی' ہر لمحہ وہ اسی کو آواز دیتے تھے۔ ایک رات اور دن کے بیچ ایسا کیا ہوا کہ سب کچھ ختم ہو گیا' کسی کو کوئی خبر نہ ہوئی''۔ اماں نا جانے کن خیالوں میں کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھیں۔

''دادی! چائے''۔ رومی نے انہیں چونکا دیا تھا' وہ سامنے نورانی سا چہرہ' سر پر دوپٹہ ڈالے ان کے سامنے کھڑی تھی۔

''ہاں دادی! بابو جی سے کہیے نا کہ وہ ایشل کی شادی تک یہیں رک جائیں''۔ وہ دادی کے کندھے سے لگ کر

بیٹھ گئی تھی۔

"نہیں بیٹا! وہ کافی دنوں سے یہاں آیا ہوا ہے' تمہارے بھائیوں کی تعلیم کا حرج ہو رہا ہے' کھیتی باڑی سب کچھ چھوڑ کر آیا ہے' میں نہیں سمجھتی کہ اسے یہاں اور رہنا چاہیے"۔ انہوں نے بہت غور سے رومی کو دیکھا تھا۔ رومی کے بھی دل کی خبر اماں کے دل کو ہو گئی تھی کہ رومی کیوں چاہ رہی ہے یہاں رہنا؟ دادی نے بڑی بے رخی سے اسے جواب دیا تھا تو وہ مایوس ہو کر تھکے تھکے قدموں سے چلی تو گئی تھی لیکن جاتی ہوئی رومی کی باڈی لینگویج کہہ رہی تھی کہ کاش کوئی اسے کچھ دن یہاں اور روک لیتا۔



ولید حیدر آج رات امی سے بہت دیر تک نا جانے کیوں باتیں کرتے رہے تھے' پورے خاندان کا ذکر کرتے رہے' آخر دبے دبے لفظوں میں سعیدہ کا بھی ذکر آ ہی گیا تھا۔ امی جان نے گھبرا کر باتوں کا رخ موڑ دیا تھا' تبھی ولید حیدر بڑے بے کل سے ہو کر بولے تھے۔

"امی جان! بہت دنوں کے بعد سعیدہ آئی ہے آپ اس کی کچھ مالی مدد کر دیجیے گا"۔ ان کی آواز بڑی دبی دبی سی تھی تا کہ دوسرا نہ سن لے۔

"ہاں میں نے بہت کچھ کر تو دیا ہے ولی! تھوڑا چلو اور کر دوں گی تمہاری طرف سے' بچوں کی طرف سے فکر مند ہے' بیٹا ابھی پڑھ رہا ہے' بیٹی کی ہے ذمے داری اس پر' کہہ تو دیا ہے میں نے اس سے کہ تم فکر نہیں کرو سب کچھ ولی کرے گا۔ سنا تو ہے جہاں رومی کی نسبت طے تھی وہ لوگ راضی نہیں ہو رہے"۔ اماں کا لہجہ بہت ست سا تھا۔

"ٹھیک ہے امی! میں علی سے بات کرتا ہوں' اس کی جان پہچان میں کوئی لڑکا ہوا تو جاب تو میں اسے دے دوں گا' شرط تو یہ ہے کہ پڑھا لکھا ہو اور آپ لوگ بھی ذہن میں رکھ لیجیے گا اور سعیدہ سے کہیئے کہ اگر کوئی اچھا لڑکا ہو تو نظر میں رکھیں' اسے میں جاب دلوا دوں گا"۔ لگتا تھا آج ولید حیدر بہت فرصت سے ماں کے قریب آ کر بیٹھے تھے۔

"ولی! تم کل کی فلائٹ سے جا رہے ہو' اپنا خیال رکھو ولی"۔ ان کا لہجہ بہت راحت رساں تھا۔

"نہیں امی! بچوں کیلئے تو جانا ہی پڑتا ہے۔ اتنا آسان نہیں ہے جینا"۔ وہ بہت دیر تک امی جان کے پاس بیٹھے رہے تھے۔ کافی دیر کے بعد اٹھ کر اپنے روم کی طرف آ رہے تھے تو اشمل ولید ہاتھ میں ریکٹ لئے ہوئے وائٹ سوٹ اور ریڈ اور وائٹ جوگرز اور ریڈ شرٹ میں اس کا چہرہ بلش کر رہا تھا۔ اس کی ریڈ رنگت' براؤن آنکھوں کا شیڈ نکھر آیا تھا۔ ایک لمحے کیلئے وہ گزرتے ہوئے رک گیا۔

سامنے ہی صبا راکنگ چیئر پر بیٹھی ہوئیں کوئی میگزین دیکھ رہی تھیں۔ ان کے کلرنگ ریشمی بال تھوڑے سے بکھر کر شولڈر پر پڑے تھے۔ ان کی شخصیت بہت پر وقار سی لگ رہی تھی۔ ولید حیدر کی ایک نظر صبا کے چہرے پر گئی تو انہوں نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ولید حیدر ان کی اس ادا پر مسکراتے ہوئے اشمل کی طرف رخ کر کے بولے۔

"او مائی سن! بہت ہینڈسم دکھائی دے رہے ہو' کیسا جا رہا ہے سب کچھ؟ میں نے سنا ہے تم نے آفس میں کوئی نئی ارینجمنٹ کی ہے"۔

"یس پاپ! میں نے بہت خوبصورت ڈیکوریٹ کروایا ہے' میں بہت جلد واپس آؤں گا"۔ بول وہ ولید حیدر

سے رہا تھا مگر دل کے اندر تیز ہوائیں چلنے لگی تھیں' مام سامنے تھیں اور پاپ بھی اس کے سامنے' کہیں پھر نہ کوئی شادی کا ذکر نکل آئے' اس لئے اس نے گھبرا کر ولید حیدر کی جانب دیکھا۔

"کیا ہوا تم کیسی ہو؟" وہ صبا سے مخاطب ہوئے تھے۔

"نو پرابلم"۔ وہ بولیں۔

"کیا ہوا' لائبہ یاد آ رہی ہے؟ سیٹ بک کروا دوں؟" وہ بولے۔

"کیوں نہیں...... یاد تو آتی ہے بیٹی ہے میری' مگر وہ وہاں اپنے دوستوں میں اتنی مگن ہے کہ اس کے پاس ٹائم نہیں ہے اور جب وہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے تو میں اس وقت مصروف ہوتی ہوں' میسج پر میسج کر رہی تھی تھوڑی دیر پہلے کہ مام سوری...... جب میں کال کروں کہ آ جاؤ لائبہ Skype پر تو کہتی ہے کہ مام میں اس وقت بزی ہوں' میں آؤٹ ڈور ہوں' تو ٹھیک ہے میں نے بھی سیل آف کر دیا ہے"۔

"نو صبا نو...... ایسا مت کرو وہ وہاں اکیلی ہے"۔ ولید حیدر بڑے پیار بھرے لہجے میں بولے تھے۔

"اب تو ہاسٹل سے ویک اینڈ پر بھی ماما کے گھر بھی نہیں جاتی ہے' آخر ارج بھی تو اسی اسٹیٹ میں ہے' پتہ نہیں لائبہ کو ایسا کیا پرابلم ہے جو مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہے"۔

"بچوں سے قریب رہتے ہیں' تم کوشش کرو اس کے قریب رہنے کی اور کوئی ایسا پرابلم نہیں ہے صبا! تم خود چلی جاؤ اگر تمہارا دل چاہ رہا ہے تو"۔ وہ بہت پر سکون انداز میں بولے تھے۔

"سوری...... میرا وہاں دل نہیں لگتا"۔ وہ شانے اچکا کر بولیں۔

"وہاں کی مجھے ہر چیز پسند ہے' میں بچوں کو وہاں ایڈجسٹ کرنا چاہتی ہوں' آفٹر آل میری ماں ہے وہاں لیکن میں انجوائے یہیں کرتی ہوں"۔ وہ ہونٹ سکیڑ کر بولی تھیں۔

"اور تمہاری گیدرنگ کیسی جا رہی ہے؟" وہ بولے۔

"زبردست انجوائے منٹ ہے' ہر مہینے ہم سب پارٹی دیتے ہیں' اس سیٹر ڈے کو حسیب کے گھر پارٹی ہے' اس کی بیٹی ڈاکٹر بن گئی ہے۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو ہاؤس وارمنگ پارٹی ہے' سنا ہے اس نے گھر بہت اچھا ڈیکوریٹ کروایا ہے"۔ وہ جتاتے ہوئے بولے۔

"اس کی بیوی تو مجھے بالکل پسند نہیں ہے چھچھوری...... شکل سے گوجر والی لگتی ہے' کہتی ہے کہ میرے باپ کا بڑا کاروبار ہے"۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولیں۔

"خیر چھوڑو صبا! اس پارٹی میں تو حسیب نے تمہیں بلوایا ہے' زبردست انجوائے منٹ ہے اس بار' تم چلو تو سہی"۔ وہ ریکوئسٹ والے انداز میں بولے تھے۔

"سوری ولید! آل ریڈی سیٹر ڈے کو ایک چیرٹی شو میں چیف گیسٹ ہوں' معلوم نہیں واپسی پہ کیا پروگرام ہے ب کا' ہو سکتا ہے واپسی پر ہم لوگ باربی کیو نائٹ جائیں"۔ وہ بہت اکڑ کر بولیں۔

"صبا! ایسا کیا ہے تمہارا حسیب کی بیوی سے کہ تم اس کو پسند نہیں کرتی ہو؟"

"بس ولید! وہ میرے اسٹیٹس کی نہیں ہے اور میری زندگی میں اسٹیٹس کا ایک مقام ہے۔ یو نو ولید! ملنے جلنے والے لوگوں سے انسان پہچانا جاتا ہے"۔ انہوں نے اپنے بالوں کو کلپ سے آزاد کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھی لگ رہی ہو"۔ ولید حیدر مسکرا کر بولے تھے۔

"تھینکس ...." وہ راکنگ چیئر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ اشمل ولید اس دوران بہت خاموشی سے فائدہ

اٹھاتے ہوئے گزر گیا تھا۔

وہ سیدھے اٹھ کر اپنے بیڈروم کی طرف آئے تھے۔ صبا سامنے سے گزرتی ہوئیں اپنے بیڈروم کی طرف چلی گئی تھیں۔ اشمل ان کے کمرے میں گھسا ہوا کچھ دراز میں ڈھونڈ رہا تھا۔

''مام! میرا ہیڈ فون تھا آپ کی ٹیبل پر''۔ وہ ٹی اَن ٹی کرتے ہوئے بولیں۔

''اشمل! میری کسی بھی چیز کو ہاتھ مت لگایا کرو' میری دراز تم نے الٹ کر رکھ دی''۔

''مام! خود کون سا کرتی ہیں آپ' کروالیجیے گا خدیجہ سے''۔

''میں کسی کو بھی اپنی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی''۔ وہ غصے سے بولیں۔

''مام! میں آپ کا بیٹا ہوں''۔ اشمل ہنسنے لگا۔

''اشمل! تم مجھے اچھی طرح سے جانتے ہو' میرے بیڈروم میں کوئی آئے مجھے بالکل پسند نہیں''۔

''جانتا ہوں مام! آپ تو پاپ کے ساتھ بھی اچھوتوں کی طرح رہتی ہیں''۔

''سوواٹ......'' انہوں نے بہت غصے سے اشمل کی جانب دیکھا۔

''میں تو کہتی ہوں تمہیں بھی کیئر کرنی چاہیے' یہ فیملی Disease ہے کسی کو بھی لگ سکتی ہے''۔ ان کے لہجے میں بڑی سختی تھی۔

''مام! اگر یہ خاندانی Disease ہے تو یہ تو مجھے بھی لگ سکتی ہے' حذیفہ کو بھی لگ سکتی ہے' مگر دادی کو تو ایسا کوئی پرابلم نہیں ہے''۔ وہ بہت مضبوط لہجے میں بولا تھا۔

''اسی بات کا تو مجھے دکھ ہے کہ تم میرے بیٹے ہو اور میں بے بس اور مجبور ہوں' میں تمہیں اس ماحول سے اسی لئے دور رکھنا چاہتی ہوں' میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر لائبہ کو خود سے دور کر دیا۔ یہ نوکروں کی فوج جو ولید ہاؤس میں پھیلی ہوئی ہے' دادا سے لے کر باپ' باپ سے لے کر بیٹا تک خدمت انجام دے رہا ہے' اتنی لاپرواہیاں ہیں اس گھر کے اندر۔ ٹیبل پر ایک ساتھ کھانا' ایک ساتھ برتن''۔ وہ بڑے سخت لہجے میں اشمل سے مخاطب تھیں۔

''مام! آپ پاپ کو بہت ہرٹ کرتی ہیں' وہ کتنے لونگ نیچر ہیں' ہنستے رہتے ہیں آپ کی ہر بات پر''۔

''وہ ان کی عادت ہے' وہ تو نوکر کے بھی ہاتھ پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ خدیجہ آپ کیسی ہیں؟ بچے ٹھیک ہیں؟ اور وہ علی تمہارے باپ کا چمچہ...... میں کہاں جا رہی ہوں' کیا کر رہی ہوں' پورے گھر کی مخبری کرتا ہے''۔ وہ برہم لہجے میں بولی تھیں۔

''اونو مام!'' اشمل کو بہت زور کی ہنسی آئی تھی۔

''اشمل! تم اس وقت مجھے زہر لگ رہے ہو' نکل جاؤ تم میرے روم سے''۔

''لیکن مام! آپ تو اس وقت مجھے بہت خوبصورت لگ رہی ہیں' سادہ سے لباس اور کھلے ہوئے بالوں میں' بالکل نیچرل پوز...... ون منٹ مام!'' اس نے جلدی سے موبائل Click کیا تھا۔

''اشمل کے بچے...... میرے سارے بال اڑ رہے ہیں' چلو لاؤ دکھاؤ مجھے کیسی آئی ہے پکچر''۔ وہ اس کے ہاتھ کی طرف جھپٹی تھیں لیکن وہ ہنستا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

(جاری ہے)

☆

قرۃ العین فیصل چنا

مکمل ناول

عشق عشق

پڑوسیوں کے ہاں لہک لہک کے گاتی شنو کو سائی نے چٹیا سے کھینچا۔

"آہ...... کیا کرتی ہو اماں"۔ شنو کے منہ سے ایک دہائی بلند ہوئی۔



''وہی جس کے تم لائق ہو' گھر کے سو کام چھوڑ کے بے گانے کی شادی میں عبداللہ دیوانی بنی بیٹھی ہو''۔ وسائی نے اسے گھسیٹ کر اٹھایا۔

''اماں! میری پیاری دوست موبل کے بھائی کی شادی ہے' کیا وہ بے گانی ہے' پرائی ہے......؟'' وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''چل گھر چل' پھر تجھے بتاتی ہوں کہ کون اپنا ہے اور کون پرایا''۔ وہ بختی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے آئیں۔

''دیکھ لو اپنی لاڈلی کے لچھن وہاں ہمارے دشمن خیرل کے گھر بیٹھی شادیانے بجا رہی تھی' ذرا جو لحاظ ہوا سے اپنے ماں باپ کی عزت کا' بھلا ان سے ہمارا کوئی بہت برادرے ہے کیا......؟ ہم اتنے بھی گرے پڑے نہیں ہیں جو یوں بن بلائے مہمان بن کر کسی کے بھی گھر میں گھس جائیں''۔ وسائی کہنیوں تک بازو چڑھائے اپنے شوہر پیرل سے شنو کی شکایت کر رہی تھی۔

''ارے بچی ہے' اسے کیا پتہ.......... اس چھوری موبل کے ساتھ اس کی اچھی سنگت ہے' بس چلی گئی ہو گی اس کے کہنے پر''۔ حسب عادت انہوں نے شنو کی سائیڈ لی تو وہ تن کے کھڑی ہو گئی' اور ماں کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے ہمدردی ہو اب بولیں۔

''بس یونہی بچی کہہ کہہ کر اسے سر پر چڑھاتے رہیں''۔ وہ چڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

''بابا! دیکھو ناں اماں ہر وقت مجھ پر کتنی روک ٹوک کرتی ہیں''۔ وہ دندناتی ہوئی پیرل کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

''ناپتر...... ماں باپ کبھی بھی اپنی اولاد کا برا نہیں چاہتے' وہ ہمیشہ ان کے حق میں اچھا ہی سوچتے ہیں' بس ان کے پیار کرنے کا طریقہ الگ ہوتا ہے' تیری ماں کو بھی تیری بہت فکر ہے اس لئے وہ اتنی روک ٹوک کرتی ہے' وہ دل کی بری نہیں' ہاں تھوڑی سی بے وقوف ضرور ہے' پر تم دل پر مت لیا کرو''۔ پیرل نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ شکل لٹکا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''تو اب بڑی ہونے لگی ہے' جو تیری ماں سمجھائے ویسے کیا کر' ادھر ادھر گھومنے سے پرہیز کیا کر' اب اٹھ جا کر ماں سے پوچھ شاید اس کے پاس تمہارے لئے کوئی کام تھا''۔ اس بار پیرل نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ نرم پڑ گئی۔

''اماں! کوئی کام تھا تجھے......؟'' اس نے دوسرے کمرے میں آ کر جھانکا' مٹی کے لیپ والے فرش پر وہ چٹائی بچھائے کوئی قمیض کاڑھ رہی تھیں۔

''ہاں ادھر آؤ''۔ انہوں نے ناراضی سے کہا۔

''یہ دو رلیاں اور تین قمیضیں ہیں یہ اٹھاؤ اور حویلی دے کر آؤ''۔ حویلی کا نام سن کر اس کے منہ پر بارہ بجنے لگے وہ بڑی پراسراری حویلی تھی' جہاں ہر وقت سناٹا شور مچاتا تھا' اسے نجانے کیوں اس سناٹے سے بہت خوف آتا تھا' بالخصوص صبوحی سے' جو عجیب عجیب باتیں کرتی تھی۔

''رلیاں جی جی صاحب کو اور قمیضیں صبوحی کے ہاتھ میں دینا یاد سے''۔ اس کا دل چاہا ماں کو منع کر دے کہ وہ حویلی نہیں جائے گی لیکن پھر ان کا تنا ہوا چہرہ دیکھ کر چپ چاپ سامان اٹھا لیا اور پھر بابا نے بھی تو کہا تھا اپنی ماں کی بات مانا کرو۔

''کچھ دیر صبوحی کے پاس بیٹھ جانا' کل بھی وہ تیرے لئے پوچھ رہی تھی' ادھر ادھر جاہل لوگوں کے ساتھ پھرنے کی بجائے کچھ دیر پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت میں رہنا بہتر ہوتا ہے' کچھ سیکھ لیا کر اس سے' کچھ پڑھ بھی لیا کر''۔ ماں کی

بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا' چپ چاپ گٹھڑی اٹھا کر حویلی کی طرف چل دی۔



''جی جی صاحب! اماں نے رلیاں بھجوائی ہیں''۔ اماں کی ہدایت کے مطابق جب اس نے سب سے پہلے اماں جی جی کے کمرے کا رخ کیا وہ پلنگ پر نیم دراز تھیں اور ان کی خاص ملازمہ خیراں پائنتی کی طرف بیٹھی ان کے پاؤں دبا رہی تھی۔

''لا دکھا کیسی بنائی ہیں تیری ماں نے رلیاں......؟'' وہ سیدھی ہو بیٹھیں شنو نے رلیاں ان کے سامنے رکھیں۔

''خیراں...... ذرا رلیاں کھول کے دکھا مجھے......'' انہوں نے خیراں کو حکم دیا اس نے باری باری دونوں رلیاں کھول کر ان کے سامنے پھیلائیں۔

جی جی صاحب رلی کا ایک کونا ہاتھ میں لے کر اس پر جھک گئیں' شاید وہ سلائیوں کا جائزہ لے رہی تھیں یکا یک ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی' اور آنکھوں میں اطمینان۔

''دیکھ تو خیراں! بڑی اچھی سلائیاں لگائی ہیں' ہر ٹانکا موتی جیسا باریک اور سیدھا ہے''۔

''ہاں جی جی! وسائی کی یہی تو خوبی ہے کہ وہ دل لگا کر کام کرتی ہے' جبھی تو سلائی کڑھائی کا زیادہ تر کام آپ اسی سے کرواتی ہیں''۔ خیراں نے بھی تعریف کی۔

''صحیح کہہ رہی ہو' چل اب یہ رلیاں لپیٹ کر میرے بستروں والے صندوق میں رکھ آؤ''۔ جی جی صاحب کے حکم پر خیراں رلیاں لے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

''لا دکھا یہ بغل میں کیا دبا رکھا ہے؟ صبوحی کی قمیضیں ہیں کیا......؟'' خیراں کے جانے کے بعد جی جی اس کی طرف مڑیں۔

''ہاں جی جی صاحب! اماں نے کہا تھا صبوحی بی بی کے ہاتھ میں دینی ہیں''۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا کر کہا تو وہ بھی سر ہلانے لگیں۔

''چل جا صبوحی کو جا کر دے دے یہ قمیضیں اور اس سے کہہ نئی نئی شادی ہوئی ہے' کچھ نیا پہن اوڑھ لیا کرے''۔ ان کے چہرے پر ایکدم اداسی چھا گئی۔

''شنو کوئی جواب دیئے بغیر وہاں سے نکل آئی اب اسے صبوحی کے کمرے میں جانا تھا۔

''میں آ جاؤں کمرے میں......؟'' اس نے کمرے میں جھانک کر دیکھا ہمیشہ کی طرح وہ کھڑکی کے پاس نظر آئی کھڑکی کے اس پار حویلی کی طرف آنے والا کچا راستہ تھا۔ انتظار سے خمار آلود اس کی نگاہیں اسی راستے کی لکیروں میں الجھی رہتی تھیں۔ کھلے بال' بکھرے اجال اور رت جگوں سے بوجھل آنکھیں خاموش لب اسے لگا اس کے سامنے صبوحی نہ ہو بلکہ کسی رسالے یا میگزین کی تصویر ہو۔

''میں آ جاؤں کمرے میں......؟'' صبوحی کو بے ساکت و سامت کھڑا دیکھ کر اس نے دوبارہ پوچھا۔

''تم آ جایا کرو بس...... پوچھا مت کرو''۔ اس کے صرف ہونٹ ہلے تھے باقی وہ پوری ویسے ہی کھڑی ہوئی تھی۔

''اماں نے آپ کی قمیضیں کاڑھ دی ہیں وہی لے کر آئی ہوں''۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ اصل میں وہ صبوحی کو دیکھ کر کچھ ڈر سی گئی تھی۔ لمبے سیاہ کھلے بکھرے کمر تک آتے بال اور خاموش آنکھیں اسے کوئی اور ہی مخلوق بنا رہے تھے' شنو کو اس وقت وہ کوئی بھٹکی ہوئی روح لگی۔

''الماری میں رکھ دو''۔ وہ کھڑکی کے پاس ہی کھڑی تھی۔ شنو نے الماری کا ایک تاک کھولا اندر سے سوکھے

گلابوں کی مہک آنے لگی' سوٹ رکھ کے وہ واپس مڑنے لگی تو صبوحی نے اسے پکار لیا۔

''واپس کیوں جا رہی ہو؟ تھوڑی دیر بیٹھو میرے پاس''۔ وہ کھڑکی کا پٹ بند کر کے پلنگ پر آ بیٹھی' وہ بہت نڈھال اور لاغر لگ رہی تھی۔

''پتہ نہیں یہ بھٹکی ہوئی روح کھانا بھی کھاتی ہوگی یا نہیں''۔ اس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں سوچا۔

''ادھر آؤ''۔ اس نے پیار سے بلایا اس کی آنکھیں جو پہلے خاموش اور ٹھہری ہوئی تھیں ان میں شنو کو زندگی کی ہلکی سی رمق نظر آئی' وہ چپ چاپ اس کے سامنے جا کر بیٹھ گئی' صبوحی بھی چپ تھی' بس اسے دیکھے جا رہی تھی' شنو کو اس خاموشی سے گھٹن اور گھبراہٹ ہونے لگی۔

''وہ جی جی صاحب کہہ رہی تھیں آپ نئے کپڑے پہنا کریں' آپ کی نئی نئی شادی ہوئی ہے ناں اس لئے''۔ اس بے نام سی خاموشی سے پیچھا چھڑانے کے لئے اس نے بات کرنے میں پہل کی۔

''نئے کپڑے پہنوں......؟'' اس نے جیسے خود سے پوچھا' پھر چھت کی طرف دیکھنے لگی۔

''کس کے لئے......؟'' وہ خود سے ہی باتیں کر رہی تھی تو پھر اسے کیوں پاس بٹھایا تھا۔

''اپنے لئے' جی جی کے لئے''۔ اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی صبوحی نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر قہقہہ مار کر اتنی زور سے ہنس دی کہ شنو ڈر کے مارے پیلی پڑ گئی۔

''اپنے لئے بھی کوئی کپڑے پہنتا ہے بھلا...... بالخصوص شادی کے بعد''۔ اس کی آنکھوں میں پھر سے ویرانیاں اتر آئیں' وہ چپ ہوگئی۔

''بی بی جی آپ......؟''

''مجھے صبوحی کہا کرو''۔ صبوحی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کا نام کیسے لے سکتی ہوں''۔ اس نے نگاہیں نیچی کر لیں۔

''کیوں......؟''

''آپ بڑے لوگ ہیں آپ کی شان کچھ اور ہے' آپ حویلی میں رہتے ہو اور ہم کچے مکان میں''۔ وہ اپنی اور اس کی حیثیت کا تقابل کرتے ہوئے بولی۔

''کھاتی کس کا ہو......؟'' صبوحی نے اچانک پوچھا۔

''اپنے باپ کا......'' شنو نے تیزی سے جواب دیا۔

''تو پھر......؟ جب کھاتی اپنے باپ کا ہو تو چھوٹے اور بڑے کا فرق کر کے حیثیتیں کیوں مقرر کرتی ہو' میں اگر حویلی میں رہتی ہوں تو اپنا کھاتی ہوں' تم کچے مکان میں رہتی ہو تو اپنا کھاتی ہو' میرا تم پر کوئی احسان نہیں پھر تم کس پہلو سے مجھے فوقیت دے رہی ہو''۔ وہ فلسفیانہ انداز میں بولی شنو چپ ہوگئی بس ایک اسی بات کی وجہ سے تو وہ اسے اچھی لگتی تھی کہ اس میں غرور نہیں تھا' اپنی شان و شوکت پر کوئی زعم نہیں تھا۔

''صبوحی کہا کرو مجھے...... وہ بھی صبوحی کہا کرتا تھا''۔ وہ خلاؤں میں گھورنے لگی۔

''آپ اسے اتنا یاد کیوں کرتی ہیں......؟'' وہ ہر بات میں اس کے ذکر پر تھوڑا اچڑ کر بولی۔

''میں اسے بھولی کب ہوں''۔ وہ الٹا اس سے پوچھنے لگی۔

''مم...... میرا مطلب ہے آپ ان کا ذکر بہت کرتی ہیں''۔ وہ گڑبڑا کر بولی۔

''وہ ہے ہی اس لائق کہ میری زبان پر ہر وقت اس کا ذکر رہے وہ خود چلا گیا ہے لیکن اپنی خوشبو یہیں چھوڑ گیا ہے

دیکھو اس کی خوشبو کی مہک آ رہی ہے ناں......؟'' صبوحی نے چہرہ اوپر کر کے آنکھیں بند کر لیں ایک لمبا سانس لے کر جیسے وہ اس کی خوشبو کو اپنے اندر اتارنے لگی۔ شنو کو اس وقت وہ نیم پاگل لگی۔

''تمہیں آئی مہک......؟'' اس نے آنکھیں کھول کر شنو کی طرف دیکھا اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں بھی کتنی پگلی ہوں' یہ سوال میں تم سے کیسے کر سکتی ہوں......؟ اس کی مہک کی پہچان تو صرف میری سانسوں میں ہے''۔ وہ آپ ہی آپ ہنسنے لگی' اور اٹھ کر کھڑکی کی طرف چلی گئی۔

''وہ یہاں ہے...... ان رستوں میں اس کے پاؤں کی دھول ہے' ان ہواؤں میں اس کے خوشبو کی یادیں ہیں' اس کمرے میں اس کی باتوں کی آوازیں ہیں وہ میرے اندر بھی ہے اور باہر بھی' وہ ہر جگہ ہے ہر کہیں ہے' وہ ہنستا ہے تو میں اس کی ہنسی سنتی ہوں' وہ اداس ہوتا ہے تو میں اس کی تسلی بن جاتی ہوں وہ میرے ساتھ نہیں ہے لیکن وہ میرے پاس ہے' وہ میرے پاس ہی رہے گا' وہ میرا ہی ہے''۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور باتوں میں پاگل پن وہ عجیب تھی' عجیب باتیں کرتی تھی' جو شنو کی سمجھ سے باہر تھیں۔

''آپ بہت مشکل باتیں کرتی ہیں جی......؟'' شنو کے چہرے پر شدید الجھن تھی لیکن وہ ہنس دی۔

''تمہاری عمر کتنی ہے شنو......؟''

''پندرہ سال......''

''بڑی پیاری عمر ہے یہ' ایک دور سے دوسرے دور میں داخل ہونے والی عمر' بچپن کی آخری حدود اور جوانی کے آغاز کی عمر' اس عمر میں تتلیاں' پھول' بہاریں بارش خط اور محبتیں کتنی اچھی لگتی ہیں' ہیں ناں......؟ تمہیں بھی یہ سب اچھا لگتا ہے......؟'' صبوحی کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی جیسے وہ اپنی عمر سے نکل کر ماضی میں کہیں پہنچ گئی ہو۔

''مجھے تو جی اپنی دوستوں کے ساتھ گھومنا پھرنا اچھا لگتا ہے' پر اماں بہت پابندی لگاتی ہیں''۔ اس کی شکل دوبارہ لٹک گئی' آج جس طرح اماں اسے موئل کے گھر سے گھسیٹ کے لے کر آئی تھیں اس کا اسے بہت افسوس تھا کہ اب موئل اس کے بارے میں کیا سوچے گی اور شاید وہ تو اس کی شکل بھی نہیں دیکھے گی۔

''اچھا ہے' ماؤں کو ایسے ہی محتاط ہونا چاہئے''۔ اس نے بھی اماں کی سائیڈ لی تو وہ بددل سی ہوگئی۔

''بی بی جی! اب میں گھر جاؤں......؟ بہت دیر ہوگئی ہے''۔ وہ اٹھنے کے لئے پر تولنے لگی۔

''تم نے پھر مجھے بی بی جی کہا......؟'' صبوحی نے اس کی غلطی پکڑ لی تھی اس نے گردن جھکا لی۔

''صبوحی کہو مجھے......'' اس بار اس نے ڈپٹ کر کہا تھا۔

''مجھ سے نہیں کہا جائے گا''۔ وہ منمنائی۔

''کیوں میرے نام میں کانٹے لگے ہیں جو تمہاری زبان میں چبھیں گے؟ چلو بولو...... صبوحی......'' وہ جیسے ڈٹ گئی تھی اپنی بات پر' شنو کا دل چاہا رو دے۔

''کہو......'' اس نے پھر سختی سے کہا۔

''صب...... صبوحی......'' شنو کو آخر کہنا ہی پڑا۔

''ایسے لڑکھڑا کے نہیں۔ دوبارہ کہو''۔

''صبوحی......'' اس بار اس نے ٹھیک سے نام لیا تھا۔

''ویری گڈ...... اب آئندہ سے تم مجھے اسی نام سے پکارا کرو گی' ٹھیک ہے......؟'' اس کے پوچھنے پر شنو نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"چلواب تم جاسکتی ہو"۔ شنو نے سکون کا سانس لیا' اسے لگا جیسے قید سے رہائی مل گئی ہو۔

☆

"آج چاند کتنا صاف شفاف چمکتا ہوا روشنی اور زندگی سے بھرپور لگ رہا ہے بالکل اس کے چہرے کی طرح' لیکن میں جانتا ہوں زندگی اب اس میں مر چکی ہوگی' وہ صرف سانس لیتی ہوگی اور بس...... جینا تو اس نے میری جدائی میں ترک کر دیا ہوگا"۔ میرب اپنے دوست مہران کے ساتھ خالی سڑک کے کنارے بیٹھا ہوا تھا' رات کافی گہری ہو چکی تھی اس لئے روشنیاں بھی مدھم پڑ گئی تھیں ٹریفک کے نام پر اکا دکا گاڑی سڑک پر نظر آ رہی تھی۔

"کیا وہ اتنا چاہتی ہے تمہیں......؟" مہران نے ٹکٹکی باندھ کے اسے دیکھا۔

"اس کی چاہ کا کوئی پیمانہ نہیں' یوں سمجھ میں ہی اس کے لئے سب کچھ ہوں' میں نہیں ہوں تو اس کی زندگی میں کچھ نہیں"۔ صبوحی کے خوبصورت چہرے نے اس کی آنکھوں میں عکس پایا تو دل میں اداسیاں اتر آئیں۔

"اور تم......؟ کیا تمہارے دل میں اس کے لئے کوئی چاہ نہیں......؟" مہران کے سوال پر اس نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

"یہ تم نے کیسا سوال کر دیا......؟ بھلا بھنورے کو پھول سے عشق نہ ہوگا تو اور کس سے......؟ جیسے چکور چاند کے بنا ادھورا ہے ویسے ہی میں اس کے بنا ادھورا ہوں"۔ میرب نے جذب کی کیفیت میں کہا۔

"تو پھر تم اسے چھوڑ کے بھاگ کیوں آئے......؟ برسوں کی محبت کے بعد تم دونوں شادی کے بندھن میں بندھ تو گئے اور پھر شادی کی رات تم اپنی نئی نویلی دلہن کے پاس جانے کی بجائے اپنا دیس ہی چھوڑ کے آ گئے......؟ ایسا بھی کوئی کرتا ہے بھلا......؟" مہران نے اسے لتاڑا۔

"اتنا بڑا قدم اٹھانے کے پیچھے بھی ایک وجہ تھی مہران! تم نہیں سمجھو گے"۔ میرب کے سینے میں اضطراب اتر آیا۔

"اور اب اس کا کیا حال ہوگا......؟ تم تو اس کی نظر میں بے وفا بن گئے......؟" مہران تاسف سے کہہ رہا تھا۔

"میری وفاؤں پر اس کا یقین اتنا کچا نہیں ہے مہران! وہ آج بھی میری محبت میں اس عقیدت کے ساتھ میری واپسی کا انتظار کر رہی ہوگی"۔ وہ اتنے یقین سے کہہ رہا تھا جیسے اپنے بارے میں بات کر رہا ہو۔

"پھر واپسی کے بارے میں تمہارا کیا ارادہ ہے......؟" مہران کا اگلا سوال اسے پھر سے پریشان کر گیا۔

"ابھی نہیں...... ابھی میری ذات کو کچھ وقت چاہئے اس کے برابر کھڑا ہونے کے لئے' محبتیں امر ہو جاتی ہیں لیکن انا کی تسکین بہت مشکل ہے' اس کی شان اونچی ہے' اس کی اونچی حویلی ہے' اس کی اونچی حویلی نے میری انا میری خودداری کو چوٹ پہنچائی ہے' جب تک اس چوٹ کا اندمال نہیں ہوتا میں وہاں نہیں جا سکوں گی"۔

"کیسے آدمی ہو تم......؟ انا کو دل پر ترجیح دے رہے ہو' اپنی خند کو اپنے جذبوں سے بڑا سمجھ رہے ہو' ایک نام نہاد تسکین کی خاطر خود کو بھی آزما رہے ہو اور اسے بھی تڑپا رہے ہو۔ میرب! خود پر رحم کرو یار......" مہران کو اس پر غصہ آنے لگا تھا۔

"تم نہیں سمجھو گے میری کہانی کو"۔ مہران نے اس بار کچھ نہ کہا وہ خاموش رہا۔

"مہران......" کچھ دیر بعد اس نے مہران کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"مجھے نوکری ڈھونڈنی ہے"۔ میرب نے اپنے دل کی بات کہی تھی۔

"میرب! خدا کا واسطہ ہے واپس چلے جاؤ' سچے رشتے اور خالص محبتیں سب کو نہیں ملتیں' تم کیوں اپنی خوش نصیبی کو ٹھکرا کر کانٹوں کی راہ گزر پر چل رہے ہو......؟ یہ ڈگر تمہاری نہیں ہے ان کی بھول بھلیوں میں تم خود کو کہیں کھو دو گے"

اور تمہیں ایک بات بتا دوں میں...... منزلوں سے بھٹکے ہوئے انسان کو کہیں بھی سکون نہیں ملتا یار......" مہران اس کا مخلص دوست تھا اس لئے اکثر اس کے لئے پریشان ہو جاتا تھا۔

"تم میری فکر میں کیوں اتنے ہلکان ہو رہے ہو......؟ میں نے کہا ناں واپس لوٹنے کے لئے جب مجھے اپنے اندر سے آواز آئے گی تو چلا جاؤں گا' ابھی میرے قدموں کو بغاوت ہے' وہ اس سمت اٹھنے کے لئے راضی نہیں ہیں"۔ جانے بغاوت اس کے دل میں تھی یا دماغ میں؟ پر دل میں تو ہو ہی نہیں سکتی' کیونکہ جہاں محبتوں کا بسیرا ہوتا ہے وہاں دوسری چیز رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی پر اس کے دل کی کچھ خبر نہ تھی وہ محبتوں کو کہیں رکھ کے بھول گیا تھا' یا اپنے دل کو ہی کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔

☆

رات بہت تاریک تھی' آسمان پر اکا دکا ستارے نظر آ رہے تھے' چاند تو شاید بادلوں کی اوٹ میں تھا' شنو کے ذہن میں صبوحی کی باتیں گھوم رہی تھیں' اس کا انداز کتنا عجیب ہوتا تھا' وہ کس بارے میں کیا بات کرتی تھی کچھ سمجھ ہی نہیں آتا تھا' نہ وہ دکھی لگتی تھی' نا خوش' نا ہی وہ روتی تھی اگر ہنستی تھی تو اس کی ہنسی میں خوشی کی کھنک کی بجائے ایک خالی پن سا ہوتا تھا' وہ کیا چاہتی تھی کچھ کہتی بھی نہیں تھی۔ جو شخص اسے چھوڑ کے چلا گیا تھا اس پر کوئی الزام بھی نہ لگاتی تھی' نہ اس سے نفرت کرتی تھی' نہ برا بھلا کہتی تھی۔

"بہت عجیب ہے یہ صبوحی بھی......" وہ آسمان اور تاروں کو دیکھتے دیکھتے اسی کے بارے میں سوچتی رہی' پھر اچانک آسمان میں جیسے ہیولے سے بننے لگے اس نے ڈر کے چادر سر تک لے لی' وسائی اور پیرل اپنی اپنی چارپائیوں پر سو چکے تھے' بس ایک وہی تھی جو جاگ رہی تھی۔

"اماں نے کہا تھا صبوحی بہت باعلم لڑکی ہے' اس سے کچھ سیکھ' کچھ پڑھ"۔ وہ واقعی بہت باعلم ہے' بہت مشکل مشکل باتیں کرتی ہے' لیکن وہ مجھے کچھ سکھاتی تو نہیں"۔ اس کا ذہن الجھنے لگا۔

"نا بابا میں تو اس سے نہیں پڑھوں گی' وہ تو بہت پراسراری ہے' مجھے تو لگتا ہے اس پر کسی آسیب کا سایہ ہے جبھی تو وہ آپوں آپ زور سے ہنس دیتی ہے"۔ شنو کو جھرجھری آ گئی۔

ساری رات اس نے سوتے جاگتے گزار دی' ایک دو بار تو وہ نیند میں ڈر بھی گئی' آنکھ کھلی تو صبوحی کا اداس چہرہ نظر آیا' وہ جتنا اس نام کو اپنے ذہن سے نکالنا چاہتی تھی وہ اتنا ہی اس کے ذہن میں بیٹھتا جا رہا تھا' نجانے کب صبح ہوئی تو جیسے اس کے ذہن کو سکون سا مل گیا۔

"شنو......" ناشتے کے بعد وسائی نے اسے آواز دی۔

"جی اماں......" وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پاس آ گئی۔

"ذرا حویلی سے ہو کر آ جا"۔

"نہیں اماں! میں نہیں جاؤں گی"۔ اس نے فوراً انکار کر دیا۔

"کیوں وہاں کیا سانپ بیٹھے ہیں جو تمہیں ڈس لیں گے......؟" ہمیشہ کی طرح وسائی کا انداز ڈانٹنے والا تھا۔

"اری نیک بخت! منہ سے اچھا اچھا نکالا کرو' سانپ ڈسے میری بیٹی کے دشمنوں کو' پیار سے بات کرو گی تو ٹیکس نہیں لگ جائے گا تم پر"۔ پیرل نے اپنی بیوی کو ٹوکتے ہوئے کہا تو شنو کی جان میں جان آئی۔

"کبھی اپنی لاڈلی بیٹی کو بھی سمجھا لیا کر' حویلی جائے گی تو گھس نہیں جائے گی' کل جی جی صاحب نے خود کہہ بھیجا تھا کہ شنو کو روز حویلی بھیجا کر' یہ صبوحی کے پاس دو گھڑی بیٹھتی ہے تو اس کا [illegible] بہل جاتا ہے' قسمت کی بات ہے نازوں

پلی بیٹی یوں رل گئی' نہ جیتوں میں ہے نہ مردوں میں' پتہ نہیں کہاں کھوئی رہتی ہے''۔ وسائی نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''اماں! آپ کو بس حویلی والوں کی فکر رہتی ہے' ہوگی وہ نازوں سے پلی' مگر کیا میری کوئی قیمت نہیں......؟ میں بس ایویں ہی ہوں کیا کہ کوئی بھی مجھ سے دل بہلائے''۔ اس کی آنکھوں میں خوامخواہ آنسو آ گئے۔

''نا میرا پٹ! روتے نہیں ہیں''۔ پیرل نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

''مشکل گھڑیاں کسی پہ بھی آ سکتی ہیں اور انسان ہونے کے ناطے کسی دوسرے انسان کے کام آنا تو بہت اچھی بات ہے ناں' بیٹا پر اگر تیرا دل نہیں مانتا تو ٹھیک ہے مت جا حویلی''۔ پیرل نے اس کے من کی بات کی تو وہ خوشی سے کھل اٹھی۔

''میں سکینہ کے گھر سے ہو آؤں ابا......؟'' وہ فوراً خوش ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔ سکینہ اس کی پھوپھی کی بیٹی تھی۔

''سکینہ بھی صبوحی سے بہتر ہوگئی جو اس کے پاس خوشی خوشی جارہی ہو''۔ وسائی نے ناک بھوں چڑھائی' لیکن اسے اب کوئی فکر نہیں تھی کیونکہ پیرل اس کے ساتھ تھا۔

''تو جا پٹ! ہو کے آجا اپنی پھپھو کے گھر سے''۔ پیرل نے اسے خوشی خوشی جانے کی اجازت دی۔

''جوان بیٹی پر اتنی روک ٹوک اور ڈانٹ ڈپٹ اچھی نہیں ہوتی وسائی! پیار سے بات کیا کرو گی تو وہ تمہاری ہر بات مان لیا کرے گی''۔ شنو کے جانے کے بعد وہ رسان سے کہنے لگا۔ وسائی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

☆

شنو آج مریم کے گھر بیٹھی تھی' کیونکہ اس نے بڑی چاہ سے اسے اپنی گڑیا کی شادی میں بلایا تھا' وہ سکھی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی گانے گا رہی تھی پھر ان سب نے مل کر گڑیا کو تیار کیا کیونکہ کسی نے بتایا کہ سکینہ جس کے گڈے کے ساتھ مریم کی گڈی کا بیاہ ہونے والا تھا بہت جلد بارات لے کر پہنچنے والی ہے' ان سب نے پلیٹوں میں پھولوں کی پتیاں سجائیں اور بارات کے استقبال کے لئے کھڑی ہوگئیں۔ سکینہ اپنی سکھیوں کے ساتھ ایک پرات میں لال کپڑے کی سیج سجائے گڈے کو لے کر خراماں خراماں چلی آرہی تھی۔ شنو کو یہ سب دیکھ کر بہت اچھا لگا' اس کی بھی بہت خواہش تھی کہ وہ اپنی گڑیا کا بیاہ رچائے پر اماں کو یہ چونچلے پسند نہیں تھے وہ زندگی کو بس سنجیدہ اور عملی طریقے سے گزارنا چاہتی تھیں' ان کے نزدیک ایسے کھیل تماشوں کی کوئی وقعت نہیں تھی وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

''ارے شنو تم گڑیا کی طرف سے آئی ہوئی ہو......؟ ادھر میں تمہارا انتظار ہی کرتی رہی''۔ سکینہ کی اس پر نظر پڑی تو فوراً شکوہ کر بیٹھی۔

''ارے تیری طرف تو میں روز آتی ہوں' مریم کے ہاں تو پہلی بار آنا ہوا ہے سو میں نے سوچا بارات کی واپسی کے ساتھ تیرے گھر بھی چلی جاؤں گی''۔ اس نے سکینہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

کچھ دیر بعد مریم کی بہنوں نے بارات کے ساتھ آئی لڑکیوں کو کھانا پیش کیا تو سکینہ عش عش کر اٹھی۔

''ارے واہ مریم کھانا تو تم نے بہت اچھا دیا ہے بارات کو''۔ مٹر اور آلوؤں میں گرم گرم پلاؤ کی خوشبو سب کی بھوک کو چمکانے لگی۔ سب نے خوب پیٹ بھر بھر کے پلاؤ کھایا۔

''چلو بھئی چلو اب جلدی سے رسومات کرو ہمیں واپس بھی جانا ہے''۔ سکینہ کے کہنے پر رسومات کی ادائیگی کے لئے سیج بچھائی گئی' اس خوبصورت سیج پر گڈے اور گڈی کو آمنے سامنے بٹھا کر بیچ میں تکیہ رکھا گیا اور پھر دونوں کو لاداں دی گئیں ایک رسم جس میں دولہا دولہن کی آپس میں ٹکریں کروائی جاتی ہیں' سب نے تالیاں بجائیں' مبارک بادوں کے تبادلے ہوئے' رسومات کے بعد رخصتی کی باری آئی تو بے اختیار سب کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں مریم دھاڑیں مار

مار کے رو رہی تھی سب سکھیوں نے اسے گلے سے لگایا اور تسلی دی۔

''میری گڑیا کو بہت سکھی رکھنا' میں ہر روز اپنی گڑیا کو دیکھنے آیا کروں گی' اگر تم نے کوئی روک ٹوک یا پابندی لگائی ناں تو اچھا نہیں ہوگا''۔ مریم آنسوؤں کے سنگ سکینہ سے وعدے لے رہی تھی۔

''تم فکر مت کرو' میں تمہاری گڑیا کو بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح رکھوں گی' یہ مجھے ویسے ہی عزیز ہوگی جیسے میری اپنی گڑیا ہیں' اب تم رونا بند کرو اور اپنی گڑیا کو الوداع کرو''۔ سکینہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے گلے سے لگایا تو وہ اور زور و شور سے رونے لگی' ایک آخری بار اس نے اپنی گڑیا کو پیار کر کے اسے پرات میں گڈے کے ساتھ بٹھا دیا۔ بارات ناچتے گاتے واپس جانے لگی۔ شام کے پانچ بج گئے تھے' شنو کو اچانک اماں کا خیال آیا۔

''سکینہ! میں تمہارے گھر بعد میں آؤں گی' ابھی بہت دیر ہوگئی ہے' اماں پریشان ہو رہی ہوں گی''۔ سکینہ کے کان میں کہہ کر وہ جلدی سے راستے میں ہی اپنے گھر کی طرف مڑ گئی۔

دوپٹے کو ٹھیک کرتے ہوئے وہ تیز تیز قدم اٹھاتی گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ابھی آدھا راستہ ہی پار ہوا تھا کہ تندور والی ماسی نوراں کے گھر کے باہر اسے کسی نے پیچھے سے پکار لیا۔

''سنو لڑکی......'' اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کالی شلوار قمیض میں وہ بیس بائیس سال کا لڑکا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''بدتمیز......'' وہ منہ بنا کے بولی اور واپس تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

''یہ لو لڑکی......'' اس کے ہاتھ میں کچھ تھا جو وہ اسے دینا چاہتا تھا شنو نے ہلکا سا مڑ کے دیکھا وہ اس کے پیچھے ہی آرہا تھا۔ ایک اجنبی کو اپنے تعاقب میں آتا دیکھ کر اس کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا' وہ تیز تیز بھاگنے لگی' وہ بھی اس کے پیچھے بھاگتا آرہا تھا' شنو نے اپنی رفتار بڑھالی اور گلیوں میں گھس گئی' اب اس کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ دروازے پر کنڈی چڑھا کے وہ مٹکے کی طرف آئی' غٹاغٹ ایک گلاس پانی ایک ہی سانس میں ختم کیا۔

''لڑکی! کوئی ہوش بھی ہے تمہیں......؟ دوپہر کی نکلی ہوئی ہو اور شام ڈھلے گھر واپس آئی ہو' یہ بچپنا کب ختم ہوگا تمہارا......؟ بھلا بتاؤ یہ بھی کوئی عمر ہے گڑیاؤں سے کھیلنے کی''۔ وسائی کی ڈانٹ شروع ہوگئی تھی اس نے سہم کے ادھر ادھر دیکھا اور شکر کا سانس پڑھا کہ وہ لڑکا اس کا پیچھا کرتے ہوئے گھر تک نہیں آیا تھا۔

☆

''پھول' بہاریں' رنگ' موسم' ہوا' بادل' خوشبو' آبشار سب تمہارے نام ہیں تم ان میں بستی ہو اور یہ سب تم میں بستے ہیں' محبت نے کل رات خود مجھ سے کہا کہ اس کا نام صبوحی ہے' تم دن کی پہلی کرن اور بارشوں کی پہلی بوند ہو' مجھے مکمل کر کے پھر روشنی دیتی ہو''۔ جھیل کنارے میرب نے اس کا ہاتھ تھاما تھا' صبوحی کا وجود اس محبت میں پور پور ڈوبنے لگا۔

''محبت کا جنم بھی تو تمہارے دل سے شروع ہوتا ہے میرب! اور تمہاری آنکھوں سے گزر کر میرے دل تک پہنچتا ہے''۔ وہ دور جھیل کے پانیوں میں دیکھ رہی تھی۔

''صبوحی! مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ اگر تم نہ ہوتی تو عشق کتنا نامکمل سا ہوتا''۔ میرب کی بات پر وہ ہنس دی۔

''میں نہ ہوتی تو کوئی اور ہوتی میرب! محبت ایک سی ہی ہوتی ہے' بس اس کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں''۔ اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا تھا۔

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو' محبت کا تعلق تو دل سے ہے اور یہ دل تو کسی پر بھی آ سکتا ہے' اب اس کا دل کا تعلق صرف تم سے ہے صبوحی...... اب اس تعلق کو صرف نباہ سے چاہ ہے' اب تم نہیں تو کچھ بھی نہیں''۔ میرب نے پوری

گمبھیرتا سے کہا تھا۔

''تعلق ٹوٹ جائیں تو کیا محبت باقی نہیں رہتی......؟'' صبوحی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اس کے چہرے پر جمائیں۔

''نہیں صبوحی! محبت کی بقاء کے لئے تعلق شرط نہیں' مگر ہاں جب تعلقات میں دوریاں جگہ بنا لیتی ہیں تو پھر محبتوں کی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے''۔ وہ پتہ نہیں کس خیال کے تحت کہہ رہا تھا۔

''اگر تم مجھ سے دور چلے گئے تو......؟'' صبوحی کے سوال پر میرب تڑپ اٹھا۔

''صبوحی کا میرب ہمیشہ صبوحی کے پاس رہے گا' وہ اسے کبھی بھی چھوڑ کے نہ جائے گا''۔ یکلخت جیسے خواب سا ٹوٹا تھا' صبوحی آنکھیں کھول کر پلنگ پر بیٹھ گئی' اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور لب تھرتھرا رہے تھے۔ اس نے کوئی خواب نہ دیکھا تھا' ہاں وہ خواب نہیں تھا' وہ تو اس کی یادوں کا ایک ٹکڑا تھا' جو اس کے ذہن کی اسکرین پر عود آیا تھا۔

''میرب! تمہیں تو دوریوں سے بہت ڈر لگتا تھا' تم تو ادھورے تعلقات کے بہت خلاف ہوا کرتے تھے' پھر کیا ہوا تمہیں......؟ کیوں چلے گئے......؟ تم نے تو اپنے حجلہ عروسی میں جھانکا تک نہیں' کہ تمہاری محبت سراپا تمہارا انتظار کر رہی تھی' ایسی کون سی بات تھی' جس نے تمہیں یہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کیا؟ کیا مجھ سے کوئی خطا ہو گئی تھی......؟ تم ایک بار مجھے میری خطا بتا تو دیتے' میں ہنس کر تمہیں خود جانے کی اجازت دے دیتی''۔ اس پر پھر سے وحشت طاری ہونے لگی وہ اٹھ کر الماری تک آئی۔

''یہ دیکھو یہ سوکھے گلاب ہیں' جنہوں نے ہمارا ملن دیکھا ہی نہیں' ان کی آنکھوں نے بس میرے آنسو اور میرا انتظار دیکھا اور پھر یہ مرجھا گئے' مگر میں نے ان مرجھائی پتیوں کو اٹھا کر پھینک نہ دیا بلکہ گواہ بنا کر محفوظ کر لیا' یہ تمہیں بتائیں گے میرب! کہ اس رات میں کتنے آنسوؤں سے روئی تھی''۔ وہ کرسی پر ڈھے سی گئی۔



شنو کے دل میں اس اجنبی نوجوان کا ایسا خوف بیٹھا کہ صبح وہ گھر سے باہر ہی نہ نکلی۔

''ادھر آ چھوری! ذرا اپنا کان دکھا''۔ صبح کے تقریباً دس بجے وسائی نے اسے گھور کے دیکھتے ہوئے اپنے پاس بلایا' وہ گھبرا کر ان کے پاس آئی' اماں نے جن نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا وہ اسے بری طرح سہما گئی تھیں۔

''ہائے ربا! یہ سونے کی ایک بالی کہاں گرا دی......؟'' وسائی نے اپنے گھٹنے پیٹ کے کہا تو بے اختیار اس کے ہاتھ اپنے کانوں کی طرف چلے گئے۔

''ابھی پچھلے سال ہی تو پیسے جوڑ جوڑ کر تجھے بالیاں ڈالی تھیں' جا جلدی بھاگ' مریم کے گھر دیکھ آ' کل کے ہنگامے میں ادھر ہی کہیں گرا دی ہو گی''۔ شنو حواس باختہ ہو کر دروازے کی طرف دوڑی' مگر راستے میں اسے پھر سے وہی نوجوان لڑکا مل گیا۔

''تمہاری بالی گر گئی تھی کل' میں وہی دینے کے لئے تمہارے پیچھے بھاگا تھا''۔ اس سے پہلے کہ وہ اس نوجوان کو دیکھ کر پھر سے بھاگنا شروع کرتی وہ اس کے راستے میں آ کر جلدی سے بولا۔ اس کی ہتھیلی پر اپنی سونے کی بالی دیکھ کر جیسے اس کی جان میں جان آئی۔

''تم نے تو مجھے دیکھ کر ایسے دوڑ لگائی تھی جیسے میرے سر پر سینگ دیکھ لئے ہوں''۔ وہ اس بار پوری قوت سے قہقہہ لگا کر ہنس دیا' شنو کو عجیب خفت کا احساس ہوا' اسے لگا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔

''زیادہ دانت نکالنے کی ضرورت نہیں ہے' میری مرضی میں آرام سے چلوں یا بھاگ کے''۔ اپنی خفت مٹانے کو وہ

ذرا ترش لہجے میں بولی' جس پر اجنبی نے اسے سر سے لے کر پیر تک بڑی دلچسپ نگاہوں سے دیکھا' شنو اپنے وجود میں سمٹ کے رہ گئی' آج سے پہلے کسی نے اسے اس طرح نہیں دیکھا تھا۔

''ہاں بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے' تمہاری مرضی ہے چاہے کچھ بھی کرو' تمہیں تو ویسے بھی چلنے پھرنے گھر گھر گھومنے کا بہت شوق ہے''۔ اس اجنبی لڑکے کا طنز اس کے تن بدن میں آگ لگا گیا' آج سے پہلے اماں نے بھی اسے بارہا ٹوکا تھا' مگر اتنا شدید غصہ اسے کبھی نہ آیا تھا' بالی اس کے ہاتھ سے چھین کر وہ تقریباً بھاگتی ہوئی وہاں سے مڑی۔ اجنبی کی دل جلانے والی ہنسی بہت دور تک اس کا پیچھا کرتی رہی۔



وہ دو کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا' جو کسی کے لئے اس کی کل دنیا تھی اور کسی کے لئے محض ایک خواب۔ غریب ایمان دار ماسٹر کے بیٹے اس کے خالہ زاد اور محبوب شوہر میرب کا گھر تھا۔ میرب کو اپنے اس چھوٹے سے گھر سے بہت پیار تھا۔ وہ اس گھر میں صبوحی کے ساتھ اپنی کل دنیا بسانا چاہتا تھا' وہ کہتا تھا۔

''صبوحی! تمہیں دینے کے لئے صرف یہ ایک چھوٹا سا مکان ہے اور چند ہزار کی نوکری' کیا تم اس میں گزارا کر لو گی......؟''

''میرب! میں تمہارے ساتھ کانٹوں بھری راہ گزر پر سفر بھی کر سکتی ہوں بس تمہارا ساتھ اور پیار ہونا چاہئے''۔ وہ کتنے پیار سے اقرار وفا کرتی تھی' جس پر میرب کا دل خوشی سے جھوم اٹھتا تھا۔ وہ ماسٹر کا بیٹا تھا' حویلی اور وڈیروں سے رشتے داری ہونے کے باوجود اس کا باپ اتنا خود دار تھا کہ ساری زندگی سفید پوشی میں گزار دی' میرب کی ماں وڈیرے اللہ نواز کی بیوی جی جی صاحب کی بہن تھیں' دونوں بہنوں کی زندگی اور حالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک نوٹوں میں کھیلتی تھیں اور دوسری محض چند روپوں میں گزارا کرتی تھیں' مگر صابر و شاکر اتنی کہ کبھی بھی بہن پہ رشک نہ کیا' حالانکہ جی جی صاحب نے کتنی ہی مرتبہ اس کی مدد کرنی چاہی کیونکہ پیسے اور اناج کی ان کے ہاں کمی نہیں تھی مگر وہ خود دار اتنی تھیں کہ دال روٹی پر تو گزارا کر لیتیں مگر ان سے کچھ بھی لینا گوارا نہ کرتیں' اپنے ماں باپ کی طرف سے یہ وصف میرب کے حصے میں بھی آیا تھا۔

یہاں تک کہ ماں باپ کی وفات کے بعد بھی اس نے جی جی صاحب کے بے حد اصرار کو ٹھکرا کر اپنے اس چھوٹے سے مکان میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔

''بیٹا میرب! تم کوئی پرائے نہیں ہو' میرے اپنے بھانجے ہو' اور پھر صبوحی بچپن سے تم سے منسوب بھی ہے' اس ناطے سے تم اس گھر کے بیٹے ہی ہو' جب تک تمہارے ماں باپ حیات تھے تب تک میں نے تمہیں کبھی بھی نہ کہا تھا کہ حویلی آ کر رہو' مگر اب تمہارے والدین بھی اس دنیا میں نہیں ہیں پھر اس چھوٹے سے گھر میں تمہارا اکیلے رہنا ٹھیک نہیں ہے''۔ جی جی صاحب نے اسے اپنے پاس بٹھا کر پیار سے سمجھایا تھا۔

''جی جی! اپنے حساب سے آپ کی بات بھی ٹھیک ہے لیکن میں اپنے گھر کو نہیں چھوڑ سکتا' اس گھر میں میرے ماں باپ کی خوشبو ہے' میں اس خوشبو سے دور ہو گیا تو خوش نہیں رہ پاؤں گا' دوسری بات یہ کہ حویلی میں آپ اور صبوحی اکیلی رہتی ہیں' ماسٹر (خالو) بھی اب حیات نہیں ہیں اور پھر صبوحی میری منگ بھی ہے تو پھر کیا لوگ باتیں نہیں بنائیں گے......؟'' اس نے سہولت سے انکار کر دیا تھا' جس پر جی جی صاحب دل مسوس کر رہ گئیں۔ صبوحی وڈیرے اللہ نواز اور جی جی صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی' جتنا جی جی صاحب اس سے پیار کرتی تھیں اتنی ہی وہ وڈیرے صاحب کو بھی عزیز تھی۔

وہ کوئی ظالم و جابر قسم کے وڈیرے نہیں تھے اور نا ہی ان میں سیاسی سازشوں کے جراثیم تھے ان کے گوٹھ کا ہر فرد آزاد تھا سب کو اختیار تھا کہ وہ اپنی زندگیوں کے فیصلے خود کریں۔ وہ جاگیردارانہ خیالات کے مالک نہیں تھے اور نا ہی ان کی کوئی رعایا تھی بے پناہ جائیداد اور زمینوں کے مالک ہونے کے باوجود درویش صفت انسان تھے یہی وجہ تھی کہ بیٹا نہ ہونے کے باوجود انہوں نے دوسری شادی نہیں کی تھی وہ صبوحی سے بہت پیار کرتے تھے اور اس کی خوشیوں کا بے حد خیال بھی یہی وجہ تھی کہ زمانہ طالب علمی میں ہی انہوں نے صبوحی کا نکاح میرب سے کر دیا تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ ان کی پیاری سی بیٹی کی خوشیاں اسی انسان سے وابستہ ہیں وہ کوششیں کرتے تھے کہ ان کی بیٹی کی ہر جائز خواہش پوری ہو شہر جا کے پڑھنا بھی صبوحی کی انہی خواہشوں میں سے ایک خواہش تھی ورنہ اس سے پہلے ان کے خاندان میں کوئی لڑکی اتنا زیادہ نہیں پڑھی تھی اور پھر میرب خود بھی بہت روشن خیال تھا اس کی خواہش تھی کہ اس کی ہونے والی بیوی پڑھی لکھی ہو وہ دونوں ایک ساتھ ہی ایک ہی کالج اور یونیورسٹی سے پڑھے یہی وہ دن تھے جب ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت کی پرورش شروع ہوئی وہ محبت جو لازوال اور ان مٹ تھی اور جدائی کے بعد بھی سانس لے رہی تھی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان کی شادی طے ہوئی تب آخری بار وہ اسے اس گھر میں لے آیا تھا۔

''یہ گھر ایک خالی مکان ہے صبوحی! تم اسے اپنے پیار سے یوں آباد کرو گی جیسے میرے دل کو کیا ہے''۔ آج سے پہلے وہ کئی مرتبہ اس گھر میں آئی تھی مگر یہ پہلی بار تھا کہ میرب نے یوں سب کچھ اسے سونپ دیا تھا صبوحی شرما گئی۔

''جاؤ میرے لئے ایک کپ چائے بنا دو''۔ میرب نے اتنے پیار سے کہا تو وہ دوڑ کے کچن میں آ گئی اور اس کے لئے چائے بنانے لگی۔ مگر اب تو یہ کمرے بھی ویران تھے اور کچن میں بھی کچھ نہ تھا صرف خیال دوڑتے تھے اور یادیں سرسراتی تھیں اس نے کمرے کی صفائی کر کے ہر چیز کو اس کی جگہ پر سیٹ کیا۔

''میرب! تم ایک بار آ جاؤ پھر دیکھو ہم کیسے اس خالی مکان کو اپنی محبت سے آباد کرتے ہیں''۔ صبوحی کا دل میرب کو پکارنے لگا۔



آج شنو کو پتہ نہیں کیا ہوا وہ اٹھ کے صبوحی کے پاس آ گئی۔

''بہت دنوں بعد آئی ہو کیا ناراض تھی؟'' اس پر نظر پڑتے ہی صبوحی کے لبوں سے بے اختیار شکوہ خارج ہوا۔

''نن...... نہیں تو......'' اس کی زبان لڑکھڑا گئی اسے توقع نہیں تھی کہ صبوحی اس سے شکوہ کرے گی وہ آنکھیں جھکا کر اس کے سامنے آ بیٹھی۔

''وہ اماں نے کہا تھا آپ بہت پڑھی لکھی ہیں باعلم اور باشعور لڑکی ہیں انہوں نے کہا کہ میں آپ سے کچھ سیکھوں''۔ اس نے ٹھہر ٹھہر کے کہا تو صبوحی اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

''کیا سکھاؤں تمہیں......؟ میں نے اتنا کچھ سیکھ کے پھر بھی سب کچھ گنوا دیا''۔ وہ اپنے آپ سے بولی۔ شنو نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا آج وہ کھوئی کھوئی اور ٹوٹی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

''تم اسکول کیوں نہیں جاتیں......؟'' صبوحی نے اچانک سوال کیا۔

''جب اسکول جانے کی عمر تھی تب مجھ پر سستی چھائی رہتی تھی ادھر ادھر آوارہ گردیاں کر کے میں نے اسکول جانے کی عمر گنوا دی''۔ اسے جیسے آج اس بات کا احساس ہوا تھا۔

''چل کوئی بات نہیں آ جا میں تمہیں قاعدہ پڑھاتی ہوں لاؤ وہ سلیٹ اٹھاؤ ذرا''۔ صبوحی نے بک شیلف کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک کونے میں سلیٹ رکھی تھی۔ شنو نے سلیٹ کو سیدھا کیا اور اس پر چاک سے کچھ لکھا ہوا تھا۔

''م سے میرب م سے محبت م سے میرا ٹوٹا دل''۔ اس کے ہونٹوں نے تحریر کو پڑھا اور پھر وہ کھو گئی۔

''آپ نے اپنا قاعدہ م سے کیوں شروع کیا ہے؟ باقی سب تو الف اللہ سے شروع کرتے ہیں''۔ شنو کی بات شاید اس نے سنی ہی نہیں وہ پھر سے پتہ نہیں کہاں کھو گئی تھی۔

''صبوحی...... صبوحی کہاں کھو گئیں؟'' شنو نے ڈرتے ڈرتے اس کا بازو ہلایا۔

''کچھ نہیں''۔ وہ گہری نیند سے جاگی اور چپ ہو گئی۔

''آپ قاعدہ پڑھانے والی تھیں مجھے''۔ شنو نے یاد دلایا۔

''نہیں آج نہیں''۔ اس کا موڈ بدل چکا تھا شنو کی شکل لٹک گئی۔

''تم قاعدے کو ایک طرف رکھ دو قاعدے پڑھ کے کچھ نہیں ملتا''۔ یکایک جیسے اسے بیزاریت سی ہونے لگی اور وہ اٹھ کر باہر کی طرف جانے لگی۔

''تم کل آؤ گی ناں شنو......؟'' پیچھے سے اسے صبوحی کی آواز سنائی دی لیکن وہ جواب دیئے بغیر ہی مڑ گئی۔ راستے میں اسے پھر سے وہی نوجوان ملا وہ اس بار خاموش تھا اس سے کوئی بات بھی نہ کی لیکن اس کی آنکھیں بول رہی تھیں وہ ڈرتے ڈرتے اس کے سامنے سے گزری مبادا وہ پھر سے نہ اس پر ہنسنا شروع کر دے لیکن اس نے ایسا کچھ نہ کیا بس اسے دیکھتا رہا دور تک۔



صبوحی کو اپنے گھر میں دیکھ کر شنو کو بڑی حیرانگی ہوئی۔

''آپ یہاں......؟'' شنو کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''کیا سر جھاڑ منہ پھاڑ کھڑی ہے بے وقوف! چل صندوق سے کوئی اچھی رلی نکال لے آ چار پائی پہ بچھا دیکھ نہیں رہی صبوحی بی بی آئی ہیں ہمارے گھر''۔ وسائی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنی پلکیں بچھا کر صبوحی کا استقبال کرتی۔

''تکلیف مت کریں میں تو صرف شنو سے ملنے آئی ہوں''۔ صبوحی بان کی چار پائی کے ایک کنارے ٹک گئی وہ کالی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ زرد چہرہ زرد آنکھیں لاچار و لاغر سا وجود۔

''دیکھ شنو! تیری کتنی عزت ہے بی بی جی کو تم کتنی عزیز ہو کہ وہ بذات خود تم سے ملنے کے لئے چلی آئی ہیں اور ایک تم ہو ناشکری حویلی کا نام لو تو منہ پر بارہ بجنے لگتے ہیں''۔ وسائی کی عادت تھی وہ اپنے پرائے کی موجودگی کا لحاظ کئے بغیر اسے بے عزت کر کے رکھ دیتی تھی۔

''شنو کو مت ڈانٹیں یہ تو بچی ہے ناسمجھی میں تو اکثر غلطیاں ہی ہو جاتی ہیں''۔ صبوحی نے شنو کی طرف داری کی تو وسائی چپ ہو گئی۔

''شنو! میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں کل میں نے خوامخواہ ہی تمہیں ناراض کر دیا تھا ناں''۔ وہ اب شنو کا ہاتھ پکڑ کر بولی اس کا زرد ہاتھ بہت گرم ہو رہا تھا شنو کو یاد آیا ایک دفعہ ابا نے اسے بتایا تھا گرم ہاتھ باوفا لوگوں کی نشانی ہوا کرتے ہیں وہ بھی تو کتنی باوفا تھی ایک میرب ہی بے مروت تھا جو اسے سمجھ نہ سکا اور اسے چھوڑ کے چلا گیا۔

''آپ مجھ سے معافی مت مانگیں صبوحی جی...... آپ مجھ سے بڑی ہیں''۔ شنو کو حقیقتاً بہت شرمندگی ہو رہی تھی کہاں صبوحی اور کہاں وہ معافی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''بی بی جی! آپ کیوں ہمیں شرمندہ کر رہی ہیں یہ تو ہے ہی پگلی اسے تھوڑی ناں پتہ ہے کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا اس کی باتوں کو دل پر مت لیا کریں''۔ وسائی نے اس کی طرف سے وضاحت دی تو صبوحی بھی چپ ہو گئی۔

''آپ بیٹھیں جی! میں آپ کے لئے چائے ناشتہ لے کر آتی ہوں''۔ وسائی باہر کی طرف جانے لگی لیکن اس وقت صبوحی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے میں بس چلتی ہوں''۔ وہ جاتے جاتے شنو کی طرف مڑی۔

''تم کوئی بات دل میں مت رکھنا اور ہو سکے تو حویلی آتی رہنا' پتہ نہیں کیوں تم ہوتی ہو تو تھوڑی دیر کے لئے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے''۔ صبوحی کالی چادر لپیٹ کر گھر چلی گئی اب وسائی نے اسے جا پکڑا۔

''کیوں ری! اتنے نخرے کاہے کو؟ وہ زمیندار لوگ ہیں تو کیا چاہتی ہے وہ تیرے پیر پکڑیں' تجھ سے معافیاں مانگیں؟'' وسائی کے حملے نے اسے سہما دیا۔

''نہیں اماں! میں بھلا ایسا کیوں چاہوں گی' وہ تو صبوحی کو ہی غلط فہمی ہو گئی تھی' میں بھلا اس سے کیوں ناراض ہوں گی''۔ شنو منمنا کر بولی۔

''دیکھ وہ زمیندار لوگ ہیں' بڑے لوگ ہیں ان سے مقابلے بازی کی ہماری حیثیت نہیں ہے' یہ بھی ان کی کرم نوازی ہے کہ بی بی جی کو تم سے اتنا لگاؤ ہے ورنہ......'' وسائی کا لیکچر شروع ہو گیا تھا شنو کا دل چاہا کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے۔

☆

''کہاں گئی تھی صبوحی......؟'' جی جی صاحب نے اسے دیکھ لیا تھا' وہ چپ ہو گئی اس کی نگاہیں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔

''صبوحی! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں بیٹا؟ صبح ہی صبح اٹھ کے کہاں چلی گئی تھیں......؟'' جی جی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''شنو کے گھر''۔ اس نے مختصر جواب دیا۔

جی جی صاحب کو سن کر بہت اچھا لگا' صبوحی کی زندگی میں جو ایک جمود چھایا ہوا تھا' اس میں کہیں نہ کہیں دراڑ پڑ رہی تھی یہ دراڑ شنو تھی' جو اس کے پاگل پن کو زندگی کی طرف موڑ رہی تھی۔

''بہت اچھا کیا پتر! کبھی کبھار ادھر چلی جایا کرو' من بہل جایا کرے گا تمہارا''۔ جی جی صاحب نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''من تو میں میرب کو سونپ چکی ہوں جی جی! پھر اس کے بہلاوے کا سامان کیونکر کروں''۔ اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔

''میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں''۔ اس نے جی جی صاحب سے نظریں چرا کر کہا اور اپنے قدم کمرے کی اور بڑھا دیئے۔

''آہ...... میری ابھاگن بیٹی...... سہاگن ہو کر بھی کیسی اجڑی اجڑی پھرتی ہو''۔ جی جی صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

''جی جی خود کو سنبھالو''۔ خیراں نے آگے بڑھ کر ان کو تھام لیا۔

''میری بیٹی کا کیا قصور تھا؟ قصور تو میرا تھا پھر سزا وہ کیوں بھگت رہی ہے' اس نے تو سچے دل سے میرب کو اپنایا تھا' اس کے من میں تو کوئی میل نہیں' پھر بھی وہ خالی ہاتھ رہ گئی''۔ جی جی صاحب کی پشیمانی حد سے سوا ہونے لگی' خیراں تاسف سے سر ہلانے لگی۔

''آپ پریشان نہ ہوں جی جی! اس بات پر بعد میں بھی سوچا جا سکتا ہے' ابھی آپ چلیں میں آپ کو کمرے میں

لے جاتی ہوں''۔ خیراں انہیں کمرے میں لے آئی۔

''خیراں! بتی بجھا دو''۔ انہوں نے پلنگ پر لیٹ کر آنکھوں پر بازو رکھ لئے خیراں نے مڑ کر کچھ حیرت سے ان کی طرف دیکھا' جی جی صاحب کبھی بے وقت نہیں سویا کرتی تھیں پھر آج یہ فرمائش کیوں؟ وہ کچھ پریشان ہو گئی۔

''جی جی صاحب! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' وہ تشویش میں مبتلا ہو گئی۔

''آپ کہیں تو پاؤں دبا دوں آپ کے......؟'' وہ فکر مند لہجے میں پوچھنے لگی۔ اصل میں اسے جی جی صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی' ایسی حالت میں وہ انہیں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی' کسی بہانے کسی جواز کے پیش نظر وہ ان کے پاس ہی ٹھہرنا چاہتی تھی۔

''خیراں! تم جاؤ' میری طبیعت ٹھیک ہے' بس ذرا دل پر کچھ بوجھ ہے سو تنہائی سے بانٹنا چاہتی ہوں''۔ پتہ نہیں کیوں ان کی آواز نم ہو گئی' اس نمی کو خیراں نے بھی محسوس کیا اور وہ سمجھ گئی کہ بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں جب انسان خود سے بھی آنکھیں نہیں ملا پاتا' یہ لمحے پچھتاوے کے ہوتے ہیں' وہ بتی بجھا کر ان کے کمرے سے نکل گئی' جی جی صاحب کی آنکھوں میں وہ منظر دھندلانے لگا جب حویلی کی اونچی فصیلوں کے اندر ان کی اکلوتی بیٹی کی شادی کی شہنائیاں گونج رہی تھیں اس دن تمام گاؤں والوں کو کھانا کھلایا گیا تھا' کچھ غریب بچوں میں کپڑے تقسیم کیے گئے تھے' کیونکہ وڈیرے صاحب کی بھی یہی خواہش تھی کہ ان کی بیٹی کی شادی دھوم دھام سے ہو' اب جبکہ وہ حیات نہیں تھے تو ان کی خواہش کا احترام جی جی صاحب پر فرض ہو گیا تھا' حویلی کی اکلوتی بیٹی کی شادی کی اطلاع نجانے پاس والے گاؤں کی میراثنوں کو کیسے ہو گئی تھی کہ سر شام آ کر انہوں نے حویلی کے آنگن میں دھرنا دیا تھا' حالانکہ جی جی صاحب نے منع بھی کیا تھا کہ ان کے ہاں ایسا کوئی رواج نہیں مگر انہوں نے کسی کی نہیں سنی تھی۔ اور کہا تھا کہ زمیندار صاحب نے ان کا بہت خیال رکھا تھا برے وقت میں ساتھ دیا تھا' کچھ سال قبل جب ان کے ہاں شدید قحط سالی کا عذاب نازل ہوا تھا وہ زمیندار صاحب ہی تھے جنہوں نے ان کے لئے اناج بھیجا تھا' ان پر زمیندار صاحب کے احسانات کا قرض تھا' جنہیں وہ عقیدت و محبت کے ساتھ اپنے طریقے سے لوٹا رہی تھیں۔ جی جی صاحب خاموش ہو گئیں یوں بھی اپنی زندگی میں انہوں نے نہ کسی کو جھڑکا تھا نہ ترش لہجے میں بات کی تھی پھر یہ تو محبت کا اظہار تھا' جس کا جواب انہیں محبت سے ہی دینا تھا' صبوحی اور میرب کا نکاح تو پہلے سے ہی تھا اب صرف رخصتی کے فرائض سے سبکدوش ہونا تھا۔

جی جی صاحب کا دل غم سے بھر گیا تھا' وہ بیٹی جو بچپن سے عیش و عشرت اور آسائشات کے سائے میں پل کر بڑی ہوئی تھی اسے دو کمروں کے مکان میں وہ کیسے بھیج دیتیں' نہ جہاں سہولتیں تھیں نہ نوکر نہ چاکر نہ کوئی خدمت گار' آج تک تو اس نے اٹھ کر پانی نہ پیا تھا' پھر میرب کے گھر جا کر وہ تمام ضروریات زندگی کے کام کیسے انجام دے گی جبکہ میرب کے ہاں آسائش نام کی کوئی چیز نہ تھی کپڑے دھونے کے لئے واشنگ مشین نہ تھی نہ گیس والا سلنڈر تھا' جی جی صاحب جب سوچتیں کہ ان کی نازوں پلی بیٹی لکڑیاں جلا کر کھانا بنائے گی اور ہاتھ سے رگڑ رگڑ کر کپڑے دھوئے گی تو ان کے دل پر چھریاں سی چلنے لگتیں' میرب جیسے خوددار انسان نے جہیز لینے سے بھی انکار کر دیا تھا ورنہ وہ اپنے وسائل استعمال کر کے میرب کے گھر کو جدید سہولیات سے آراستہ ہی کر دیتیں وہ سخت شش و پنج میں تھیں ایسی ہی گومگو کیفیت میں انہوں نے رخصتی سے دو گھنٹے قبل خیراں کو بھیج کر میرب کو بلوا لیا۔

''خیریت تو ہے جی جی صاحب! آپ نے مجھے اتنی ایمرجنسی میں کیوں بلوایا......؟'' وہ پریشان تھا جی جی صاحب اسے اپنے کمرے میں لے آئی تھیں۔

''مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے میرب! اسی مقصد سے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے''۔ جی جی صاحب کرسی

پر بیٹھ گئیں میرب کچھ نہ سمجھ سکا۔

"دیکھو میرب! صبوحی میری اکلوتی بیٹی ہے' اس کی خوشیاں مجھے بے حد عزیز ہیں' اسے کوئی تکلیف ہو یہ میں برداشت نہیں کر سکتی"۔ انہوں نے تمہید باندھی میرب نے اخذ کرلیا تھا کہ ان کی گفتگو کیا ہوگی۔

"آپ کہیں جی جی! میں سن رہا ہوں"۔ اس نے سکون سے کہا۔

"میرب! میں چاہتی ہوں شادی کے بعد تم اور صبوحی حویلی میں ہی آ کر رہو"۔ میرب کے سکون نے انہیں حوصلہ دیا' سو وہ بغیر ہچکچاہٹ کے اپنا مدعا زبان پر لے آئیں۔

"جی جی! آپ اس وقت یہ بات کیوں کر رہی ہیں جبکہ آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کی بات نہیں مان سکتا"۔ اس کے لب و لہجے میں وہی سکون تھا جی جی صاحب پہلو بدل کر رہ گئیں۔

"تمہیں میری بات ماننی ہی پڑے گی میرب! کیوں کہ میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں' اپنی بیٹی کے مستقبل کے بارے میں اچھا سوچنا میرا حق ہے' اور تم مجھے اس حق سے محروم نہیں کر سکتے' میں صبوحی کے لئے اچھا ہی سوچ رہی ہوں اور تم بھی یقیناً اس کا اچھا ہی چاہتے ہو گے' اگر قسمت اس کے لئے کچھ بہتری کا سوچ رہی ہے تو تم کیوں راہ میں رکاوٹ بن رہے ہو"۔ جی جی صاحب نے اسے متفق کرنا چاہا۔

"مجھے آپ کے خیالات سے کوئی مخالفت نہیں ہے' آپ صبوحی کی ماں ہیں' اس کے بارے میں اچھا سوچنا آپ کا فرض ہے' مگر اس کے لئے کیا اچھا ہے اس میں آپ انصاف نہیں کر پا رہیں' اس کی قسمت پر آپ کو کوئی شک نہیں ہونا چاہئے کہ وہ آپ کے اختیار میں نہیں ہے' اور جس کے اختیار میں ہے وہ بہتر جانتا ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا نہیں' قسمت بنانے والا بھی وہی ہے اور بگاڑنے والا بھی وہی ہے' جہاں تک صبوحی کو کچھ دینے کا سوال ہے تو وہ ذمہ داری میری ہے' میں جانتا ہوں فی الحال مالی حیثیت کے اعتبار سے میری آپ سے کوئی برابری نہیں ہے' لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوگا' جو ہمارے نصیب کا ہوگا وہ ہمیں مل کر رہے گا اور جو نصیب میں نہیں اسے آپ ہمارا نصیب بنانے کی کوشش مت کریں' دوسری بات صبوحی کو میں آپ سے بہتر جانتا ہوں اور سمجھتا ہوں وہ مادیت پرست نہیں ہے' وہ انسانی عظمت کی پاسدار ہے میری خودداری جتنی مجھے عزیز ہے صبوحی کو اس سے کہیں زیادہ ہے' وہ خوشیوں کی پیمائش آسائشات کے پیمانے سے نہیں کرتی' اس کی خوشیوں کا محور اس کی محبت ہے جو اسے مل رہی ہے اس سے زیادہ کی اسے خواہش بھی نہیں ہے' آخری بات یہ کہ میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں کہ آپ کی بیٹی کو بہت خوش رکھوں گا' بے شک میرا گھر بہت بڑا نہیں ہے میرے یہاں خدمت گار نہیں ہیں' وہ آسائشات نہیں جو آپ کی حویلی میں میسر ہیں لیکن پھر بھی میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ صبوحی میرے ساتھ خوش رہے گی اتنی کہ آپ کی تمام شکایات دور ہو جائیں گی"۔ اس نے بڑے دھیمے انداز میں وضاحت میں جواب دیا۔

"لیکن میں پھر بھی مطمئن نہیں ہوں' آخر اس میں کیا قباحت ہے؟ اگر تم یہاں آ کر رہو"۔ وہ میرب کے ارادے بھانپ کر بے چین ہو اٹھیں' ان کا خیال تھا کہ وہ میرب کو منا لیں گی' لیکن وہ جس دلیل سے بات کر رہا تھا انہیں اپنی محنت ضائع ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

"جی جی صاحب! کیا آپ کو لگتا ہے کہ اس بات کے لئے یہ وقت مناسب ہے......؟" وہ جی جی صاحب کی ضد کے آگے بے بسی سے بولا۔

"اس وقت سے زیادہ اور کوئی وقت مناسب نہ ہوگا' کیونکہ ابھی صبوحی میرے پاس ہے' میں اس کے حق کے لئے لڑ سکتی ہوں' وہ رخصت ہو کر تمہارے پاس آ گئی تو میں اس پر تمام حقوق کھو دوں گی' اور میں پھر سے تمہیں سمجھا رہی

ہوں تم اپنی ضد چھوڑ دو' اور تم کوئی غیر تو نہیں ہو' میرے سگے بھانجے ہو آج تمہارے والدین حیات نہیں ہیں آگے پیچھے میں ہی تمہاری قریبی رشتے دار ہوں' میں تمہاری بہتری کے لئے نہیں سوچوں گی تو اور کون سوچے گا"۔

"جی جی! اگر آپ واقعی میری بہتری سوچ رہی ہیں تو وہی کریں جو میں چاہتا ہوں"۔ اس نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

"یہ ناممکن ہے"۔ وہ رخ موڑ کے کھڑی ہو گئیں۔

"تو پھر کہیں میرے لئے کیا حکم ہے؟" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"صبوحی کا ہاتھ تمہیں تب ہی ملے گا جب تم میری بات مانو گے"۔ انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"یہ آپ کی شرط ہے یا آخری فیصلہ"۔ وہ سنجیدہ ہوا۔

"تم جو بھی سمجھو مجھے بس میری بیٹی کی خوشیوں کی ضمانت چاہئے"۔ وہ مستحکم لہجے میں بولیں۔

"جی جی صاحب! اتنی ضد اچھی نہیں ہوتی وہ بھی اس نازک موڑ پر' جہاں تک ضمانت کی بات ہے تو وہ میں کہہ چکا ہوں آپ سے۔ صبوحی کو میں بہت خوش رکھوں گا"۔ اس کا لہجہ جی جی صاحب سے بھی زیادہ مستحکم تھا جس پر وہ چڑ گئیں۔

"تمہارے پاس ہے ہی کیا جس کی بناء پر تم صبوحی کو خوش رکھنے کا دعوی کر رہے ہو"۔ وہ تلخی سے بولیں جسے میرب نے بمشکل برداشت کیا۔

"یہ تو آپ کو پہلے سوچنا چاہئے تھا جب آپ نے صبوحی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا تھا"۔

"تب میں نے یہی سوچا تھا کہ تم میرے اپنے بھانجے ہو' میں جیسے چاہوں تمہیں رکھ سکتی ہوں' مگر تم میری توقع کے خلاف نکلے ہو"۔ وہ شاید پچھتا رہی تھیں۔

"مجھ سے زیادہ اپنی تو آپ کی بہن تھیں' جب ان کی سوچ کو آپ نہیں بدل سکیں تو پھر ان کے بیٹے سے ایسی امید کیوں رکھی آپ نے......؟ آپ سمجھ کیوں نہیں رہیں جو کچھ آپ کا ہے اس پر میرا کوئی حق نہیں' ہاں صبوحی اس کی حقدار ضرور ہے' اور وہی اس کی مالکن بھی' وقت آنے پر وہ جیسے چاہے اپنی جائیداد کو استعمال کرے میں اس پر کوئی پابندی نہیں لگاؤں گا' لیکن اس وقت آپ مجھے میرا گھر چھوڑنے پر مجبور نا کریں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرے گھر میں میرے والدین کی خوشبو ہے میرا گھر میری عزت میری خودداری ہے میں اپنا کما کر کھانے میں فخر محسوس کرتا ہوں' اور اپنی بیوی اور بچوں کو بھی اپنی کمائی سے کھلانا چاہتا ہوں' آپ زبردستی مجھے حویلی کے ٹکڑوں پر پلنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتیں"۔ اس بار وہ ذرا سخت لہجے میں بولا تھا۔

"تم ایک غریب تھے اور ہمیشہ غربت اوڑھ کر ہی سوتے رہو گے' تم میں آگے بڑھنے کی نہ تو جستجو ہے اور نہ ہی ہمت' تمہارے باپ کی بھی ایسی ہی چھوٹی سوچ تھی اور تم......" میرب نے تیزی سے ان کی بات کاٹی۔

"بس جی جی صاحب بس اور میرے ضبط کا امتحان مت لیں' ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ آپ میری خالہ ہیں آپ صبوحی کے مستقبل سے مطمئن نہیں ہیں تو رکھیں اسے اپنے پاس' لیکن برائے مہربانی میرے بابا کے بارے میں کچھ مت کہیں' آپ کے خیال میں صبوحی اس حویلی میں زیادہ خوش رہے گی تو آپ کو یہ حویلی مبارک ہو' مجھے بھی صبوحی کی خوشیاں ہی عزیز ہیں"۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا' جی جی صاحب حیران و پریشان رہ گئیں۔ انہوں نے سنا تھا محبت کرنے والے بہت کمزور ہوتے ہیں' محبت کے سامنے سب کچھ ہار دینے والے' انہیں لگا تھا کہ وہ صبوحی کو پانے کے لئے ان کی ہر بات مان لے گا' ان کی شرائط کے آگے سر جھکا دے گا' لیکن نہیں وہ اصول پسند تھا اپنے

اصولوں کے آگے اس نے محبت کو بھی ٹھکرا دیا تھا وہ چلا گیا تھا' نہ جانے کہاں......؟ گھر چھوڑ کے گاؤں چھوڑ کے' اس کی واپسی کا کچھ پتہ نہ تھا' نہ ان رستوں پر اس کے نشان باقی تھے' صبوحی دلہن بن کر بیٹھی رہ گئی' مگر بارات نہیں آئی سب ختم ہو گیا۔ سب کچھ۔

''مجھے معاف کردو صبوحی! میں ہی تمہاری خوشیوں کی قاتل ہوں' تمہاری بربادی کی موجب' تمہاری خوشیوں کی ضمانت کی خواہش میں خود اپنے ہاتھوں تمہاری خوشیوں کا جنازہ نکال بیٹھی' آج تمہیں اس حالت میں دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے میں کیا کروں' ایسی کون سی سزا دوں خود کو کہ مجھے میرے ضمیر کی ملامت سے چھٹکارا مل جائے''۔ بستر میں منہ چھپائے بی بی صاحب پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔



خواب اگر سراب بن جائیں تو شاید انسان عمر بھر ان میں سے نہیں نکل پاتا' صبوحی کا خواب اس کا میرب بھی ایسا ہی ایک سراب تھا جس میں وہ الجھ کر رہ گئی تھی میرب نے بھی تو یہی کہا تھا۔

''صبوحی! میں خواب نہیں سراب ہوں' تمہیں اس سراب سے کبھی آزادی نہیں ملے گی''۔ تب صبوحی زور سے ہنس دی تھی۔

''نہیں میرب! تم نہ خواب ہو نہ سراب' تم تو حقیقت ہو' اور میں اس حقیقت کے ساتھ جیوں گی کہ تم میرے پاس ہو''۔ وہ جب تک اس کے پاس تھا وہ اسی حقیقت میں جی رہی تھی اور جب وہ اس سے دور ہو گیا تو ان خوابوں میں بھٹکتے رہنا ہی اس کا مقدر ہو گیا۔ اگلے دن شنو اس کے ہاں آ گئی۔

''بی بی جی! آ جاؤں اندر......؟'' حسب عادت کمرے میں داخل ہونے سے قبل اس نے اجازت مانگی۔

''آ جایا کرو' پوچھا نہ کرو''۔ اسنے بھی وہی جواب دیا جو ہمیشہ دیتی تھی۔

''اور بی بی جی نہیں صبوحی کہا کرو''۔ اس کی آنکھیں بے تاثر تھیں' شنو کو اس وقت وہ کوئی اجڑی ہوئی آثار قدیمہ کی مورتی لگی وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پاس جا بیٹھی' صبوحی نے اسے غور سے دیکھا۔

''کچھ پریشان سی لگ رہی ہو......؟'' پریشان تو وہ تھی اس اجنبی نوجوان کی وجہ سے' جو بلاوجہ اس کی راہ میں آتا تھا' اس کی وجہ سے تو اس نے گھر سے نکلنا بھی کم کر دیا تھا۔

''نہیں تو''۔ وہ نظریں چرا گئی' صبوحی کو عجیب لگا' وہ اس کے اندر تک جھانک رہی تھی۔

''شنو! ایک وقت ہوتا ہے جب کچھ راستوں کا انتخاب آپ کے اختیار میں ہوتا ہے' اس وقت اگر فیصلے سمجھداری سے نہ کیے جائیں تو دامن خوشیوں کی بجائے کانٹوں سے بھر جاتا ہے''۔ وہ فلسفیانہ انداز میں بولی' شنو کے ایک لفظ بھی پلے نہ پڑا۔

''محبت کے راستے بہت خطرناک ہوتے ہیں' یہ پہلے خوب من کو لبھا کر پاس بلاتے ہیں اور پھر آخر میں آبلہ پا کر دیتے ہیں' ان کی پرسوچ راہوں میں روح لہولہان ہو جاتی ہے زندگی سے دور کر دیتی ہے۔ یا پھر زندگی کو انسان کے اندر مار کے محض زندہ لاش بنا دیتی ہے''۔ وہ جانے اسے سمجھا رہی تھی یا پھر آپ بیتی بیان کر رہی تھی لیکن شنو جیسے اپنی جگہ شرم سے پانی پانی ہو گئی جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو اس نے اس اجنبی نوجوان کے بارے میں صبوحی کو کچھ نہ بتایا تھا پھر بھی اس نے نجانے کیسے اخذ کر لیا تھا۔

''ایک بات پوچھوں صبوحی جی! اگر آپ کو برا نہ لگے تو......؟'' شنو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا صبوحی نے کوئی جواب نہ دیا جس کا مطلب تھا کہ وہ بات پوچھ سکتی ہے۔

''جب آپ ان سے اتنا پیار کرتی تھیں تو وہ آپ کو چھوڑ کے کیوں چلے گئے......؟'' شنو کا سوال سن کر صبوحی کے چہرے پر ایک زخمی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''اس سوال کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں''۔ وہ بے بسی سے بولی شنو چپ ہو گئی۔

محبت کرنے والے تو محبت کا جواب محبت سے دیتے ہیں پھر وہ کیوں محبت کا جواب جدائی سی دے گیا تھا۔

''آپ کو ان پر غصہ نہیں آتا......؟'' شنو نے پھر سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''نہیں......'' وہ کھڑکی کے پار دیکھ رہی تھی۔

شنو کو آج پہلی بار اس پر ترس آنے لگا وہ کتنی اچھی تھی مگر میرب نے اس کی قدر نہیں کی تھی۔



''سنو لڑکی...... شنو نام ہے ناں تمہارا......؟'' حویلی سے واپسی پر وہ اجنبی پھر اس کے راستے میں آ گیا۔

''میرا نام کس نے بتایا تمہیں......؟'' وہ حیرانگی کے عالم میں پوچھ رہی تھی۔

''نام پتہ کرنا بھلا کون سی مشکل بات ہے جو لوگ اچھے لگتے ہیں ان کے بارے میں سب پتہ لگا لیا جاتا ہے''۔ وہ انتہائی سنجیدگی سے بولا۔

''شنو کے دل کی دھڑکنوں کی رفتار بڑھ گئی۔

''بدتمیزی نہیں کرو''۔ گرچہ اس کا جملہ ''جو لوگ اچھے لگتے ہیں'' اس کے دل کے تار ہلا گیا تھا' لیکن پھر بھی گھبراہٹ تو تھی ہی' سو جو منہ میں آیا کہہ دیا۔

''میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی' نا تمہیں گالی دی' نا برا بھلا کہا۔ دیکھو کھڑا ابھی میں فاصلے پر ہوں' بس تمہارا نام ہی تو پکارا ہے' کیا اس کی بھی اجازت نہ دو گی......؟'' اجنبی نوجوان جتنا خوبرو تھا اتنا ہی خوب بیان بھی' شنو کا نوخیز دل لفظوں کے اس جال میں پھنسنا چاہتا تھا لیکن وہ روک رہی تھی اسے پتہ نہ تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن دل مزاحمت کر رہا تھا وہ اسے روک رہا تھا وہ مجبور کر رہا تھا کہ اس اجنبی کی بات سن لے۔

''میرا نام بھورل ہے یہ تندور والی ماسی ہے ناں اس کے ہاں مہمان ہوں کیا ایک پردیسی سے ہنس کے بات بھی نہ کروں گی......؟'' اس نے پھر سے چکنی چپڑی باتیں شروع کر دیں۔

''میں تمہاری بات کیوں سنوں......؟ آئندہ کبھی میری راہ میں آنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا''۔

''ٹھیک ہے تم چاہتی ہو تو چلا جاتا ہوں' لیکن یہ وعدہ نہیں کرتا کہ تمہاری راہ میں نہیں آؤں گا''۔ وہ کہہ کر تندور والی ماسی نوراں کے گھر غائب ہو گیا اور وہ وہیں کھڑی حیران ہوتی رہی۔

وہ اس کے کہنے سے چلا گیا؟ اور یہ بھی کہا کہ وہ دوبارہ اس کی راہ روکے گا کیوں؟ سوچ کا پرندہ اتنی زور سے پر پھڑ پھڑانے لگا کہ اسے دھڑکنوں کی آواز بھی نہ سنائی دی وہ گم صم سی حالت میں گھر پہنچی اور بستر پر گر گئی۔ آج سے پہلے اس کی زندگی میں کوئی نہ آیا تھا عہد جوانی میں یہ اس کا پہلا تجربہ تھا جو دھڑکنوں کو اتھل پتھل کر گیا تھا وہ اسے نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ اسے بھول جانا چاہتی تھی مگر وہ تھا کہ حواسوں پر ہی چھایا جا رہا تھا' اس کی ایک ایک بات سماعتوں میں گونج رہی تھی وہ بے بسی سے رونے لگی ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

''کیا ہوا شنو! یوں رو کیوں رہی ہو......؟'' اسے روتا ہوا دیکھ کر وسائی پریشان ہو کر اس کے پاس آ کر پوچھنے لگی اس نے گھبرا کر اپنے آنسو پونچھ لئے۔

''نہیں اماں! بس ایسے ہی سر میں ذرا درد ہے اس لئے آنسو نکل رہے ہیں''۔ جب انسان کوئی سچ چھپانا چاہتا

ہے تو جھوٹ آپوں آپ بہانہ بن کر ہونٹوں سے پھسل جاتا ہے شنو کے منہ سے بھی ایسے ہی ایک جھوٹ بن گیا۔

''سر میں درد ہو رہا ہے' پہلے کیوں نہ بتایا مجھے......'' وسائی پریشان کن لہجے میں کہتے ہوئے اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اور اس کا سر دبانے لگی' ماں کے لہجے میں آج پہلی مرتبہ فکر اور انداز میں پیار دیکھ کر آنسو اور بھی زور و شور سے بہنے لگے' وہ وسائی سے لپٹ گئی۔

''تو بھی ناں کتنی سست ہے' ذرا سی تکلیف پر کیسی پریشان ہو جاتی ہے''۔ وسائی کا انداز ڈانٹنے والا کم فکر انگیز زیادہ تھا وہ کچھ نہ بولی سسکتی رہی۔



''پتّر صبوحی......'' جی جی صاحب نے اس کے کمرے میں جھانک کر پکارا' وہ کھڑکی کے پاس گھٹنوں پر سر رکھ کے بیٹھی تھی باہر سے آنے والی ہوا اس کے کھلے لمبے سیاہ بال اڑا رہی تھی مگر اسے ہوش ہی نہ تھا۔

''صبوحی! تم جاگ رہی ہو......؟'' جی جی صاحب نے اندر آ کر اس کے قریب جا کر پوچھا تو صبوحی گردن اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی' جی جی صاحب سے اس کی یہ اجڑی حالت دیکھی نہ گئی' وہ اس کے بال سمیٹ کر چٹیا بنانے لگیں صبوحی نے کوئی مزاحمت نہیں کی وہ چپ تھی۔

''صبوحی......'' جی جی صاحب نے پھر سے اسے پکارا۔

''ہاں جی جی......؟''

''میں تمہیں کہیں لے جانا چاہ رہی ہوں کیا تم چلو گی......؟'' ان کے لہجے میں سوال کم التجا زیادہ تھی۔

''کہاں......؟'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔

''ایک درگاہ پر' رات بھی وہیں رکیں گے' سنا ہے جو بھی اس درگاہ پر جاتا ہے وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹتا' تم بھی چلو' اپنے لئے دعا کرو' شاید خدا ہم سے راضی ہو جائے''۔ وہ اس کی چٹیا بنا چکی تھیں۔

''کب جانا ہے''۔ صبوحی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ماں کو انکار نہ کر سکی تھی۔

''آج شام...... تم تیار رہنا' اپنی گاڑی میں جائیں گے میں تم اور خیراں''۔ جی جی صاحب کہہ کر چلی گئیں۔ شام کو وہ جی جی صاحب کے بتائے گئے مقررہ وقت پر تیار ہو گئی' تیار کیا ہونا تھا' بس کپڑے بدل کر چادر اوڑھ لی تھی' اسے نہیں پتہ تھا وہ کون سی درگاہ پر جا رہی ہے اور کس سے کیا مانگنے جا رہی ہے' وہ بس جا رہی تھی' کیونکہ جی جی صاحب نے کہا تھا' وہ جی جی صاحب کو انکار نہیں کرنا چاہتی تھی' بس ان کی خوشی کے لئے چل پڑی تھی' درگاہ پہ بہت بڑا ہجوم تھا' لوگ دور دور سے حاضری کے لئے آئے تھے' کچھ مناجات کے لئے آئے تھے اور کچھ مناجات پوری ہونے پر نیاز چڑھانے' کچھ ایسے بھی تھے جن کے ساتھ ان کے علیل عزیز و اقارب تھے' ان کا یقین تھا کہ وہ یہاں سے شفا پا کر ہی لوٹیں گے' جی جی صاحب اور خیراں کی معیت میں اس نے بھی درگاہ پر حاضری دی۔ جی جی صاحب نے درگاہ پر چادر چڑھائی اور پھولوں کا نذرانہ پیش کیا ہر طرف سے اگربتیوں کی خوشبو آ رہی تھی کچھ عقیدت مند کلام پاک کھولے اونچی آواز میں تلاوت کرنے میں بھی مصروف تھے۔

حاضری دینے کے بعد وہ ایک بہت بڑے احاطے میں نکل آئیں اس احاطے میں بھی کافی بھیڑ تھی لوگ ٹولیاں بنا کر فرش پر بیٹھے ہوئے تھے چونکہ مغرب کی اذان ہو چکی تھی اس لئے لنگر بھی کھل چکا تھا سب لوگ کھانے میں مصروف تھے' وہ جی جی صاحب کے ساتھ ایک ستون کے پاس ٹیک لگا کر بیٹھ گئی' خیراں ان کے لئے لنگر لے آئی تھی اس کا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن پھر بھی اس نے دو تین نوالے کھا لئے۔ رات عشاء تک وہ وہیں بیٹھی رہی تھیں

پھر جی جی صاحب نماز پڑھنے چلی گئیں خیراں اس کے پاس ہی بیٹھی رہی۔

''صبوحی بی بی! آپ تھک گئی ہیں تو چل کر آرام کر لیں' یہیں پاس ہی مسافر خانہ ہے جہاں عقیدت مندوں کو ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا ہے' ہمیں بھی ایک کمرے میں جگہ مل گئی ہے آپ چل کر آرام کر لیں''۔ خیراں نے بڑی محبت سے صبوحی کا نرم گداز ہاتھ چھو کر کہا تھا۔

''آرام ہی کرنا تھا تو گھر پہ کر لیتے' اب رات اگر یہاں رکنا ہی ہے تو پھر آرام کیسا' پہلے یہاں لوگوں کی بھیڑ تھی جس کی وجہ سے دم گھٹ رہا تھا مگر اب صورتحال مختلف ہے' بہت سے لوگ مسافر خانوں کی طرف چلے گئے ہیں' اب یہاں کھلی فضا میں جی بہت اچھا لگ رہا ہے''۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر لمبا سانس کھینچا تھا۔

''تو کیا آپ رات یہیں بیٹھ کر گزاریں گی......؟'' خیراں کے انداز میں نہ تعجب تھا نہ حیرانگی' بس سوال تھا۔

''میرا دل چاہ رہا ہے میں ادھر ہی بیٹھی رہوں''۔ اس نے دھیمے انداز میں کہا۔

''بہت بہتر...... جیسے آپ کی رضا' میں یہیں آپ کے پاس لیٹ جاتی ہوں''۔ خیراں ایک طرف چادر بچھانے لگی۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے آپ جا کر مسافر خانے میں آرام کریں اور جی جی کو بھی وہیں لے جائیں مجھے یہاں کوئی ڈر نہیں میں محفوظ ہوں''۔ اس نے خیراں کو وہاں سے جانے کے لئے کہا' صبوحی کی بات اسے نامناسب نہیں لگی تھی کیونکہ وہ درگاہ تھی اور اس کا ہر حصہ محفوظ تھا پھر اس احاطے میں وہ اکیلی نہیں تھی آس پاس اور بھی کتنے ہی مرد اور عورتیں چادریں بچھائے لیٹے ہوئے تھے۔ خیراں وہاں سے جا چکی تھی صبوحی نے ستون سے ٹیک لگا لی اس کی نگاہیں آسمان پر جمی ہوئی تھیں' وہ دیکھتی رہی اور دیکھتی رہی' تاروں کی تمتماہٹ دھندلا گئی اور چاند پر بدلیوں کی چلمن گر گئی۔ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا اس نے کچھ نہ مانگا' اسے پتہ ہی نہ تھا کہ کیسے مانگتے ہیں' اس نے کبھی مانگا ہی نہ تھا۔ سب کچھ تو اسے بن مانگے ہی مل گیا تھا ماں' باپ ان کا پیار' عزت' رتبہ' تعلیم' پُر آسائش زندگی اور میرب کی محبت پھر...... پھر کیا ہوا......؟ سب کچھ چھن گیا' زندگی بے سکون ہو گئی۔ اور رہ گیا بس انتظار...... اس کی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔ میرب...... اس کے لبوں سے سسکی نکلی۔ میرب...... ذہن پکار اٹھا' میرب...... دل پکار اٹھا۔ میرب...... دھڑکنیں شور کرنے لگیں۔ میرب...... آنکھیں رو پڑیں۔ میرب...... نسوں میں دوڑتا خون اور بس ایک ہی تکرار میرب۔ میرب۔ میرب۔

وہ نڈھال ہو گئی' آسمان سے نگاہیں ہٹا کر اس نے سر پھر سے ستون کی پشت سے ٹکا دیا وہ تھک گئی۔ ایک مسلسل پکار' ایک مسلسل درد کی آنچ سہتے سہتے وہ تھک گئی تھی اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا' اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں شاید اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔

''می...... رب''۔ لفظ ٹوٹ کر اس کی زبان سے ادا ہوا' جیسے ہوا میں کسی نے غلیل چلا کر پرندہ مار دیا ہو اور اس نے گرتے گرتے آخری بار پر پھڑپھڑائے ہوں۔

''می...... رب...... رب...... رب......'' وہ سو گئی تھی۔ ہونٹ خاموش صدا خاموش دل خاموش' لیکن دل تو خاموش نہیں ہوتا' وہ تو بے ہوشی اور نیند میں بھی دھڑکتا رہتا ہے' اور آج تو اس کے دل نے کچھ عجیب سا دیکھا' اس کے دل میں روشنی کی ایک لکیر سی چلنے لگی جیسے کسی اندھیرے کال کوٹھری کے اندر کوئی روزن پھوٹ پڑے اور اس میں سے کسی شعاعوں کی ایک تیز لہر یوں راستہ بنائے اندھیری کوٹھری میں مقید قیدی کی آنکھیں چندھیا جائیں' اس کی آنکھیں بھی چندھیا گئی تھیں' اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

''بیٹا! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے......؟'' ایک بزرگ جو وہاں سے گزر رہے تھے اسے پریشان دیکھ کر پوچھنے لگے۔

''آپ کون ہیں......؟'' اس نے آس پاس نظر دوڑائی' آدھی رات بیت چکی تھی' احاطے میں موجود تمام لوگ نیند کی وادی میں گم تھے' ایک وہی تھی جو جاگ رہی تھی۔

''میں اس رب کا بندہ ہوں جو بڑا غفور ورحیم ہے''۔ اس باریش بزرگ نے آسمان کی طرف اشارہ کیا' صبوحی چپ ہوگئی وہ اس وقت ایک درگاہ میں تھی یہ بزرگ یقیناً یہاں کے مرشد ہوں گے اس نے خود ہی اخذ کرلیا۔

''کیا بات ہے بیٹا......؟ آپ کو نیند نہیں آرہی......؟ آپ کچھ بے چین لگ رہی ہیں' میں نے دیکھا آپ نیند میں کچھ بڑبڑا رہی تھیں کچھ مانگ رہی تھیں کیا چاہئے آپ کو......؟'' وہ بزرگ کافی نرم آواز اور پرتاثیر لہجہ رکھتے تھے صبوحی کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

''میں سکون مانگ رہی تھی''۔ اس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔

''میرا دل بے چین ہے میری روح مضطرب اور میری زندگی بے مقصد مجھے کہیں بھی آرام نصیب نہیں ہے میری ماں مجھے اس درگاہ پر لے آئی ہے اس کا ماننا ہے کہ جو بھی یہاں من کی مراد لے کر آتا ہے وہ خالی ہاتھ نہیں جاتا' وہ یہاں سے ضرور نوازا جاتا ہے''۔

''نوازنے والی ذات تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے' وہی سب کو نوازتا ہے جو اسے سچے دل سے پکارتا ہے وہ اس کی ضرور سنتا ہے''۔ بزرگ کی بات سن کر صبوحی چپ ہوگئی وہ مذہب ایمان اور عقیدے کے فلسفے میں الجھنا نہیں چاہتی تھی فی الوقت اسے ایک ایسے نسخے کی ضرورت تھی جو اسے اس کے کرب سے نکالنے کے لئے نجات دہندہ ثابت ہو۔

''تمہاری پریشانیوں کا ایک ہی نسخہ ہے''۔ بزرگ نے اس کی سوچ پڑھ لی تھی اس نے حیرانگی سے سر اٹھایا۔

''حیران نہ ہو بیٹی! یہ پاس ہی میرا حجرہ ہے' میں وہاں سے نسخہ لکھ کر لاتا ہوں''۔ بزرگ کے چہرے پر نور کی روشنی پھیل گئی' نجانے کیوں اس لمحے اس کے دل میں کوئی شک پیدا نہ ہوا' نا ہی اس کے دل کو اس انسان کی بزرگی سے انحراف محسوس ہوا' وہ ایک یقین کے ساتھ اٹھ کر بزرگ کی تقلید کرتے ہوئے حجرے کی طرف آئی وہ ایک لمحے کے لئے اندر گئے تھے پھر جب باہر آئے تو ان کے ہاتھ میں نیم کا ایک پتہ تھا جس پر شاید انہوں نے نسخہ لکھ کر دیا تھا' صبوحی نے وہ نسخہ ان کے ہاتھ سے لے کر چادر کے پلو میں باندھ دیا۔

''یہ پانی پیو''۔ بزرگ نے اس کی اور ایک پیالہ بڑھایا تھا جسے اس نے ہونٹوں سے لگالیا پانی بہت میٹھا اور پرتاثیر تھا اس پر پھر سے غنودگی چھانے لگی تھی بزرگ اپنے حجرے میں چلے گئے اور وہ پھر سے ستون کے پاس۔ اس پر ایک بار پھر نیند کا غلبہ ہونے لگا اور وہ بیٹھے بیٹھے بے خبر ہوگئی۔



''شنو بیٹا! ادھر آؤ' شکل کیوں اتری ہوئی ہے پٹ......؟ کوئی پریشانی ہے کیا......؟'' اس دن پیرل نے اس کی اتری ہوئی شکل دیکھ کر پاس بلایا وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کے پاس آبیٹھی۔

''کیا ہوا ہے پٹ......؟ تم اتنی چپ چپ اور گم صم کیوں رہنے لگی ہو......؟ اور آج کل کہیں آتی جاتی بھی نہیں ہو' سکینہ بھی پوچھ رہی تھی تمہارا......؟'' پیرل اپنے تئیں اس کے لئے فکر مند تھے لیکن وہ کیسے باہر جاتی۔ اسے ایک ہی ڈر تھا اگر وہ لڑکا بھورل پھر سے اس کی راہ میں آگیا تو......؟

''ہاں تو اچھا ہی ہے ناں' دیر سے ہی سہی' چھوری کو عقل تو آگئی''۔ وسائی نے مطمئن سے انداز میں باپ بیٹی کے درمیان مداخلت کی۔

''میں تو اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں اور بس۔ کہیں تم نے تو میری بیٹی پر پابندیاں نہیں لگائیں......؟'' اس بار

پیرل ذرا شرارت سے بولا۔

''نہیں نہیں ابا! اماں نے کچھ نہیں کہا''۔ اس سے پہلے کہ وسائی کوئی کرارہ سا جواب دیتی شنو نے جلدی سے وضاحت کی۔

''ابا! میں صبوحی بی بی کے پاس جاؤں......؟'' کچھ دیر بعد وہ پوچھنے لگی۔

''ہاں میرا بیٹا ضرور''۔ پیرل نے خوش ہوکر کہا۔

''تم کہو تو میں چھوڑ کے آؤں تمہیں سائیکل پر......؟''

''نہیں ابا! میں خود ہی چلی جاؤں گی''۔ اس نے فوراً ڈر کے مارے منع کردیا' کہیں بھورل نے ابا کے سامنے ہی کچھ الٹا سیدھا کہہ دیا تو...... چپل پہن کر اور دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھ کے وہ گھر سے نکل آئی' سنسان دوپہر میں اس کے قدم حویلی کی جانب رواں دواں تھے۔

''میں کیوں جارہی ہوں اس راستے سے......؟ حویلی کی طرف تو اور بھی کئی راستے جاتے ہیں' میں راستہ بدل کر بھی تو جاسکتی ہوں......؟ کیا میں خود چاہتی ہوں کہ بھورل مجھے دیکھے اور میں اس کو دیکھوں......؟ آخر میرا دل اتنا بے چین کیوں ہے؟ کیوں خوف کے باوجود بھی پاؤں کو ان ہی رستوں کی چاہ ہے......؟'' اس کا ضمیر مسلسل اس سے سوال کررہا تھا لیکن اس کے پاس مناسب جواب نہیں تھے اور نا ہی وہ جواب ڈھونڈنا چاہتی تھی بھورل آج بھی کھڑا تھا اپنی مخصوص جگہ پر تندور والی ماسی کے گھر کے سامنے' شنو پر نظر پڑتے ہی وہ بے قرار سا ہوا اٹھا۔

''کہاں تھی تم تین دنوں سے......؟ کیا اب ایسے تنگ کروگی مجھے......؟'' اس پر نظر پڑتے ہی وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا شنو کے دل نے زور سے دھڑکنا شروع کیا۔

''کیا میں یہی سننا چاہتی تھی......؟''

''کیا بکواس کررہے ہو......؟ کسی نے سن لیا تو......؟'' آج اس کی مزاحمت کمزور تھی' یعنی اسے کوئی اعتراض نہیں تھا صرف لوگوں کے سننے کا ڈر تھا۔

''اگر تمہیں لوگوں کا ڈر ہے تو تھوڑی دیر کے لئے اندر آجاؤ''۔ اس نے منت بھرے انداز میں کہا' شنو کا دل چاہا وہ اس کی بات مان لے۔

''نہیں...... میں نہیں آؤں گی''۔ اس نے نفی میں سر ہلایا تو دل چیخ اٹھا۔

''سب محبت کرتے ہیں پھر تمہیں کیا حق ہے میرے جذبات پر پل باندھنے کی......؟''

''تم مجھے اندر بلا رہے ہو اور ماسی نوراں کیا سوچے گی مجھے وہاں دیکھ کر......؟'' اس نے سنبھل کر اپنے لفظوں کو بدلا انکار کو اقرار میں بدلا۔

''وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے تم میرا یقین کرو' میں صرف دو گھڑی ہی بات کروں گا تم سے''۔ اس نے کچھ ایسے التجائیہ اور محبت بھرے انداز میں کہا کہ وہ خود کو اس کی بات ماننے سے روک نہ سکی لاشعوری طور پر اس کا دل بھورل کی محبت کو قبول کر بیٹھا تھا اور وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ اس کی بات سنے اس کی بات مانے۔

''بیٹھو''۔ اندر آکر بھورل نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔

''میں بیٹھنے نہیں آئی' تمہیں جو کہنا ہے جلدی کہو''۔ دل کے شور پر قابو پا کر وہ اوپری طور پر ابھی تک غصہ ہی دکھا رہی تھی۔

''تمہارے چہرے پر مسکراہٹ ہی اچھی لگتی ہے غصہ ہرگز نہیں''۔ بھورل نے کچھ یوں تعریفی انداز میں کہا کہ شنو

کا دل موم بننے لگا۔

''میں جا رہی ہوں''۔ وہ دروازے کی طرف بھاگی۔

''بس اتنی سی دیر کے لئے آئی ہو......؟ کیا بات سنے بغیر ہی چلی جاؤں گی......؟'' بھورل نے اس کا راستہ روک لیا۔

''تو پھر ادھر ادھر کی کیوں ہانک رہے ہو......؟ جلدی سے بات کرو ناں''۔ وہ دیدے مٹکا کے بولی' بھورل نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر ٹکا دیں۔

''شنو! میں جو بات تم سے کہنے جا رہا ہوں اسے غور سے سنا اور جلدی جواب مت دینا سوچ سمجھ کے فیصلہ کرنا میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں شنو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہیں اپنانا چاہتا ہوں تم بس مجھے اجازت دو' تاکہ میں اپنے گھر والوں کو تمہارے والدین سے بات کرنے کے لئے بھیجوں''۔ بھورل نے صاف صاف لفظوں میں اپنی محبت کا اظہار کیا تھا' شنو کو لگا زمین آسمان یہ پوری کائنات اور اس کی ہر شے ٹھہر گئی ہو' بس وہی ایک ذی روح محبت کے طلسم کدے میں کھڑی سانس لے رہی ہو۔

''میں کوئی بچوں والی بات نہیں کر رہا اور نا ہی میں تم سے کوئی کھیل کھیل رہا ہوں میں اپنے جذبوں اور اپنی محبت میں ایکدم سچا اور کھرا ہوں اس وقت اس گھر میں تمہارے اور میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے پھر بھی دیکھو میں تم سے فاصلے پر کھڑا ہوں کیونکہ میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں اور یہی میری محبت کی سچائی کا ثبوت ہے' تم گھر جاؤ آرام سے سوچو' میں کچھ دنوں کے لئے اپنے گاؤں واپس جا رہا ہوں لیکن جب میں لوٹ کے آؤں گا تو مجھے تمہارا جواب چاہئے ہوگا''۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے کہہ رہا تھا لیکن وہ نظریں جھکا کر کھڑی تھی۔

''شنو! تم بہت اچھی لڑکی ہو......؟ یقین مانو تم جیسی لڑکی میں نے آج تک اپنی زندگی میں نہیں دیکھی بس یہ جو دل ہے ناں بہت پاگل ہے بچہ تم پر مر مٹا ہے اس کے مان سمان کو رسوا مت کرنا''۔ وہ منت بھرے لہجے میں بولا تو وہ جیسے پگھلنے لگی محبت چاہت وارفتگی یہ القابات اور انداز اظہار کیا یہ سب اس کے لئے ہے......؟ کیا وہ اتنی اچھی ہے کیا وہ اس قدر خوبیوں کی مالک ہے کہ کوئی اس پر دل ہار بیٹھا ہے' کیا وہ اتنی خوبصورت ہے کہ کوئی اسے اپنے جذبوں کو سونپ رہا ہے......؟

''میں جاؤں......؟'' وہ نظریں جھکا کر اجازت طلب لہجے میں بولی۔

''اتنی جلدی......؟'' وہ بے قرار ہو اٹھا۔ وہ بھی غیر ارادی طور پر یہی سننا چاہتی تھی؟ اسکا پاگل دل کہہ رہا تھا کچھ دیر مزید وہاں رکے اور بھورل کی آنچ دیتی باتیں سنے۔

''مجھے دیر ہو رہی ہے''۔ اسے بھورل کا روکنا اچھا لگ رہا تھا' اس لئے بار بار جانے کے لئے کہہ رہی تھی۔

''اچھا جانے سے پہلے کچھ کہہ کر تو جاؤ' کوئی آخری لفظ' کوئی آخری فقرہ......؟''

''آخری کیوں......؟ آخری کیوں......؟'' اس نے یکدم بے قراری سے پلکیں اٹھا کر فکر انگیز انداز میں پوچھا۔ بھورل زور سے ہنس دیا۔

''جواب مل گیا مجھے......'' وہ خفت کے احساس سے انگلیاں مروڑنے لگی۔

''ٹھیک ہے اب تم جاؤ' لیکن مجھے بھول مت جانا میں بہت جلد واپس آؤں گا اور تم سے ہاں میں جواب سنوں گا''۔ وہ اب مطمئن نظر آ رہا تھا۔

''کیا جانا ضروری ہے......؟'' وہ نا چاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھی۔

''ہاں اگر ضروری نہ ہوتا تو میں کبھی نہ جاتا''۔ وہ لاڈ سے مسکرایا۔

''کب تک واپس آؤ گے......؟'' وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''بہت جلد''۔ بھورل مسکرایا اور وہ مزید کوئی سوال کئے بغیر واپس آ گئی البتہ وہ خود کو بہت اداس پا رہی تھی۔



وہ صبح بہت روشن تھی' لگتا تھا روشنی چار گنا اضافے کے ساتھ زمین کی حدود کو چھو رہی ہو' وہ جی جی صاحب اور خیراں کے ساتھ واپس آ گئی تھی۔

''صبوحی......! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے''۔ اس شام جی جی صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ صبوحی کو سب کچھ بتا دیں گی' وہ کھڑی ہو گئی۔

''ہاں جی جی! کیا بات ہے......؟'' اس کی آواز ٹھہری ہوئی تھی' آج اس کی آنکھوں میں وحشت بھی نہیں دکھائی دے رہی تھی' ایک لمحے کے لئے جی جی صاحب نے سوچا کہ وہ واپس پلٹ جائیں' اسے کچھ بھی نہ بتائیں' لیکن پھر انہوں نے اس سوچ کو جھٹک دیا' اپنے ذہن سے نکال دیا' آخر کب تک وہ دل پر بوجھ لئے پھرتیں' جب کہ انہیں معلوم تھا کہ صبوحی کی زندگی کی یہ حالت ان کی وجہ سے ہوئی ہے' وہ کہتی گئیں اس رات جو کچھ بھی ہوا' ان کے اور میرب کے درمیان جو بھی باتیں ہوئیں انہوں نے سب صبوحی کو بتایا' وہ کہتی رہیں اور صبوحی حیران پریشان حق دق انہیں دیکھے گئی بے یقینی سی بے یقینی۔ تو یہ راز تھا اس معمے کا' وہ جو اکثر سوچتی رہتی تھی کہ آخر ایسی کیا بات ہو گئی جو میرب اس سے روٹھ کے چلا گیا تو اس کے جانے کی یہ وجہ تھی۔ یکلخت اس کی آنکھوں میں وحشت اترنے لگی' وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر لیا۔

''صبوحی...... صبوحی! مجھے معاف کر دو' میں نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا' لیکن خدا گواہ ہے میری نیت غلط نہیں تھی میں ماں ہوں' تمہارا بھلا ہی چاہتی ہوں' پر مجھے پتہ نہیں تھا کہ تمہارا بھلا چاہنے کی چاہ میں سب کچھ الٹ ہو جائے گا''۔

''جی جی! آپ نے میرا بھلا نہیں چاہا تھا میرے لئے حویلی چاہی تھی' میں حویلی میں ہوں ناں بس اور کیا چاہئے آپ کو''۔ دروازے کے اس پار صبوحی نے دل گرفتگی سے کہا تھا جی جی صاحب کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔

''نا میری دھی! یوں مت کہو' مجھے پتہ ہے تمہاری خوشیاں صرف میرب کے ساتھ ہیں' اس کے بغیر تم کچھ نہیں ہو''۔ جی جی صاحب رونے لگ گئیں۔ ان کے یہ آنسو پچھتاوے کے آنسو تھے' یہ بات صبوحی بھی جانتی تھی مگر فی الحال اس میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ وہ دروازہ کھولتی جی جی صاحب یا ان کے آنسوؤں کو دیکھتی یا انہیں معاف کرتی۔



کبھی اس نے سنا تھا محبت کے بارے میں' اس کے رنگوں اس کی خوشبوؤں کے بارے میں' محبت میں نیندیں گنوانے کے بارے میں' اس کی بھی نیندیں اڑنے لگی تھیں بھوک پیاس مٹنے لگی تھی' ذہن میں بس ایک ہی آواز گونجتی تھی۔

''یقین مانو تم جیسی لڑکی میں نے آج تک اپنی زندگی میں نہیں دیکھی''۔ بھورل کی آواز اس کی باتیں اس کا جادو' کیا یہی محبت تھی......؟ جانے یہ محبت کیا تھی' اس کا احساس اتنا انوکھا کیوں تھا' اس کا روپ اتنا خوش کن کیوں تھا' اس نے تو کبھی سمجھا ہی نہ تھا' کبھی سوچا ہی نہ تھا' پر اب جب چاہے جانے کا احساس دل کی سرزمین پر دستک دے رہا تھا تو وہ کیا کرے......؟ اپنے جذبوں پر پل باندھے یا دل و جان سے اس کا استقبال کرے؟ لیکن وہ اپنے جذبوں پر پل کیسے باندھے......؟ اس کے تو کچھ بھی اختیار میں نہ تھا' وہ اتنی مجبور کیوں ہے......؟ کیا محبت سب کو اتنا مجبور و بے بس

کردیتی ہے......؟

بھورل چلا گیا تھا، لیکن اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ بہت جلد لوٹ کر آئے گا اور اس سے جواب سنے گا وہ کیا جواب دے گی؟ کیا جواب دینا اتنا آسان تھا؟ یہ بے تابیاں یہ بے قراریاں کیوں......؟ بھورل کو یہاں نہ پاکر وہ اتنی بے کل کیوں تھی؟ کیا بھورل کی جدائی اور اس کا انتظار اسے بے کل رکھتا تھا، اسے وہ رستے سونے سونے لگتے تھے، جہاں وہ پہلے بھورل کو دیکھا کرتی تھی، اب اسے سمجھ آرہا تھا کہ انتظار کی کوفت کیا ہوتی ہے۔ صبوحی کی دیوانگی یونہی نہیں تھی، اس کے پاگل پن کا سبب بھی وہی انتظار تھا، جو وہ خود بھی کسی کے لئے کررہی تھی۔

عشق کا انجام آخر جدائی اور انتظار کیوں ہوتا ہے......؟ وہ گھنٹوں خلاؤں میں گھورتی رہتی، سوچتی رہتی اور پھر تھک کر رونے بیٹھ جاتی۔

''آخر یہ روگ کیوں پال لیا میں نے......؟ کیا میں بھی صبوحی بن گئی ہوں......؟ وہ صبوحی جس کی حالت دیکھ کر میں کبھی ڈرجایا کرتی تھی، کیا اب میں بھی ڈراؤنی لگتی ہوں......؟'' وہ آئینے کے سامنے آئی۔ اس کے حلیہ صبوحی سے قدرے بہتر تھا، وہ صبوحی کی طرح بھٹکی ہوئی روح نہیں لگ رہی تھی مگر ہاں آنکھوں کی اداسی میں صبوحی کا عکس ضرور نظر آرہا تھا، کیونکہ انتظار وہاں بھی تھا اور یہاں بھی۔

''کیا مجھے بھی عشق ہوگیا ہے......؟'' وہ خود سے پوچھنے لگی۔ یہ انتظار یہ بے کلی اور بار بار اس کی راہوں میں جاکر اسے تلاش کرنا یہ محبت کی نشانیاں نہیں تو اور کیا ہیں......؟

''ہاں مجھے بھی عشق ہوگیا ہے میرے اندر جو بھورل کے لئے اسے دیکھنے اور پانے کے لئے جو تڑپ اٹھ رہی ہے وہ میرا عشق ہی ہے''۔ بالآخر اس نے خود سے اقرار کر ہی لیا۔



سوگوار دل، سوگوار آنکھیں، سوگوار زندگی، دروازہ بند کئے وہ کھڑکی میں بیٹھی رہی، باہر تیز بارش ہورہی تھی۔

''تو میرب یہ وجہ تھی کہ تم مجھے چھوڑ کے چلے گئے، تم نے ایک بار مجھ سے بات کرنا یا میری بات سننا بھی گوارہ نہ کیا تم نے مجھ سے پوچھنا مناسب ہی نہ سمجھا کہ میں کیا چاہتی ہوں یا میرا دل کیا چاہتا ہے، مجھے تو تم ہر حال میں قبول تھے، میں تمہارے ساتھ خوش تھی، جی جی نے جو کچھ کہا وہ ان کی خواہش تھی ان کی مرضی تھی، تم نے ان کی مرضی کو میری مرضی کیسے سمجھ لیا؟ کیا تمہیں میری محبت پر یقین نہیں تھا یا پھر تمہیں تمہاری خودداری میری محبت سے بھی زیادہ عزیز تھی؟ میرب کیوں کیا تم نے ایسا......؟'' اس نے آنکھیں بھینچ کر دیوار سے سر ٹکا دیا چاروں اور بے چینی تھی کرب تھا۔

''تم تو مجھ سے محبت کرتے تھے میرب! پھر اس محبت کا کیا ہوا......؟ کیا محبت نے بھی تمہیں نہیں روکا، تمہیں واسطہ نہیں دیا، تمہارے پیروں میں بیڑیاں نہیں ڈالیں؟ کیوں میرب کیوں......؟ مانا کہ بات تمہارے مزاج کے خلاف ہوئی تھی، تمہاری خودداری پر ضرب پڑی تھی، تمہیں بے حد غصہ آیا تھا اور اسی غصے نے تم سے وہ انتہائی قدم اٹھوایا، لیکن اسے بھی تو آٹھ ماہ ہوچکے ہیں کیا ان آٹھ مہینوں میں تمہارے غصے کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی میری یاد یا واپس لوٹنے کا خیال نہیں آیا، چلو تم واپس نہیں آسکتے تھے لیکن میری خبر تو لے سکتے تھے ایک خط ہی لکھ سکتے تھے یہ پوچھنے کے لئے کہ میں کیسی ہوں......؟ کیسے جی رہی ہوں جی بھی رہی ہوں یا مرگئی ہوں''، آنسو ایک تواتر کے ساتھ اس کی آنکھوں سے رواں دواں تھے بالکل بارش کی بوندوں کی طرح۔

''مجھے جی جی صاحب سے کوئی شکایت نہیں، انہوں نے اپنے تئیں میرے لئے ٹھیک ہی سوچا ہوگا، ہاں مگر ان کا انداز غلط تھا انہیں اس موقع پر یہ بات نہیں کرنی چاہئے تھی یا پھر مجھ سے پوچھے بغیر ایسا کوئی مطالبہ نہیں کرنا چاہئے تھا،

وہ ایک بار مجھ سے پوچھ تو لیتیں کہ میں کیا چاہتی ہوں......؟ میری خواہش کیا ہے......؟ میں خوش ہوں تو پھر مسئلہ ہی کیا، لیکن کسی نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا، نہ تم نے، نہ جی جی نے اور میری زندگی کا فیصلہ ہوگیا، انتظار، انتظار، انتظار......'' وہ بھیگنے لگی بارش میں نہیں اپنے ہی آنسوؤں میں۔ یکایک اسے وہ باریش بزرگ یاد آئے جنہوں نے اس کے لئے نسخہ لکھا تھا وہ جھٹکا کھاکر سیدھی ہوئی اس رات کا وہ تمام قصہ اس کے ذہن میں روشن ہوا، وہ اٹھ کر الماری کی طرف گئی، وہاں اس کی چادر رکھی ہوئی تھی اور اس کے پلو میں وہ تعویذ بھی، نیم کا ایک پتا جس پر ایک ہی لفظ لکھا تھا۔ اللہ۔

اس کے ہونٹوں نے حرکت کی اور دل نے سوال کیا۔

''یہ کیا نسخہ ہے......؟'' اس کا مطلب کیا ہے......؟ بزرگ نے تو کہا تھا کہ اس میں تمہارے لئے سکون ہے، تمہاری پریشانیوں کا حل ہے، پھر یہ کیسا حل ہے......؟'' وہ ہاتھ میں نیم کا پتا لے کر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔



یہ کیا ہوا تھا اچانک ہی......؟ بھورل نے کیسا سحر پھونکا تھا کہ اس کی ہنستی بستی زندگی بے چینیوں کی نذر ہوگئی تھی، وہ تو سکھی سہیلیوں کے ساتھ دن بھر کھیل کود کرکے بڑی پرسکون زندگی جی رہی تھی، مگر بھورل کی محبت نے اس کے عشق نے اس کا یہ بچپن یہ بھولپن چھین لیا تھا۔

''کیا محبت ایسی ہی ہوتی ہے......؟'' وہ گھنٹوں سوچتی، خود سے پوچھتی، مگر کوئی جواب نہ ملتا۔

صبوحی کی طرح اب اس کا بھی کمرے سے باہر دل نہ لگتا تھا۔ وہ چارپائی پر لیٹی سوچوں میں گم رہتی یا کبھی خالی ذہن کے ساتھ نگاہ ایک نقطے پر مرکوز کرلیتی۔ ہجر کے یہ دن کسی طور نہ کٹتے تھے، بلکہ اور زیادہ بے تاب کردیتے تھے۔

ایک دوبار اس کی سکھیاں اسے بلانے بھی آئی تھیں مگر اس نے جانے سے انکار کردیا اب اس کا دل کھیل کود میں نہیں لگتا تھا نہ ہی سکھیوں کی باتیں، ہنسی ٹھٹھے اسے خوش کرپاتے تھے، وہ بھیڑ میں رہ کر بھی خود کو تنہا محسوس کرتی، بھورل کا انتظار اور بس انتظار۔ ایک مہینہ ہوگیا تھا بھورل نے اپنی شکل نہیں دکھائی تھی جب اس کی بے کلی حد سے سوا ہوگئی تو وہ اٹھ کر ماسی نوراں کے پاس آگئی، دن کے بارہ بجے کا وقت تھا، ماسی نوراں تندور گرم کرکے روٹیاں ڈالنے میں مگن تھی۔

''چھوری! بڑے دنوں بعد شکل دکھائی ہے''۔ شنو پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنی بتیسی کی نمائش کی، وہ گھبرا کر اس کے پاس آبیٹھی۔

''روٹیاں چاہئے......؟'' اسے چپ دیکھ کر ماسی نوراں نے دوسرا سوال داغا۔

''ہاں......وہ مجھے دو روٹیاں دے دے''۔ اس نے پلو میں بندھے پانچ کا سکہ کھولا۔

''چل رہن دے پیسے...... ایسے ہی لے جا روٹیاں، میرا ذرا ایک کام کردے''۔ وہ اکثر ماسی نوراں کا چھوٹا موٹا کام کردیتی تھی اور بدلے میں وہ اسے ایک دو روٹیاں مفت دے دیتی آج انہوں نے اس سے برتن منجھوائے تھے، وہ بڑی بے چینی سے برتن مانجھ رہی تھی، تاکہ جلد از جلد کام پورا کرکے ماسی نوراں سے بھورل کے بارے میں پوچھ سکے، کیونکہ ایک بجنے والا تھا اور ایک بجے کے بعد ان کے پاس لوگوں کا آنا جانا شروع ہوجاتا تھا، وہ سب ان کے پاس روٹیاں لینے آتے تھے۔

''ہوگئے برتن چل آجا، اٹھا لے یہ دو گرما گرم روٹیاں''۔ انہوں نے دو عدد تندوری روٹیاں کپڑے میں لپیٹ کر اس کی طرف بڑھائیں۔

''ماسی نوراں......! تمہارے ہاں ایک لڑکا رہنے کے لئے آیا تھا......؟'' روٹیاں ہاتھ میں لے کر اس نے تیزی

سے پوچھا' مبادا وہ پھر کسی کام میں نہ الجھ جائیں۔

''کون......؟ وہ میرا چچیرا بھائی بھورل......؟'' وہ آٹے کے پیڑے بنانے لگی۔

''ہاں شاید یہی نام تھا اس لڑکے کا''۔ شنو نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو اس کا کیا......؟'' ماسی نوراں نے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

''وہ کہاں ہے......؟'' شنو نے جھٹ سے پوچھا۔

''سڑ رہا ہے جیل کے اندر''۔ انہوں نے منہ بنا کر کہا' شنو کا دل حلق میں آ گیا۔

''جیل میں......؟ لیکن کیوں......؟'' وہ دل ہی دل میں بہت فکر مند ہوئی مگر ظاہر نہ کیا۔

''بڑا لڑکی باز ہے' چکنی چپڑی باتیں بنا کر لڑکیوں کے دل پھانسنے میں بڑا ماہر ہے' ایک تو خدا نے شکل وصورت بڑی موہنی دی ہے' سو یوں ریجھ جاتی ہیں لڑکیاں اس سے''۔ انہوں نے چٹکی بجائی پھر راز داری سے قریب آتے ہوئے بولی۔

''کئی کا دل دکھایا موئے نے' لیکن اس بار وڈیروں سے پالا پڑا ہے' لڑکی بھگا رہا تھا ان کی' عین موقع پر پکڑا گیا پھر تو وہ حشر کیا مار مار کے کہ بدن پورا نیلا پڑ گیا' اتنا ہی نہیں پولیس بلا کے جیل خانے بھیج دیا اسے چکی پینے کے لئے''۔ ماسی نوراں نے پھر سے اپنی بتیسی نکالی شنو کے لئے اپنے پیروں پر کھڑے رہنا مشکل ہو گیا' اسے لگا زمین گھوم رہی ہے اور وہ کسی بھی لمحے لڑکھڑا کر گر سکتی ہے۔

☆

اس پر بزرگ کا معمہ نہیں کھلا' اس نے بہت سوچا لیکن جواب نہیں ملا' تب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ درگاہ پر جا کے ان بزرگ سے ملے گی اور انہی سے اس حکایت کو سمجھے گی۔

''جی جی صاحب! مجھے درگاہ پر جانا ہے''۔ وہ جی جی صاحب کے کمرے میں آ کر سپاٹ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ کل صبح جب جی جی صاحب نے اسے میرب کے جانے کی وجوہات بتائی تھیں اس کے بعد وہ ان کے سامنے نہیں گئی تھی جی جی صاحب اسے دیکھ کر لپک کے آگے بڑھیں۔

''صبوحی! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے......؟'' انہوں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں......'' اس نے نگاہیں جھکا کر رکھی ہوئی تھیں۔

''تو پھر تم درگاہ پر کیوں جا رہی ہو......؟''

''مجھے وہاں بزرگ سے ملنا ہے''۔

''کون سے بزرگ......؟''

''آپ نہیں جانتی انہیں''۔

''تم کیسے جانتی ہو......؟''

''میں جب احاطے میں رات ٹھہری تھی تو ان سے ملاقات ہوئی تھی''۔

''پھر......؟''

''مجھے ضروری کام ہے ان سے''۔ اس نے رخ پھیر لیا۔

''کہیں تم مجھ سے ناراض......''

''جی جی! ہم اس پر بعد میں بات کریں گے' اور میں آپ سے ناراض نہیں ہوں' ابھی مجھے درگاہ پر جانا ہے اور

بس''۔ اس کی بات سن کر جی جی صاحب چپ ہو گئیں انہوں نے اسے مزید کریدنا مناسب نہیں سمجھا بس انہوں نے خیراں کو سمجھا کر اس کے ساتھ کر دیا۔ لیکن یہ کیا......؟ درگاہ پر پہنچ کر ماجرا کھلا' نہ وہاں بزرگ تھے نہ ان کا حجرہ......وہ سراسیمہ ہو کر اس سمت بھاگی جہاں ان کا حجرہ تھا لیکن وہاں تو خالی میدان تھا اور ایک نیم کا پیڑ۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے نیم کے پتے پر تحریر نسخے کو دیکھا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟ جو کچھ میں نے دیکھا وہ جھوٹ کیسے ہو سکتا ہے' کیا میں نے خواب دیکھا تھا' یا وہ محض ایک خیال تھا؟ لیکن اگر وہ خواب یا خیال تھا تو پھر وہ نیم پتا اس پر لکھا نسخہ......؟ یہ میرے پاس کیسے آیا......؟'' اس نے وہاں پر ایک سے ان بزرگ کے بارے میں پوچھا مگر سب کا ایک ہی جواب تھا کہ ایسا کوئی بزرگ نہیں ہے' وہ گم صم سی ہو گئی۔

''بی بی جی! آپ گھر چلو' آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے''۔ خیراں اس کا ہاتھ تھام کر گاڑی تک لے آئی واپسی کا سفر خاموشی کے سہارے کٹ گیا' جی جی صاحب بڑی بے چینی سے ان کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں۔

صبوحی تو کچھ نہ بولی' اس کی ایسی حالت ہی نہ تھی کہ وہ کچھ بولتی یا بتاتی' البتہ خیراں نے من وعن انہیں سب کچھ بتا دیا۔

''یا اللہ! یہ میری بچی کے ساتھ کیا ہو رہا ہے تو اس پر رحم فرما''۔ انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

☆

اس کائنات کا مالک اللہ

زمین وآسمان چاند سورج پیدا کرنے والا اللہ

رزق بہم پہنچانے والا اللہ

قسمت بنانے والا اللہ

نوازنے والا اللہ

نواز کر چھیننے والا اللہ

''جو کوئی ہے زمین پر فنا ہونے والا''۔

''اور باقی رہے گا (نام) تیرے رب کا بزرگ اور عظمت والا''

دنیا کی ہر چیز فانی ہے' رشتے محبتیں' خوشیاں' دھن دولت اولاد جائیداد' سب فانی ہے' کیونکہ یہ سب مادیت سے تعلق رکھنے والی دنیاوی چیزیں ہیں' یہ ہمیں ایک خاص وقت خاص مدت کے لئے عطا کی جاتی ہیں' پھر ان ہی سے ہماری آزمائش شروع ہوتی ہے' رشتوں میں ہمیں دکھ ملتے ہیں' محبتوں میں بے وفائی' اولاد میں ناقدری اور جائیداد میں نقصان' مگر ہم بھول جاتے ہیں کہ یہ سب تو ہمیں نوازا گیا تھا' ہم اس غم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جو کچھ ہمارا تھا وہ ہم سے چھن کیوں گیا ہم اسے دوبارہ کیسے حاصل کریں......؟ ہم کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہمارا تو کچھ تھا ہی نہیں' سب اس ذات کا دیا ہوا تھا جو سب سے برتر وبزرگی والی ہے' پھر بھی ہم واپس نہیں پلٹتے' توبہ نہیں کرتے' یا شاید بھول جاتے ہیں کہ ہمیں ماتھا ٹیکنا ہے' پھر سے مانگنا ہے' نئی جستجو کرنی ہے پھر سے رب کو راضی کرنا ہے' رب تو اسی انتظار میں ہوتا ہے کہ ہم کیا اس سے مانگیں اور وہ ہمیں نوازے' ایک ہم ہی بے خبر ہوتے ہیں جو صدا بھی نہیں لگاتے اور امید بھی رکھتے ہیں کہ ہمیں سب کچھ مل جائے۔ صبوحی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہاتھ میں وہ سلیٹ جس پر کبھی اس نے م سے میرب۔ م سے محبت اور م سے میرا ٹوٹا دل لکھا تھا' اسے شنو کے الفاظ یاد آئے۔

''آپ نے اپنا قاعدہ م سے کیوں شروع کیا ہے......؟ باقی سب تو الف اللہ سے شروع کرتے ہیں''۔ اس کی

آنکھ سے ایک آنسو سلیٹ پر ٹپک پڑا اور میرب نام مٹ گیا' اب وہ صرف رب لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

وہ رب جسے اس نے کبھی نہیں پکارا تھا' جس سے اس نے کبھی نہیں مانگا تھا' اور نا ہی کوئی شکوہ کیا تھا' اسے تو رب یاد ہی نہیں تھا رب نے اسے بے تحاشہ نعمتوں سے نوازہ' لیکن اس نے کبھی ان نعمتوں پر اپنے رب کا شکر ہی ادا نہ کیا۔

''اور کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے''۔ (سورۃ رحمٰن)

اس نے تو کبھی اپنے رب کو سجدہ بھی نہ کیا نہ وضو کر کے نماز ادا کی' نہ صدقہ کیا نہ خیرات کی...... حویلی کی اونچی دیواروں کے اندر وہ زندگی کے ایک خوبصورت دور میں جیتی رہی' باپ کا پیار' جی جی صاحب کا دلار' آنکھ کے ایک اشارے پر دل کا بہلاوا کرنے والے نوکر چاکر' سیر کرنے کے لئے بڑی بڑی گاڑیاں' اناج سے بھرے پڑے گودام کسی بھی چیز کی تو کمی نہیں دی تھی رب نے۔ پھر بھی کبھی شکرانے کے نفل پڑھنے یاد نہ رہے' نا منہ سے یا اللہ تیرا شکر ہے ادا ہوا۔ وہ رونے لگی۔

''پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے''۔

رب اس سے ناراض ہو گیا اس سے اس کا میرب چھین لیا' اس کا سکون چھین لیا وہ روتی رہی' بلکتی رہی' مگر رب کو پھر بھی یاد نہ کیا' رب کی ذات تو نوازنے کے لئے بھی' اسے تو اپنا ہر بندہ یاد رہتا ہے' وہ ہر اس انسان کی سنتا ہے جو اس سے سچے دل سے دعا مانگتا ہے۔

''اس سے مانگتے ہیں جو کوئی ہیں آسمان اور زمین میں''۔ لیکن اس نے نہیں مانگا اس نے ماتھا نہیں ٹیکا' جھولی نہیں پھیلائی' پھر جی جی صاحب اسے ایک درگاہ پر لے گئیں' وہاں بھی اس نے نماز نہیں پڑھی' کچھ نہیں مانگا' بس میرب کو پکارا' پھر اس پر غنودگی چھانے لگی اور لفظ ٹوٹ کر اس کی زبان سے نکلے۔ اس نے م...... رب کہا رب کو پکارا' نادانستگی میں ہی سہی اس نے رب کو پکارا تھا' اور یہ صدا عرش پر گئی تھی۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے اسے یاد آیا' جب اس نے بزرگ سے پوچھا تھا کہ آپ کون ہیں تو جواب آیا تھا۔

''میں رب کا بندہ ہوں جو بڑا غفور و رحیم ہے''۔ وہ رب کا بندہ تھا' اسے رب نے بھیجا تھا اس کی مدد کے لئے۔ وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھا' لیکن اس نے کہیں پڑھا تھا' ایک کافر کے بارے میں جو صنم نام کے ایک بت کی پرستش کرتا تھا وہ ساری رات بت کے آگے ماتھا ٹیک کر صنم صنم پکارتا تھا اور اسی تکرار کے دوران ایک بار غلطی سے اس کے منہ سے صنم کی بجائے 'صمد' نکل گیا تھا' تب خدا نے فرشتوں کو حکم دیا تھا اس کافر کی مدد کرو...... آج نادانستگی میں ہی سہی اس نے مجھے پکارا ہے اور میں اسے ناامید نہیں کروں گا۔'' وہ بھی تو محبت پرست تھی' میرب کی پجارن اور ایک بار جب یہ پجارن بے خیالی میں اپنے رب کو آواز دے بیٹھی تو انہوں نے اس کی سن لی تھی' وہ بزرگ فرشتہ بن کر اس کے لئے ہدایت لے آئے تھے ان کا نسخہ لفظ 'اللہ' ہی تمام مسائل کا حل تھا' کیونکہ جب انسان اللہ تعالیٰ سے رابطہ بنا لیتا ہے تو اس کا قلب سکون پا لیتا ہے اسے بھی اللہ کی بندگی میں اس کے آگے گڑگڑانے معافیاں مانگنے میں سکون مل رہا تھا۔

☆

شنو کو یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ بھورل اس قدر فریبی اور دھوکے باز تھا' اسے شنو سے سچی محبت نہیں تھی' بس وقت گزاری تھی۔

''تو کیا وہ مجھے اپنی محبت کے جھوٹے جال میں پھنسا رہا تھا؟ چکنی چپڑی باتیں بنا کر مجھے شیشے میں اتار رہا تھا؟ تا کہ میں اس کی باتوں میں آ جاؤں اور پھر جب میں اس کی باتوں میں آ جاتی تو وہ مجھ سے اپنے غلط ارادوں کی

تکمیل کرتا......؟'' اسے سوچ کر ہی جھرجھری آ گئی خود پر غصہ آنے لگا کہ وہ کس قدر پاگل ہو رہی تھی' محض باتوں کی وجہ اس پر پھسل پڑی تھی' محبت کرنے کے لئے تو نا اس کی عمر مناسب تھی اور نا ہی اتنی عقل کہ وہ سچ اور جھوٹ کے مابین فرق کر پاتی۔

چارپائی پر لیٹی وہ خود کو ملامت کر رہی تھی آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کتنی بڑی مصیبت سے بچ گئی تھی یہ اس کے والدین کی دعاؤں کا ہی اثر تھا جو وہ محفوظ تھی' اور ان ہی والدین کی اس نے کبھی قدر نہ کی تھی' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' جنہیں پونچھ کر وہ چارپائی سے اتر کا پیروں میں چپل اڑس کر اس نے غسل جانے کا رخ کیا' پہلے منہ دھویا' پھر ہاتھ' پھر پیر' تولئے سے منہ صاف کر کے وہ باورچی خانے میں آ گئی' وسائی نے سالن پکا لیا تھا' آٹا بھی گوندھ دیا تھا' ان کے ہاں رات کا کھانا مغرب کے وقت کھایا جاتا تھا' تب تک ابا بھی آ جاتے تھے چونکہ مغرب کی اذان ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا شاید یہی سوچ کر وسائی پڑوس میں چلی گئی تھی' شنو نے تو اچڑھا کر روٹیاں بنالیں اور تمام برتن دھو کر کارنس پر سجا دیئے صحن میں جھاڑو لگا کر پانی کا چھڑکاؤ بھی کر لیا۔ چارپائیاں باہر نکال کر وہ بستر لگا رہی تھی جب وسائی گھر میں داخل ہوئی۔ پہلے تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ وہ اپنے ہی گھر میں داخل ہوئی ہے پھر جب شنو کو سنجیدگی و انہماک کے ساتھ چارپائیوں پر بستر لگاتے دیکھا تو حیران رہ گئی۔

''یہ تمام کام تم نے کیے ہیں......؟'' انہوں نے صاف ستھرے صحن پر نظر ڈال کر حیرانگی سے پوچھا۔

''ہاں اماں صرف یہی نہیں میں نے روٹیاں بھی پکا دی ہیں''۔ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا' اسی وقت پیرل بھی گھر میں داخل ہوئے شنو کی بات انہوں نے سن لی تھی۔

''دیکھا وسائی! میری دھی کتنی سگھڑ ہو گئی ہے' تجھے تو خواہ مخواہ ہی شکایت رہتی تھی''۔ ان کے لہجے میں فخر تھا۔

''اب اماں کو مجھ سے کبھی شکایت نہیں ہو گی ابا''۔ وہ کہہ کر کمرے میں چلی گئی۔

☆

اس کی دنیا ہی بدل چکی تھی اس کی محبت' چاہت اور جستجو کو نئے مفہوم مل گئے تھے اس کی عبادت بندگی بس ایک ہی ہستی کے لئے وقف ہو گئی تھی اور وہ آفاقی ہستی اللہ تعالیٰ کی ذات تھی۔ آج سے پہلے اسے اللہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی' اسے اللہ سے اتنی محبت نہیں ہوئی تھی' مگر آج کے بعد اسے لگ رہا تھا اسے بس اللہ سے ہی محبت رہے گی' اسے اللہ کی ہی ضرورت رہے گی۔ وہ اللہ سے دور نہیں جا پائے گی' وہ اللہ سے دوری کا تصور ہی نہیں کر سکتی تھی' اسے اللہ نے سکون دیا تھا' زندگی کا مقصد دیا تھا۔ اسے اللہ سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا' وہ ہر روز پانچ نمازوں اور تہجد کے بعد جب اللہ سے دعا مانگتی تو ان سے ڈھیر ساری باتیں کرتی ان سے اپنے دکھ شیئر کرتی' اپنی نااہلی کے لئے معافی مانگتی' اپنی ناشکری اور بے مقصد حیات پر شرمندہ ہوتی اور توبہ کرتی کہ اس نے سنا تھا توبہ کرنے والے لوگ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہوتے ہیں وہ اللہ سے عاجزی مانگتی' شکر اور صبر مانگتی اس کی زندگی کا یہ بدلاؤ کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ خیراں حیران تھی اور جی جی صاحب مطمئن' صبوحی نے انہیں بھی معاف کر دیا تھا اور دل سے معاف کیا تھا' اسے ان کا کوئی قصور نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے قبول کر لیا تھا کہ جو کچھ ہوا وہ اس کی قسمت میں تھا' وہ اپنی قسمت کی بھی شکر گزار تھی کہ اگر یوں نہ ہوتا تو وہ بھٹکتی ہی رہتی' کبھی راہ راست پر نہ آتی' کبھی اللہ کی محبت نہ پا سکتی' اسے ادراک ہی نہ ہوتا کہ اللہ کی بندگی و اطاعت میں کیسا سکون چھپا ہوا ہے' یہ اس کی قسمت کے دکھ ہی تھے' جنہوں نے اسے اللہ سے ملایا تھا' اس نے عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر طے کیا تھا' اس نے اللہ کو پایا تھا۔

جب انسان اللہ کی راہ پر چلنا شروع کرتا ہے تو پھر اس کے احکام کی پابندی خود بخود زندگی کا لازمی جزو بن جاتی

ہے وہ بھی یہی کوشش کر رہی تھی کہ جتنا ہو سکے وہ اللہ کے احکام بجا لائے' آج تک کی اس کی زندگی بے خبری کی زندگی تھی' احکام خداوندی پر پابندی تو دور کی بات وہ تو روزمرہ کے مذہبی فرائض بھی ٹھیک سے ادا نہ کرتی تھی' اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے کبھی پابندی سے نماز پڑھی ہو' یا تواتر سے کلام پاک کی تلاوت کی ہو' اب جو اس نے صوم وصلوۃ کی پابندی شروع کی تھی تو اسے حقوق العباد بھی یاد آئے تھے' وہ خود تو بے پناہ نعمتوں سے مالامال تھی مگر اسی کے پڑوسی اور گاؤں والے دو وقت کی روٹی کے لئے پریشان' اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ گاؤں والوں کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گی' اس کے اس فیصلے سے جی جی صاحب بھی خوش تھیں' ان کے لئے صبوحی کی خوشیاں ہی اہم تھیں' پہلے کی طرح وہ پھر سے اس کی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتی تھی۔ اس دن بڑے دنوں بعد اسے اپنے گھر میں شنو کی شکل نظر آئی' وہ بدلی ہوئی سی لگ رہی تھی' پہلے کی طرح اس نے ہونق شکل نہیں بنائی ہوئی تھی' بلکہ وہ سنجیدہ اور بردبار نظر آ رہی تھی۔

''صبوحی بی بی! میں نے سنا ہے آپ بہت بدل گئی ہیں' آپ تو واقعی بدل چکی ہیں''۔ وہ صبوحی کے پرسکون چہرے اور حلیے کو دیکھ کر تصدیقی انداز میں کہہ رہی تھی۔

''ہاں...... زندگی میں کچھ لمحے بڑے تغیر پذیر ہوتے ہیں' انسان سر سے لے کر پیر تک ہی نہیں سوچ سے لے کر روح کی گہرائیوں تک بدل جاتا ہے''۔ صبوحی پرسکون تھی شنو اسے دیکھے گئی۔

کیا کوئی کہہ سکتا تھا کہ یہ چند ہفتوں پہلے والی صبوحی ہو سکتی ہے' وہ صبوحی جس کی زندگی میرب سے شروع ہو کر میرب پر ہی ختم ہوتی تھی' جسے دیکھ کر کسی اجڑی بستی یا ویران کھنڈر کا گمان ہوتا تھا' جس کی کھوکھلی ہنسی اور آنکھوں کی وحشت سے وہ ڈر جایا کرتی تھی۔

''صبوحی جی! اتنا سکون کیسے؟ کیا محبت اور انتظار کے بعد بھی سکون کی امید رکھی جا سکتی ہے؟'' نجانے کیوں اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے اسے بھورل یاد آ گیا' اس کی جھوٹی باتیں اور فریبی چہرہ یاد آیا' اسے اپنی تڑپ اور بے وقوفی یاد آئی' اسے انتظار کرنا اور پھر حقیقت سے آگاہی کے بعد دل کا ٹوٹنا یاد آیا۔

''ہاں سکون کی امید ہے راحت کی امید ہے' نجات کی امید ہے' اگر انسان کو اپنی اصلیت اور مقصدیت کا ادراک ہو جائے تو اس کے لئے سکون ہی سکون ہے' اللہ کی محبت اور اللہ کی اطاعت میں سکون ہے' جو اللہ کو خوش رکھتا ہے' اللہ کی بات مانتا ہے' اللہ اسے خوش رکھتا ہے' سکون دیتا ہے''۔ اس کی بات اللہ سے شروع ہو کر اللہ پر ہی ختم ہوتی تھی۔

''کیا آپ میرب کو بھول گئی ہیں صبوحی جی......؟'' اس نے غور سے صبوحی کا چہرہ دیکھا' اس کا رنگ نہیں بدلا تھا نا ہی چہرے کا سکون منتشر ہوا تھا' وہ ویسی ہی پرسکون تھی۔

''میرب میرا شوہر ہے' میرا پیار ہے' وہ مجھ سے روٹھ گیا ہے' لیکن مجھے یقین ہے' میرا رب اسے بھی میرے لئے راضی کر لے گا' وہ ایک دن ضرور لوٹ کے آئے گا' ہاں مگر اس کے لئے جو میری دیوانگی تھی' اس کے عشق میں جس طرح میں نے دنیا کو بھلا دیا تھا' خود سے اور دنیا سے رشتہ توڑ کر ایک اپنا ہی جہاں آباد کر لیا تھا' وہ غلط تھا' کیونکہ دنیا میں جتنی بھی چیزیں ہیں سب فانی ہیں' اس لئے ان کے کھونے کا دکھ نہیں منانا چاہئے' ہمیں اللہ کی رضا میں راضی رہنا چاہئے' ہمیں دعا کرنی چاہئے اس یقین کے ساتھ کہ ایک دن وہ ہماری ضرور سنے گا' ہماری دعائیں قبول کرے گا''۔ گھنٹوں چپ رہنے والی صبوحی کو بے تکان بولتے ہوئے وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی' پہلے وہ لایعنی باتیں کرتی تھی اور اب بامعنی شنو کا دل بھر آیا۔ انسان ٹھوکر کھا کر ہی کیوں سیکھتا ہے اس نے بھی تو ٹھوکر کھائی تھی' فریب کھایا تھا اور محبت کی تھی'

گرچہ اس کی اور صبوحی کی محبت میں بہت فرق تھا' اسے جو چھوڑ کے گیا تھا وہ اس کا شوہر تھا اور جو شنو کو چھوڑ کے گیا تھا' وہ ایک فریبی اور دھوکے باز' ہاں مگر جو ایک قدر مشترک تھی دونوں میں وہ یہ کہ صبوحی نے ٹھوکر کھا کر خدا کو پایا تھا اور اس نے والدین کو' ماں باپ بھی تو خدا کا دوسرا روپ ہیں' جن کی اس نے ہمیشہ حکم عدولی کی تھی' ان کی قدر نہیں کی تھی' خاص طور پر سے ماں کی اس نے کبھی نہ سنی تھی وہ اسے بے جا گھومنے پھرنے سے منع کرتی تھی' گھر میں رہنے کی تلقین کرتی تھی' کام کاج پر دھیان دینے کو کہتی تھی' مگر اس کا تو نا گھر میں دل لگتا تھا' نا کام کرنے کو جی کرتا تھا' اسے گھر سے باہر گشتی کرنے میں لطف آتا تھا' اور پھر اسی مٹرگشتی کے دوران وہ راہ سے بھٹک گئی۔ ماں باپ کی نہ سننے والی نافرمان اولاد کو بھی تو اللہ سزا دیتا ہے' اسے بھی سزا ملی تھی' اس کے دل پر چوٹ پڑی تھی' جس نے اس کے پورے وجود کو بدل ڈالا تھا' وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے سسک پڑی۔

''ارے رے شنو! تمہیں کیا ہوا؟'' اسے اچانک ہی گریہ زاری کرتے ہوئے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''میں بھی گنہگار ہوں' میں نے بھی اپنے والدین کی نافرمانی کی ہے صبوحی جی! کیا پھر بھی آپ کے اللہ مجھے بھی سکون دیں گے......؟'' اس کے معصومانہ سوال پر صبوحی مسکرا دی۔

''میرا اللہ کیوں؟ اللہ تو سب کا ہے' وہ اپنے تمام بندوں سے یکساں پیار کرتا ہے وہ ہر اس انسان سے پیار کرتا ہے جو سچے دل سے اس کی بارگاہ میں معافی کا مطلب گار بن کے حاضری دیتا ہے''۔ صبوحی نے اسے پیار سے گلے لگایا۔

''لیکن صبوحی جی! مجھے تو نہیں پتہ اللہ سے کیسے معافی مانگتے ہیں' اس کی بارگاہ میں کیسے جاتے ہیں کیسے دعا مانگتے ہیں' کہیں میں نے غلط طریقے سے حاضری دی اور وہ مجھ سے ناراض ہو گئے تو......؟'' وہ ڈر رہی تھی۔

''تمہیں اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں' اللہ ہر کسی کی زبان اور انداز کو سمجھتا ہے' باقی جو مذہبی فرائض ہیں ان کی ادائیگی سیکھنا ضروری ہے' جیسے کہ نماز کا طریقہ وضو کا طریقہ''۔ صبوحی نے اسے سمجھایا۔

''تو پھر آپ مجھے نماز سکھائیں گی......؟'' وہ چہک اٹھی۔ صبوحی نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

''اور قاعدہ بھی پڑھائیں گی؟ پتہ ہے بچپن میں اماں مجھے قاعدہ پڑھنے کے لئے ملانی کے پاس بھیجتی تھیں' اور میں وہاں جانے کی بجائے سکھیوں کے ساتھ کھیلنے نکل جاتی' اماں نے بہت سمجھایا' حتیٰ کہ مارا پیٹا' خود جا کر مجھے ملانی کے پاس چھوڑ آتی تھیں لیکن میں پھر بھی نہ پڑھ سکی' میرا دل ہی نہ لگتا تھا ان کاموں میں' مگر سچی بتاؤں اب بہت پچھتا رہی ہوں' اب میرے اندر شوق پیدا ہونے لگا ہے نماز کا' قرآن کا''۔ وہ ہنستے ہوئے دوستانہ انداز میں بتا رہی تھی۔

''جو لوگ پچھتا کر دین کے راستے پر آتے ہیں وہ بہت سی چیزیں بہت جلد سیکھ جاتے ہیں' مجھے یقین ہے تم بھی سیکھ جاؤ گی' بہت جلد' بس تمہاری جستجو سچی ہونی چاہئے' تمہاری چاہت میں کمی نہیں آنی چاہئے''۔ صبوحی نے اسے سمجھایا شنو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔



میرا نام میرب ہے' میرب امام بخش' میں ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا ہوں' ایسے گاؤں کا جہاں کی فضاؤں میں سادگی تھی' اپنائیت تھی' محبت تھی' یکجہتی تھی' میری پرورش بھی انہی اصولوں پر ہوئی' میں ایک ماسٹر کا بیٹا ہوں' چند ہزار کی تنخواہ پانے والے اسکول ٹیچر کا اکلوتا بیٹا' میرا باپ بہت خوددار تھا' اس نے مجھے بھی خودداری کا سبق پڑھایا تھا' میرے گاؤں میں ایک محل تھا اور اس محل میں ایک شہزادی رہتی تھی' اس شہزادی کا نام صبوحی تھا۔ صبوحی اور میں ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے تھے کیونکہ اس کی اور میری ماں سگی بہنیں تھیں اس لئے ہمارا بچپن ایک ساتھ کھیلتے کودتے گزرا'

WWW.PAKSOCIETY.COM

میرا باپ بہت غریب تھا' اس کے باوجود وہ چاہتا تھا کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں' وہ اپنی ضروریات کو پس پشت ڈال کر میرے تعلیمی اخراجات پورے کرتا رہا' پہلے میں نے میٹرک کیا' پھر شہر جا کر کالج میں داخلہ لیا' تعلیم کی طرف میرے اس رجحان نے صبوحی کو بھی تحریک دی' سو اس نے بھی واویلا مچایا کہ وہ بھی شہر جا کے کالج میں داخلہ لے گی' صبوحی کا باپ سخت گیر طبیعت کا مالک نہیں تھا' وہ نرم دل انسان تھا اور صبوحی سے بہت پیار کرتا تھا سو اس نے تھوڑی سی پس و پیش کے بعد اپنی لاڈلی بیٹی کو شہر جانے کی اجازت دے دی' اور مجھے تاکید کی کہ میں اس کا خیال رکھوں' میں اس کا خیال کیسے نہ رکھتا' وہ تو میرے لئے بہت خاص تھی' بہت اپنی' دل کے بہت قریب اور یہ بات اس کے بابا بھی جانتے تھے' ہم نے شہر میں ایک ہی کالج میں داخلہ لیا' وہ گرلز ہاسٹل میں رہنے لگی اور میں بوائز ہاسٹل میں۔ میں اس کا بہت خیال رکھتا تھا' اس کے تمام کام کر دیتا تھا جیسے کہ داخلہ یا امتحانی فارم حاصل کرنے کے لئے لائن میں لگنا یا فیس جمع کرانے کے لئے بینک جانا یا پھر کوئی بک یا نوٹس خرید کر لانا اس کے یہ تمام چھوٹے موٹے کام میں کر دیا کرتا تھا کیونکہ میں اسے تکلیف سے بچانا چاہتا تھا' میں برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ اسے ذرا سی بھی کوفت یا بے زاری ہو' میں اسے بری صحبت سے بچنے کی تلقین کرتا تھا' صرف اچھی لڑکیوں کے ساتھ ایک حد میں رہ کر دوستی کرنے کا مشورہ دیتا تھا' اور وہ بلا چوں چرا کئے میری ہر بات مان لیا کرتی تھی' کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اور میں......؟ کیا میں بھی واقعی اس سے محبت کرتا تھا......؟ اس واقعی کی آج سے کئی سال پہلے ضرورت نہیں پڑی تھی لیکن آج میرا یہ خود سے پوچھنا ضروری ہو گیا تھا کہ کیا واقعی میں اس سے محبت کرتا تھا......؟ میں نے خود کو ٹٹولا اپنے دل کو جانچا وہاں صرف ایک ہی احساس تھا' شرمندگی کا' ندامت کا۔

میرا ذہن پھر سے ماضی کی طرف سفر کرنے لگا' ہم دونوں گریجویشن کے سال اول میں تھے جب ہمارا نکاح کر دیا گیا صبوحی کے بابا جانتے تھے کہ صبوحی کی خوشیاں کس کے دم سے ہیں' وہ ہماری آنکھوں میں ہلکورے لیتی محبت کو پہچان گئے تھے' اس لئے انہوں نے وقت سے پہلے ہی ہمیں ایک دوسرے کا بنا دیا' صبوحی خوش تھی' بے پناہ خوش اور میں......؟ مجھے تو جیسے زمین پر جنت کی نوید مل گئی تھی' رنگ خوشبو ہوا بادل سب ہمارے ساتھ تھے' ہمارے عشق کو جاوداں انجام مل گیا تھا' مگر نہیں انجام تو کچھ اور تھا' بہت انہونا اور بھیانک۔ انجام تو جدائی کا تھا' انتظار کا تھا' ہجر کا تھا' نکاح کے بعد میرے بابا اور اماں کا انتقال ہو گیا' وہ شہر مجھ سے ملنے کے لئے آ رہے تھے اور راستے میں ایک خوفناک ایکسیڈنٹ کے ذریعے ان کی اچانک موت واقع ہو گئی' میں ٹوٹ گیا' بکھر گیا' اکیلا ہو گیا' مگر نہیں مجھے صبوحی نے اکیلا نہیں ہونے دیا' اس نے مجھے سمیٹا' میری دل جوئی کی اور مجبور کیا کہ میں زندگی کی طرف واپس لوٹ سکوں۔ ابھی ہم اس صدمے سے پوری طرح نکل ہی نہ پائے تھے کہ قسمت ایک اور امتحان کے ساتھ ہمارے سامنے آن کھڑی ہوئی صبوحی کے بابا چلے گئے جو دکھ میں محسوس کر رہا تھا وہ اب صبوحی کی زندگی کا حصہ بھی بن گیا تھا۔ میں مرد تھا روتا نہیں تھا' لیکن وہ آنسوؤں کو روک نہ پاتی تھی' اس کی دکھ سے بوجھل آنکھیں مجھے تکلیف دیتی تھیں' ہاں میں اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا' میں برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ صبوحی کو کوئی تکلیف ہو' میرے لئے وہ بہت اہم تھی میری اپنی ذات سے بھی زیادہ لیکن شاید نہیں۔ شاید میں جھوٹ کہہ رہا ہوں' شاید غلط بیانی کر رہا ہوں' اگر وہ مجھے اتنی عزیز ہوتی تو کیا میں اسے یوں رونے بلکنے کے لئے چھوڑ کے چلا جاتا......؟ یہ وہ سوال ہے جو پچھلے کئی دنوں سے میری نیند اڑا رہا ہے' گرچہ اس سے دور ہونے کے بعد میں ایک لمحے کے لئے بھی اسے بھول نہیں پایا' مگر یوں کبھی خود کو میں نے کٹہرے میں نہیں پایا' اپنا احتساب نہیں کیا۔ ہاں میں صبوحی کو چھوڑ آیا تھا' وصل کے لمحات قریب تھے اور میں ان پر ہجر کا نوحہ تحریر کر آیا تھا' بی جی صاحب کی باتوں' ان کے مطالبات اور ان کی تلخ کلامی نے میرے اندر اس قدر غصہ بھر دیا

کہ میں کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر وہاں سے یوں چلا آیا جیسے پیچھے کوئی میرے لئے اہم ہی نہ ہو' میں نے ایک بار بھی صبوحی کے بارے میں نہیں سوچا' اس کے پیار کے بارے میں نہیں سوچا' اس کے دکھ کے بارے میں نہیں سوچا' مجھے لگا بی جی صاحب مجھے مقید کرنا چاہتی ہیں اپنے جاہ و جلال اور شان و شوکت کی قید میں جو مجھے پسند نہیں تھا' میں اپنے گھر کو آباد کرنا چاہتا تھا' میرا اپنا گھر' میرے ماں باپ کا گھر' جہاں میں آزادی سے کچھ بھی کر سکتا تھا' اس وقت مجھے صرف اور صرف اپنی خودداری عزیز ہو گئی تھی میرے لئے انا کا مسئلہ بن گئی تھی اور میں اس کے ساتھ کوئی سودا نہیں کر سکتا تھا' محبت کا سودا بھی نہیں' میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کو سبوتاژ کر دیا۔ وہ گاؤں' وہ محبت کا دیس وہ محبت کی یادیں بہت پیچھے رہ گئیں اور میں آگے نکل آیا' میں شہر آ گیا' یہاں میری پہچان کا کوئی نہ تھا سوائے مہران کے' مہران یونیورسٹی کے زمانوں سے میرا دوست تھا' وہ میرے اور صبوحی کے تعلق کی گہرائی سے بخوبی واقف تھا' اس لئے وہ میرے خلاف تھا' میرے فیصلے کے خلاف تھا' اس نے مجھے بہت سمجھایا کہ میں لوٹ جاؤں' لیکن میں نے اس کی ایک نہ مانی' اور وہاں جاب شروع کر دی۔

مہران آفس میں جاب کرتا تھا اور میرے لئے بھی آفس میں ہی جاب دیکھنا چاہتا تھا' لیکن میں نے اسے منع کر دیا میں علم دوست انسان تھا' میری رگوں میں ایک استاد کا خون گردش کر رہا تھا' سو یہاں بھی میں نے اپنے لئے وہی پیشہ اختیار کیا' میں ایک کالج میں پڑھانے لگا' زندگی پھر بھی سہل نہ تھی' غم روزگار کا اہتمام ہو گیا' مگر غم جاناں نے پیچھا نہ چھوڑا' اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے گھومتے پھرتے ہر عمل میں کہیں نہ کہیں صبوحی کی یاد جاگ اٹھتی تھی' میری کتابوں میں اس کا چہرہ اگ آتا تھا' میں جب کالج میں لیکچر کے دوران کلاس پر نظر دوڑاتا تو مجھے ہر سیٹ پر ایک ہی چہرہ نظر آتا صبوحی...... وہ ٹکٹکی باندھے مجھے محبت سے تکتی رہتی اور میں اپنے اندر گلٹ محسوس کرتا' مجھے ہر روز اپنے اندر سے ایک آواز آتی کہ واپس چلا جاؤں اور میں ہر روز کوشش کرتا کہ اس آواز کا گلا گھونٹ دوں' یا پھر آواز نکالنے والے کی زبان ہی کاٹ دوں' لیکن میں اپنے ضمیر کا گلا کیسے گھونٹ سکتا تھا' وہ تو میرے اندر بیٹھا تھا' میری ہی دوسری پرچھائی تھا مہران مجھ سے اکثر لڑتا تھا اور ایک ہی بات دہراتا تھا۔

"لوٹ جاؤ میرب......" اور میں کہتا۔

"تم ایک ہی بات کیوں دہراتے ہو......؟" وہ کہتا۔

"اور تم ایک ہی ضد کیوں کرتے ہو......؟"

"میں ضد نہیں کرتا میری اپنی لوجک تھی"۔

"بہت ہی بے بنیاد منطق ہے' جس کی کوئی حقیقت نہیں"۔

"حقیقت تم جانتے ہو......؟" میں اسے یاد دلاتا۔

"ہاں لیکن میں محبت کو ہر حقیقت سے بڑھ کر مانتا ہوں"۔ وہ زور و شور سے کہتا اور میرے اندر سے اسی زور و شور سے سوال سر ابھارتے' میں محبت کو کیا مانتا ہوں......؟ لوگ محبت کے لئے قربانیاں دیتے ہیں اور میں محبت کو ہی اپنی خودداری اپنی انا اور ضد پر قربان کر کے آیا ہوں' یہ جواب مجھے بہت تکلیف دیتے' مجھے اندر سے مار دیتے' فق کر دیتے' میرے ہونٹوں پر چپ کے قفل چڑھا دیتے۔ پر میں اپنی انا کے آگے پھر بھی سر نہ اٹھا پاتا' میں اس کے قدموں میں تھا' میں اس کا ان دیکھا حصار توڑ نہ پاتا' میری ضد کا دام صیاد کچھ اتنا مضبوط تھا کہ میں عشق کی صداؤں کو سن نہ پا رہا تھا' یا پھر سن کے ان سنا کر دیتا تھا۔ دو پانچ آٹھ پورے گیارہ مہینے ہو گئے' میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا میں محبت کی آنچ سے پگھل نہ سکا' کیونکہ میں اپنے اصولوں کی برفانی چوٹیوں پر بہت دور تک سفر کر بیٹھا تھا' میں اکیلا تھا تنہا تھا' لیکن میرے

اندر جو بیٹھا تھا میرا ضمیر وہ چپ نہیں بیٹھا تھا۔

"تم خود پسند ہو، تم خود پرست ہو تمہیں اپنی پرواہ ہے"۔ مجھ پر کوڑے برستے۔ میں سہتا رہا، لیکن آخر کب تک......؟ میں بھی تو انسان تھا، میرے سینے میں بھی دل تھا وہ دل جس نے محبت کی تھی، کسی سے عہد کئے تھے میں اس محبت کو آخر کس قدر فراموش کرتا، میں وہ عہد آخر کب تک بھلانے کی کوشش کرتا رہتا؟ میرے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونا شروع ہوئی تھی مہران نے کہا تھا۔

"محبت Sacrifice ہے، Devotion ہے، Dedication ہے، یہ کوئی Constitutional Law نہیں، جس میں آپ اپنی مرضی سے ترامیم مقرر کریں گے محبت کسی قاعدے کی پابند نہیں محبت آزاد ہے، اسے اصولوں کی بھینٹ مت چڑھاؤ"۔ اس کے لفظوں نے دیر سے ہی سہی مجھے جھنجھوڑ ضرور دیا تھا، میں کہاں جا رہا تھا؟ کہاں سفر کر رہا تھا؟ کس نگر کو بھٹک رہا تھا؟ جو میرا تھا میں اس سے کیوں بھاگ رہا تھا میں خود اپنے دل کی نفی کیوں کر رہا تھا میرے لئے جو اہم تھا میں اس سے انکاری کیوں تھا؟ یہ سب کر کے مجھے کیا ملا تھا؟ دکھ، تنہائی اور گناہ کا بوجھ...... ہاں صبوحی کو چھوڑ کر میں نے تنہائی ہی تو پائی تھی، دکھ ہی تو اپنایا تھا، اور اپنے دل پر گناہ کا ایک بوجھ ہی تو لیا تھا، میں اسے اور خود کو تکلیف پہنچا کر آخر اپنے کس جذبے کی تسکین کر رہا تھا؟ جب یہ طے تھا کہ میں اس کے لئے اور وہ میرے لئے تھی تو پھر میں کس چیز سے بھاگ رہا تھا؟ اس کے تو شرعاً بھی مجھ پر حقوق تھے، وہ میری منکوحہ تھی، میری زوجہ تھی، پھر بھی میں اسے چھوڑ آیا تھا، کس کے سہارے؟ کس کے آسرے......؟ میں نے تو اپنا کوئی نشان بھی نہ چھوڑا تھا، نہ پلٹ کر اس کی خبر لی تھی، آخر میں اسے کس بات کی سزا دے رہا تھا؟ کیا اس کا اتنا بھی حق نہ تھا کہ میں ایک بار جا کر اس سے بات کرتا اس سے پوچھتا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ آخر میں اتنی ذرا سی بات پر آگ بگولہ کیوں ہو گیا؟ میرے اندر کوئی چلا رہا تھا، مجھ سے سوال کر رہا تھا، میرا احتساب کر رہا تھا اور میں سر جھکائے مجرموں کی طرح کٹہرے میں کھڑا تھا، ہاں میں مجرم ہی تو تھا، اور میری یہی سزا تھی، کہ میں اپنے ضمیر کی ملامت سہتا۔ میں رویا، بہت رویا، میں پہلے کبھی نہ رویا تھا، مگر اس رات میں بہت رویا مجھے اپنا آپ بہت کمزور نظر آ رہا تھا، میں اپنی ضد کا غلام تھا۔ اور آج...... خود پسندی، خود پرستی کا جال ٹوٹا تھا، میں نے کھل کر سانس لیا تو بہت سی باتوں کے مفہوم مجھ پر آشکار ہوئے، میں نے کھلی آنکھوں سے حقیقت کو دیکھا اور میں نے تسلیم کیا کہ میں غلط تھا، مجھے واپس جانا تھا، مجھے واپس اپنی صبوحی کے پاس جانا تھا۔



"تم آ گئے میرب......؟" صبوحی کے ہاتھ میں کلام پاک تھا اور سامنے اس کا میرب، جسے وہ پورے دو سال بعد دیکھ رہی تھی۔

"تم آ گئے میرب! بالآخر تمہیں میرے اللہ نے میرے پاس بھیج دیا"۔ اس نے تاک پر قرآن پاک رکھا، شاید وہ ابھی ابھی تلاوت کر کے اٹھی تھی۔ اس کا پاک صاف چہرہ دوپٹے کے ہالے میں اور بھی شفاف دکھ رہا تھا، میں نے اسے حیرانگی سے دیکھا میں اسے شادی کی رات چھوڑ کے چلا گیا تھا، اسے بتائے بغیر غائب ہو گیا تھا، اور اس کے بعد اس سے کوئی رابطہ بھی نہ رکھا تھا، نہ اس کی کوئی خبر لی تھی، اس بے چاری کو تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ اسے کس جرم کی سزا ملی ہے، اس کا محبوب شوہر اسے بتائے بغیر کہاں چلا گیا ہے؟ اور اب جب میں ایک عرصے بعد اس کے سامنے آیا تھا تو وہ اتنی پرسکون کیسے تھی؟ نا کوئی شکوہ و شکایت نا حزن و ملال نہ آنسو نہ آہ و بکا نا حیرانگی نا کوئی سوال یہ صبوحی ہی ہے ناں......؟

"مجھے یقین تھا میرا اللہ تمہیں ضرور میرے پاس واپس بھیجے گا"۔ اس کے چہرے پر سکون تھا، یقین تھا، اطمینان تھا، جیسے اسے پتہ ہو ایسا ایک دن ہونا ہی تھا۔

"صبوحی! تم مجھ سے ناراض تو نہیں......؟" صبوحی کو نارمل دیکھ کر مجھے شک سا ہوا، کہیں وہ مجھ سے ناراض تو نہیں اور یہ سب اس کی ناراضگی کا اظہار تو نہیں۔

"نہیں میرب! میں تم سے ناراض کیسے ہو سکتی ہوں، میں تو اس وقت بھی تم سے ناراض نہیں تھی، جب تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے، ہاں غم ضرور تھا، مگر پھر میں سنبھل گئی، مجھے ہدایت مل گئی، مجھے سکون میسر آ گیا"۔ وہ دو قدم چل کر میرے قریب آئی۔

"میں جانتا ہوں صبوحی! میں نے تمہیں بہت غم دیئے، تمہارے ساتھ ناانصافی کی، میں نے اپنی انا خودداری کو تم پر ترجیح دی، میں نے تم......"

"میرب! یہ سب گزری ہوئی باتیں ہیں کیا ضروری ہے آج کے دن ہم انہیں دہرائیں"۔ اس نے تیزی سے میری بات کاٹی۔

"لیکن میں پشیمان ہوں صبوحی! میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے"۔ میں نے اپنی بات پر زور دیا، مجھ سے اس کا یوں پرسکون انداز ہضم نہیں ہو رہا تھا، میں چاہتا تھا وہ مجھ سے لڑے، مجھ سے شکایت کرے، اس ایک ایک پل کا حساب مانگے جو اس نے میری جدائی میں عذاب سہے تھے۔ وہ مجھے دھتکارے، سخت سست سنائے، یوں آسانی سے مجھے معاف نہ کرے۔

"تم اپنی غلطی پر پچھتائے میرب! میرے لئے وہ پچھتاوا ہی کل اثاثہ ہے"۔ اس کی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔ اسی وقت جی جی صاحب بھی وہاں آ گئی تھیں میں ان سے بھی شرمندہ تھا، ان سے معافی مانگنا چاہتا تھا، مگر انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا، الٹا وہ مجھ سے ہی نادم تھیں اپنے رویئے کے لئے۔

صبوحی نے حویلی چھوڑ دی، وہ میرے ساتھ میرے گھر آ گئی، ہم نے مل کر اس گھر کو آباد کیا، دیر سے ہی سہی ہمارے سینے بچ ہوئے، میں جو صبوحی سے پہلی بار مل کر اس کی پرسکون حالت پر حیران ہوا تھا وہ عقدہ بھی کھلا۔ صبوحی دین کی راہ میں آ گئی تھی، اسے اللہ سے عشق ہو گیا تھا، وہ اللہ کے لئے جینے لگی تھی، اسے یہ سکون بھی اللہ نے ہی بخشا تھا۔ اس کی پارسائی، اس کا تقوٰی، اس کا ایمان، اس کی عبادت، اس کا لگاؤ، اس کا ہر عمل متاثر کن تھا، اب وہ اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے جیتی تھی۔ اس نے گاؤں والوں کو غربت سے بچانے اور بے روزگاری ختم کرنے کے لئے ایک شوگر مل تعمیر کروانے کا کام شروع کیا تھا، مشینری خریدنے کے لئے اس نے اپنی آٹھ سو ایکٹرز زمین بیچ دی تھی، باقی کی پانچ سو ایکٹرز زمین میں اس نے گنا لگانے کا فیصلہ کیا تھا، تا کہ امپورٹ پر پڑنے والے ٹیکس اور اخراجات سے بچا جا سکے اور گاؤں والوں کو زیادہ سے زیادہ منافع دیا جائے یہ شوگر مل تعمیر کے آخری مراحل میں تھی اس کے علاوہ صبوحی نے بچوں کی دینی و دنیاوی تعلیم کے لئے حویلی کے ایک حصے میں مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس کی نگرانی وہ اور میں دونوں مل کر سنبھالنے لگے۔ مجھے صبوحی کا یہ روحانی بدلاؤ اور تعمیری سوچ بہت اچھی لگی وہ دین اور دنیا میں ایک توازن کے ساتھ چل رہی تھی، جس میں ہم دونوں نے اپنی زندگی سوشل ورک کے لئے وقف کر دی تھی، سارے گلے شکوے مٹ گئے تھے، زندگی سہل ہو گئی تھی۔ صبوحی نے ایک سال کے اندر ہی مجھے ایک خوبصورت بیٹے کا تحفہ دیا تھا، میں رب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے ہماری زندگیوں کو سنوار دیا۔



ایمان علی

ناولٹ

زندگی کے رنگ

جون کی اس تپتی انگارے برساتی دوپہر میں صور اسرافیل کی مانند بجتی گھنٹی گھر میں پھیلی ہوئی چہار اطراف میں خاموشی اور سناٹے کو چیرتی کسی بم کی طرح آن پھٹی تھی اور پھر پھٹتی ہی چلی گئی۔ اپنے کمرے میں تخت پہ اونگھتی اماں بی جیسے کرنٹ کھا کر ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھیں۔



"ہائے اللہ زلزلہ تو نہیں آ گیا زمین تو نہیں پھٹ گئی"۔ وہ آنکھوں میں وحشت لئے ہاتھ سینے پر دھرے دہل کر نگاہیں نیچے فرش پر جمانے لگیں۔ مگر یہ کیا نگاہیں فرش سے سجدہ ریز ہوتی صحیح سلامت لوٹ آئیں تو راز فاش ہوا کہ نہ زلزلہ آیا ہے نہ زمین پھٹی ہے بلکہ باہر گیٹ پر لگی بیل کی قسمت پھوٹی ہے۔

"نہ جانے کون منحوس آ ٹپکا ہے"۔ اماں بی جلے بھنے انداز میں بڑبڑائیں، گھنٹی ہنوز بجتی جا رہی تھی۔

"نصیبو او نصیبو! جا کر دیکھو کون آیا ہے؟" اماں بی نے بلند آواز نصیبو (ملازمہ) کو لگائی مگر جواب نہ آیا۔

"اری نصیبو! جا دروازہ کھول سر اب پھٹ رہا ہے شور سے"۔ تاؤ کھا کر بولی تھیں۔ مگر اب کی بار بھی ان کی صدا واپس مایوس ہو کر پلٹ آئی اور کوئی نصیبو کے آثار نہ آئے تو خود ہی کلس کر تخت کے نیچے پاؤں کر کے اٹھنے کی سعی کرنے لگیں ان کے کان لگاتار گھنٹی سے جھنجھلاتے جا رہے تھے۔

"ناس پیٹی نگوڑ ماری موئی! تیرا آج ہی اس گھر سے دانہ پانی اٹھواتی ہوں، تو آ تو سہی، کچھ دیر کیا سوئی مجھے مردہ سمجھ کر میرے پیچھے مجھے چکما دے کر گھر سے نکل گئی ہے آج تیرے گوڈے گوڈے پیسوں گی"۔ اماں بی نصیبو کو لفظ چبا



چبا کر صلواتوں کے تحفے نوازتیں بالآخر ہانپتی کانپتی پھولتے سانس سے گیٹ پر پہنچ گئیں۔ جیسے گیٹ کا دروازہ وا کیا تو شرفو گوالے والا دانت نکالتا دکھائی دیا' اماں بی پل بھر میں چیں بہ جبیں ہو گئیں۔

''سونے یا چاندی کی گھنٹی نہیں ہے جو اسے بجا بجا کر اکھاڑ رہے ہو''۔ اماں بی نے نصیبو کا سارا غصہ اس پر انڈیلا۔

اماں بی کی بات سن کر وہ سر تا پیر سلگ اٹھا غصے کے مارے گال پچکنے لگے تھے۔

''اماں بی! آپ اپن کو چور کہہ کر اپن کی انسلٹ مت کرو۔ ارے اپن شرفو گوالا ہے جو روز نوٹوں سے کھیلتا ہے اپن ایسی ہزار گھنٹیاں لے سکتا ہے اپن کوئی چور نہیں کیا سمجھے''۔ وہ فلمی اسٹائل سے کہتا اماں بی پر اپنی امیری جتانے بیٹھا۔

''کالے کوے کی اکڑ تو دیکھو''۔ اماں بی دل ہی دل میں اس کے کالے رنگ پر چوٹ کر کے بڑبڑائیں۔

''اچھا سعودی عرب کے امیر شیخ فرما کیوں اس بھری تپتی دوپہر میں آئے ہو عذاب بن کر''۔ دوپٹے سے پیشانی کا پسینہ پونچھتی اماں بی آخری دو لفظ اتنی آہستگی سے بولیں تھی کہ شرفو کے پلے نہ پڑے۔ شرفو نے اپنی جیب سے تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور اماں بی کی طرف بڑھایا۔

''یہ کیا ہے......؟'' اماں بی متعجب ہوئیں۔

''بل ہے اور کیا ہے اب میں آپ سے عشق لڑا کر آپ کو لو لیٹر تو دینے سے رہا''۔ وہ آخر میں قہقہہ لگاتا ہنس رہا تھا۔

''کر لیا مخول اب دفع ہو جاؤ''۔ اماں بی دل میں اسے لعنت بھیجتی بھنا کر دروازہ بند کرنے لگیں گرمی کے مارے اب مزید کھڑے ہونے کا ان میں دم نہیں تھا۔

''مگر اماں بی! میرے پیسے......'' مسکین صورت بنائے اس نے اپنا دکھڑا رویا۔

''ارے مل جائیں گے کل تمہارے پیسے' تمہارے چند ہزاروں سے اب ہم تاج محل تو خریدنے سے رہے''۔ طنزیہ پتھر اس کی طرف اچھالتی شرفو کا جواب سنے بغیر کھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔

''بڑا آیا مجھ سے مخول کرنے والا کوا''۔ گیٹ سے لے کر لاؤنج تک اسے گالیوں سے نوازتی آئی تھیں لاؤنج میں پنکھے کے نیچے صوفے پر بیٹھ کر وہ اپنی کھولن پر قابو کرتی آنکھیں موندیں ستانے لگیں کہ قریب سے ایک آہٹ پر پٹ آنکھیں کھول کر بیرونی دروازے پر نگاہیں جمائیں' نصیبو اپنا پراندہ ہاتھوں میں اسٹائل سے ملائیکا اروڑا بنی بڑے مگن سی آ رہی تھی۔ جیسے ہی نگاہیں سامنے گئیں تو حیرت سے اچھل پڑی۔

''ام...... اماں بی آپ......؟'' وہ حیرت سے چیخی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اماں بی اتنی جلدی اٹھ جائیں گی' اب اسے اپنی شامت بنتی آب و تاب سے نظر آ رہی تھی۔

''ہاں میں' کیا میرے سر پر سینگ اگ آئے ہیں جو منہ پھٹ گیا ہے''۔ اماں بی دھاڑیں۔

''نہیں...... نہیں اماں بی! وہ...... وہ......'' گھبراہٹ کے مارے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا اس کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔

''ادھر آؤ بتاؤ' ہو گئے سکھی سے مذاکرات ختم' مل لیا بانو سے''۔ وہ پڑوسن کی ملازمہ کا حوالہ دیتی استفسار کرنے لگیں۔ نصیبو بے بسی سے نیچے سر جھکائے لب کاٹنے لگی کون نہیں جانتا تھا کہ اماں بی طنز کرنے پر اتر آئیں تو ایسے طنز کے چن چن کہ پتھر مارتی تھیں کہ بندے پر شرم سے گھڑوں پانی پڑ جاتا تھا۔

''ارے اب بول بھی چکو کیا دو گز کی لمبی زبان بھی سکھی کو سوغات میں دے آئی ہو''۔ اماں بی اسے خاموش کھڑے دیکھ کر لتاڑتی برس پڑیں۔ نصیبو دو گز لمبی زبان کا خطاب سن کر اندر ہی اندر بلبلا اٹھی مگر پہلے ہی عدالت لگی ہوئی تھی سو نہ چاہتے ہوئے بھی صبر کا گھونٹ پینا پڑا۔

''چھوڑیں اماں بی یہ بے کار کی باتیں' آئیں میں آپ کی ٹانگیں دباؤں''۔ نصیبو فرمانبرداری کے ریکارڈ توڑتی جیسے ہی اماں بی کے پیروں میں بیٹھنے کو جھکی تو ٹھاہ کر کے اماں بی نے اپنا پیر اس کے کندھے پر دے مارا۔ نصیبو منہ بسورتے اپنا شانہ سہلاتی رہ گئی۔

''ہٹ یہاں سے بڑی آئی ہے میری خدمتیں کرنے والی' میں پوچھتی ہوں ایسے کونسے راز و نیاز ہیں جو تو گھڑی گھڑی پھدک اٹھتی ہے بانو سے ملنے کو بہت کر لیا برداشت آج ہی تیری ماں کو بلا کر تجھے چلتا کرتی ہوں''۔ اماں بی نے کڑے تیور سے اس پر نظریں وارتے اس پر جرم عائد کر دیا۔

''کیا...... نہیں نہیں اماں بی! ایسا مت کریں میں وعدہ کرتی ہوں آئندہ میں بغیر اجازت کے ایک قدم بھی باہر نہ جاؤں گی' آپ اماں کو کچھ نہ کہنا''۔ نصیبو روتے روتے اماں بی کے پیروں میں گر گئی اس کی ماں تو اماں بی سے 10 قدم آگے تھی مارنے میں۔

''اماں! میرا کچا قیمہ بنا دے گی میرے گلے پر چھری پھیر دے گی' اماں بی! مجھے معاف کر دو آخری بار''۔ وہ روتے روتے ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگنے لگی ڈر کے مارے اس کے چہرے سے ہوائیاں اڑتی جا رہی تھیں۔

''تیری اس موٹی گردن پر چھری تو کیا آری میں بھی پھیر سکتی ہوں مگر نہیں تو آخری واری کا وعدہ کر رہی ہے تو آخری واری معاف کیا ہے' اگر آئندہ ایسا ہوا تو تیری ٹانگیں توڑ کر پیس کر اس کا سرمہ بنا کر تیری ان چندھی آنکھوں میں ڈالوں گی' اٹھ اب یہ مگرمچھ کے ٹسوے بند کر''۔ اماں بی نے کوفت اور بے زاری سے حکم صادر کیا تو نصیبو نے جھٹ آنسو پونچھے۔

''اماں بی! یہ بیگم صاحبہ اور چھوٹی بی بی جی ابھی تک نہیں لوٹیں''۔ نصیبوں ادھر ادھر نگاہیں کرتی بولی۔

''ارے کہاں تشریف لائیں گی' دونوں ماں بیٹی صبح کی گئی اب شام کے پانچ کر بیٹھی ہیں خدا جانے خریداری کرنے گئی ہیں یا بازار خریدنے''۔ اماں بی ٹھنڈی آہ بھرتی وال کلاک کی طرف دیکھتے بولی تھیں۔

''اچھا اب مجھے اٹھائے گی کمرے میں لے جانے کے لئے یا نہیں''۔ اگلے ہی لمحے اماں بی نے اسے گھر کا تو وہ ہڑبڑا کر سیدھی ہو گئی اور اماں بی کو سہارا دینے اٹھی۔

☆

بازار کے اژدھام بھیڑ میں مکھ پہ بے زاری اور کوفت سجائے عبدنا' ماں کے پیچھے خراماں خراماں قدم آگے گھسیٹ رہی تھی۔ نازیہ جیسے ہی شوز شاپ کی طرف لپکنے لگیں تو اب کی بار عبدنا احتجاج کئے بغیر نہ رہ سکی۔

''ممی پلیز اور کتنی شاپنگ کریں گی پہلے ہی دس شاپر آپ نے ڈرائیور کو تھما رکھے ہیں ممی! اب گھر چلیں نا اماں بی غصہ ہوں گی اتنا ٹائم ہو گیا ہے''۔ اس نے فکرمندی سے ماں کو اماں بی کے طیش کی طرف توجہ دلانی چاہی مگر وہ بھی نازیہ تھی ساس سے خدا واسطے کا بیر تھا اس کا تجاہل عارفانہ عروج پر تھا' عبدنا کی بات پر آنا کانی کرتی شاپ کے اندر گھس گئیں۔

''اف......'' عبدنا نے ماں کی حرکت اور استفسار پر پاؤں پٹخا اور مرتا نہ کرتا کہ مصداق شاپ کے اندر گھس گئی۔

☆

شام ڈھلے جب دونوں ماں بیٹی گھر لوٹیں تو لاؤنج میں بیٹھی سرخ سرخ آنکھوں سے کھا جانے والی نظروں سے گھورتی اماں بی کو دیکھتے دونوں کی سٹی گم ہو گئی۔

''کر آئی سیر سپاٹے''۔ اماں بی لہجے میں درشتی سموئے استفسار کر رہی تھیں۔ عبدنا نے مارے گھبراہٹ سے ماں















کی طرف دیکھا جو خود بھی اماں بی کو دیکھ کر ٹپٹا گئی تھیں' وال کلاک پر سات کا ہندسہ چمک رہا تھا اور یہ ٹائم اماں بی اپنے کمرے میں ساس بہو کے ڈرامے ملاحظہ فرماتی تھیں سو نازیہ کے ذہن میں بھی یہی تھا مگر ہائے قسمت۔

ابھی نازیہ کوئی بہانہ جوئی کے لئے الفاظ زبان پر لانے کو ہی تھی کہ ڈرائیور ڈھیر سارے شاپرز اٹھائے اندر آیا اور صوفے پر سجانا شروع کر دیئے۔

''ہائے اللہ مر جاؤں اتنا سامان''۔ اماں بی کے منہ سے حیرت سے چیخ نکل آئی۔

''ستیاناس ہو تم دونوں کا میرے بیٹے کی لاکھوں کی کمائی ان اگڑم بگڑم چیزوں پر لٹا آئی ہو' اری نازیہ کم بخت تیرا بیڑہ غرق ہو''۔ اماں بی پھپک پھپک روتی بددعاؤں پر اتر آئیں۔

''ام...... اماں بی! آپ کے بھی چار پانچ سوٹ ہیں''۔ عہدنا بوکھلا کر بول اٹھی تو نازیہ کے اوسان خطا ہو گئے۔

''اچھا...... میرے سوٹ بسم اللہ...... پوتی ہو تو تم جیسی' لاؤ دیکھوں کون سے لائی ہو''۔ وہی اماں بی جو پہلے صلواتوں پر اتر کر کوسے جا رہی تھیں اب فوراً راگ بدل گئیں' ان کی خوشی دیدنی تھی۔ عہدنا مرے مرے قدموں شاپر لئے اماں بی کو دکھانے لگی' ماں کی طرف دیکھے بغیر ہی اسے پتہ تھا کہ نازیہ اسے خون خوار نظروں سے تاڑ رہی ہیں' اماں بی کپڑوں کو دیکھتیں اور ناپسندیدگی میں سر ہلاتی مسترد کرتی جا رہی تھیں مگر آخر کار انہیں تین شاہکار پسند آ ہی گئے' یہ وہ تین لان کے سوٹ تھے جو نازیہ نے خاص طور پر اپنی پسند پہ لئے تھے۔ پاس صوفے پر بیٹھی نازیہ لال بھبھوکا چہرہ لئے پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔

''دیکھا یہ ہوتی ہے بہو بیگم! محبت جو میری پوتی کو مجھ سے ہے تم سے تو میرے لئے ایک چپل بھی نہ لی گئی''۔ اچانک اماں بی نے نازیہ کی طرف رخ پھیر کر اسے گھر کی دی تو وہ جز بز ہوتے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

''اسے کیا ہوا......؟'' اماں بی متحیر رہ گئیں' تو عہدنا نے علم ہوتے بھی لاعلمی سے شانے اچکائے۔



گرمیوں کی تپتی دوپہریں اور باد سموم دن بھر گویا انگارے برساتے رہتے تھے اوپر سے دن بھر لوڈ شیڈنگ کی آنکھ مچولی بھی اپنے عروج پر تھی' اس وقت وہ باہر صحن میں بیٹھیں واپڈا والوں کو صلواتیں کے ساتھ ساتھ شیطان ابلیس کے القابات سے نواز رہی تھیں کہ اندر اپنے کمرے سے نکلتی نیند سے بوجھل آنکھیں لئے عہدنا دھپ سے ان کے قریب آ گری۔

''ہائے اماں بی!'' اس نے لیٹے لیٹے کسلمندی سے سلامتی بھیجی' مگر اماں بی بات کو اپنے تئیں لے گئیں۔

''ہائے اللہ...... میری بچی کیا ہوا تجھے......؟ بتا کہاں درد ہے......؟'' وہ اس پر جھک کر اس کا وجود ٹٹولنے لگیں۔

''اف......'' عہدنا زچ ہو گئی۔

''یہ میں نے تکلیف والی ہائے نہیں بلکہ سلام والی ہائے کی ہے پر آپ کو کیا پتہ انگریزی زبان کا''۔ عہدنا جھلا کر بولی۔

''ہاں تو تو پیدائشی انگریجی حافظہ ہے نا چل ہٹ بڑی آئی آپ کو کیا پتہ''۔ اماں بی نے اس کے سر پر جھانپڑ لگاتے نقل اتاری' عہدنا منہ کے زاویے بگاڑ کر سر سہلانے لگی۔

''ایک تو یہ منحوس ماری بجلی بھی نہ جانے کب آئے گی' اس موئے جنریٹر کا پٹرول بھی آج ختم ہونا تھا ہائے میرا ڈرامہ''۔ اماں بی نے روہانسی ہو کر اپنا دکھڑا رویا۔ عہدنا نے بجائے تسلی دینے کے آنکھیں موندیں' نیند اس کے سر پر سوار ہوتی جا رہی تھی۔

''ارے چندا ذرا بات سن''۔ اماں بی اس پر جھکیں۔

''ہوں......'' عہدنا نے ہنکارا بھرا۔

''یہ تمہاری ماں کیا اندر مایوں میں بیٹھ گئی ہے' غضب خدا کا چھ بجنے کو ہیں مگر یہاں تو چائے ملنے کے آثار تک نہیں''۔ چاہے کتنی بھی گرمی ہو اماں بی چائے چھوڑنے کو گناہ ہی سمجھتی تھیں سو اس وقت بھی چائے کی بے تابی چھلکی۔

''ممی...... ہاں وہ ممی اندر نغمہ آنٹی سے فون پر بزی ہیں''۔ عہدنا نے سوچتے ہوئے بتایا۔ اماں بی طیش میں آ گئیں۔

''ہائے ہائے میں بھی تو کہوں یہ آج کل فون کے اتنے لمبے لمبے بل کیوں آ رہے ہیں اب پتہ چلا تمہاری ماں فون پر تقریریں کرتی پھرتی ہیں' ارے بل بھروا بھروا کر میرے بیٹے کو کنگال کرے گی تیری ماں' ہائے میرا بچہ عمر''۔ وہ متاسف ہو کر دہائیاں دینے لگیں۔

''ارے چندا! سنتی ہے نا ماں کے کرتوت......'' اس نے عہدنا کا شانہ ہلایا تو بے سدھ ہوئی عہدنا کو دیکھ کر سلگ اٹھیں۔

''دفع ہو جاؤ تم ماں بیٹی خوامخواہ بول بول کر حلق پھٹ گیا''۔ خود کلامی کر کے وہ بھنائی تھیں۔



رات ڈنر کے ٹائم وہ جیسے ڈائننگ ٹیبل پر آئے تو ڈائننگ ٹیبل پر خالی پلیٹیں اور رکابیاں ان کا منہ چڑا رہی تھیں۔

''نازیہ! ابھی ڈنر تیار نہیں ہوا کیا......؟'' عمر صاحب کچن کی طرف دیکھ کے بولے جہاں نازیہ موجود تھیں۔

''میں بس پانچ منٹ میں آئی''۔ نازیہ کچن سے گنگنائی تھیں۔ اسی اثناء میں عمر صاحب کے سیل کی بیپ بجی تو وہ ٹیبل سے اٹھ کر کال اٹینڈ کرنے دور چلے گئے۔

''ممی! آج ڈنر میں کیا مینو ہے......؟'' عہدنا نے پلیٹ پہ چمچہ مارتے ترنگ میں استفسار کیا ڈائننگ ٹیبل کچن کے فاصلے پر ہی تھی سو آواز بخوبی جا اور پہنچ رہی تھی۔

''فرائی فش' چکن قورمہ' چائنیز چاول اور میٹھے میں کھیر''۔

''اوہ نو ممی......'' عہدنا نے منہ بسورا سوال جس اشتیاق سے پوچھا تھا جواب سن کر وہ اتنا ہی بدمزہ ہوئی۔

''ممی! آپ کو پتہ بھی ہے میں کسی قسم کا بھی گوشت آج کل نہیں کھاتی پھر بھی آپ نے......'' عہدنا روہانسی ہوئی۔ اماں بی جو خاموشی سے پوری کارروائی سن رہی تھیں اب کی بار چونک اٹھیں۔

''کیوں چندا! تجھ پر گوشت حرام ہے کیا......؟''

''اف اماں بی! مجھے چندا مت کہا کریں یوں لگتا ہے جیسے کوئی مسجد کا چندا مانگ رہا ہے''۔ عہدنا غصے سے بگڑی۔

''میں پوچھتی ہوں گوشت تم پر حرام ہے کیا......؟'' اماں بی نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے اپنا سوال پکڑ لیا۔

''نہیں میں آج کل ڈائٹنگ پر ہوں''۔ عہدنا نے پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا تھا۔

''جائٹنگ' یہ کیا ہوتی ہے''۔ اماں بی استعجاب میں پڑ گئیں۔

''جائٹنگ نہیں اماں بی ڈائٹنگ''۔ عہدنا نے تصحیح کرائی۔

''ارے جو بھی ہو تو بتا یہ موئی ہے کیا چیز''۔ اماں بی آنکھیں پھیلا پھیلا کر پوچھ رہی تھیں۔

''مطلب کہ گوشت اور تلی ہوئی چیزوں سے فاقہ کیونکہ یہ موٹا کرتی ہیں نا''۔

''اچھا تبھی تو میں کہوں کہ تو دن بہ دن سکڑی سکڑی چوزی کیوں بنتی جا رہی ہے' اب پتہ چلا کہ فاقے کرتی ہے۔ کیوں ری! کیا تیرا باپ ریڑھی پر ٹھیلا لگاتا ہے جو وہ تجھے نہیں کھلا پاتا اور تو فاقے کاٹتی ہے''۔ اماں بی کمر سرخ

سرخ آنکھیں' جلبلا انداز عہدنا کو ٹپٹا گیا۔

''وہ......وہ......'' وہ منمنائی' بولتی بھی تو کیا۔

''تجھے کیا فلموں میں کام کرنا ہے' ٹینا ملک بننا ہے بول''۔

''اماں بی! ٹینا ملک نہیں وینا ملک''۔ عہدنا نے اس ماحول میں بھی درستگی کرنی کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

''ارے جو بھی ہو''۔ اماں بی لاپروائی سے اوپر ہاتھ لہراتے ہوئے بولی تھیں۔

''ارے......'' اچانک اماں بی کی نظر مبارک اس کی درشن پہ پڑی تو چونک اٹھیں۔

''یہ تیرا بوتھا کیوں پانچ کلو کے گھی کے ڈبے کی طرح بنا ہوا ہے اب اگر صحیح راستہ دکھا کر ٹوکا ہے فاقوں سے تو منہ بنانے کی کیا تک بنتی ہے' ایک تو آج کے بچے پورے کے پورے منہ پھٹ' بے صبرے' اک ہمارا زمانہ تھا ہائے ہائے کیسا نیک اشراف زمانہ مجال ہو جو بزرگوں کے منہ لگیں''۔ اماں بی رطب للسان کی وادی میں کھو کر اپنے زمانے کے اور قصے بھی افشا کرتیں کہ اچانک عمر جلال ڈائننگ ٹیبل کے قریب آئے۔

''یہ ابھی تک کھانا نہیں آیا''۔ وہ کرسی کھسکاتے اور بیٹھتے حیرت سے چونکے تھے۔

''کہاں بیٹا! اب تو لگتا ہے آج بہو بیگم یہ برتن کھلانے کے موڈ میں ہیں''۔ اماں بی نے معصوم بن کر بہو کا پھوہڑ پن دیکھایا اور دل کو راحت اور مسرت بخشی۔

''نازیہ......نازیہ......اب کھانا لاؤ گی بھی یا بھوکے پیٹ میں سو جاؤں''۔ عمر غصے سے چلائے۔

''میں بس ابھی آئی''۔ کچن سے وہی سابقہ نازیہ کی مصروف آواز آئی۔

''خدا جانے کھانا بنا رہی ہے اتنی دیر سے یا ٹی وی پر ریکارڈ کروا کے راحت' شیریں اور ردا بنی سیکھا رہی ہے''۔ اماں بی نے ٹھنڈی آہ بھری' کوکنگ چینل سے بہت شغف تھا سو معلومات بھی کمال کی تھیں' عہدنا کی اماں بی کو ٹھنڈی آہوں اور بات پر ہنسی ابل آئی۔

''میں آ گئی' میں آ گئی''۔ دفعتاً نازیہ ڈشز کی ٹرائی ہاتھوں سے گھسیٹتی کسی اشتہار کی مانند گنگناتی منظر عام پر نمودار ہوئیں۔ ریڈ لان کا نیا نکور سوٹ پہنے' کھلے ہوئے بال لہراتے مستیوں میں گم تھے' منہ پر میک اپ تھوپا ہوا تھا' گلہ کان اور انگلیاں جیولری کی دکان نظر آ رہی تھیں۔

عمر صاحب اور عہدنا نے اک نظر دیکھا اور کھانے پر جھک گئے کیونکہ وہ روز روز کے عادی تھے' اور گواہ تھے کہ نازیہ کو سجنے سنورنے کا اولین شوق ہے' جانتی تو اماں بی تھیں اور ہر وقت سلگتی رہتی تھیں مگر اچانک بے وقت یہ سب کچھ اور وہ الجھ کر چونکیں۔

''کہاں جا رہی ہو بہو......؟'' اماں بی نے سوال داغا' نازیہ ٹیبل پر ڈشز رکھتی پہلے چونکیں پھر جھینپی سی مسکراہٹ در آئی۔

''اماں بی! آج میری سالگرہ ہے''۔ فخر نازیہ کے لہجے سے عیاں تھا۔

''اچھا اچھا سالگرہ ہے''۔ اماں بی نے سعادت مندی سے گردن ہلائی۔

''یہ لیجئے اماں بی آپ کا پرہیزی کھانا''۔ نازیہ نے کھانا ان کے آگے رکھا اور اپنی چیئر کی طرف کھسکیں۔

''تیری ماں اس عمر میں سٹھیا گئی ہے''۔ اماں نے جل بھن کر سرگوشی عہدنا کے کان میں انڈیلی تو اس کی ہنسی نکلنے کو بے تاب ہوئی مگر ضبط کا تالا ہونٹوں پر لگا لیا۔

''سنئے جی! میں کیسی لگ رہی ہوں''۔ اچانک نازیہ نے عمر صاحب پر سوال داغا۔

''میں بتاؤں کیسی لگ رہی ہو''۔ پھرتی سے اماں بی آگے آئیں۔

''ارے ہاں اماں بی! بتائیں نا''۔ نازیہ نے خوش دلی سے ساس کو خیال عیاں کرنے کا موقع دیا۔

''بڈھی گھوڑی لال لگام''۔ اماں بی نے طنز کیا۔ وہ بھنا گئیں۔ اس نے ایک نظر میاں اور بیٹی پر ڈالی جو ہنستے ہوئے جیسے انجوائے کر رہے ہوں اماں بی کا تبصرہ خیال۔ نازیہ نے ہاتھ میں پکڑا نوالہ پلیٹ میں پٹخا۔

''آپ کبھی میری بے عزتی کا موقع جانے نہیں دیتیں اماں بی''۔

''لو سنو بے عزتی''۔ اماں بی استہزائیہ ہنسیں۔

''اب خود ہی لوگوں کو خود پر ہنسانے کا موقع دو گی تو لوگ تو ہنسیں گے نا' غضب خدا کا بیٹی کا بیس سن لگا ہوا ہے اور تو سولا سال کی بنی خود کو چمکاتی رہتی ہے''۔ اماں بی نے اچھی خاصی خبر لی۔ نازیہ کھسیا گئیں بولنے اور وضاحت کے لئے تو اماں بی نے ایک بہانہ بھی ان کے لئے نہ چھوڑا سو دانت پیس کر چپ ہو گئیں۔

کون جانتا تھا کہ نازیہ نے آج ڈنر بنانے میں دیر نہیں کی بلکہ دیر تو اسے میک اپ کرنے میں ہوئی جو وہ چھپ چھپا کے کچن میں کرنے میں مگن تھیں اسے سوچ سوچ کر خود پر غصہ آنے لگا کہ فضول میں ٹائم برباد کیا۔

☆

موسم کے تیور بدل گئے تھے کہاں تو گرمیاں تپ تپا کر جلائے رکھتی تھی اور کہاں اب سردیاں شدت سے ٹھٹھرائے رکھتی تھیں' اماں بی ٹھہری گھٹنوں کے درد میں مبتلا سو سردیوں میں تو اب وہ اپنے کمرے اور بستر میں دبکی ساس بہو کے ڈرامے پر نظریں لٹاتے پھرتی تھیں۔ اماں بی پر اک نظر ڈالی جو اتنی انہاک سے ڈرامے میں مگن تھیں کہ عہدنا کو اپنا اگنور کرنا سلگا گیا۔

''اماں بی! میں اب جاتی ہوں روم میں''۔ عہدنا نے اوپر سے کمبل ہٹایا اور روم میں جانے کی اجازت چاہی۔

''نہیں بیٹھو' تم سے خاص بات کرنی ہے''۔ اماں بی نے سابقہ جواب دیا جو آدھے گھنٹے سے بیس بار دے کر اسے بیٹھا چکی تھیں۔ عہدنا نے ٹھنڈی آہ بھری اور خود کو کوسنے لگی جب اس نے اکیلے پن سے گھبرا کر اماں بی کے کمرے میں پناہ لینے کی ٹھان کر قدم رکھے تھے اسی وقت عمر جلال اور نازیہ کسی بزنس پارٹی پر انوائٹڈ تھے خدا خدا کر کے اماں بی کا ڈرامہ الوداع ہوا تو اماں بی نے اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس پر واریں۔

''آج کل پڑھنے کیوں نہیں جاتی......؟'' عہدنا الجھی یہ سوال تھا تفتیش وہ نہ سمجھی۔

''میرے بی ایس سی کے ایگزام ہو گئے ہیں سو کچھ مہینے چھٹیاں ہیں''۔ عہدنا نے ریموٹ سے چینل سرچنگ کرتے جواب دیا تھا۔

''تو پھر چلیں''۔ اماں بی چہکیں۔

''کہاں''۔ عہدنا ٹھٹکی۔

''ارے لاہور ماریہ کے پاس' بہت عرصہ ہوا ہے ملے''۔ اماں بی نے دیور کی بیٹی کا نام لیا۔

''ارے ہاں اماں! چلیں نا کافی عرصہ ہوا میں بھی نہیں گئی''۔ عہدنا کا موڈ خوش ہو گیا۔

''تو پھر کب چلیں......؟'' عہدنا اماں بی کا گھٹنا پکڑتے بے تابی سے سوال گو ہوئی۔

''عمر آئے تو اس کو کہتی ہوں ٹکٹ کا''۔ اماں بی نے تسلی بخش جواب دیا۔ عہدنا فرط مسرت سے اماں بی کے ساتھ لپٹ گئی۔

''اماں بی! میرا جانا تو مشکل ہے بزنس کا بہت کام ہے''۔ عمر جلال نے بے چارگی سے اپنا مسئلہ بتایا اور جانے سے معذرت کی' اماں بی نے سوالیہ ابرو اچکا کر نازیہ کی طرف دیکھا۔

''اماں بی! آپ کو تو علم ہے نا کہ عمر باہر کا کھانا پسند نہیں کرتے ہمیشہ گھر کا کھاتے ہیں سو میرا ابھی چلنا مشکل ہے''۔ اماں بی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہاں بات تو تمہاری ٹھیک ہے عمر کا کھانے پینے کا مسئلہ ہوگا' خیر میں اور چندا چلے جاتے ہیں''۔ اماں بی نے فیصلہ سنایا۔ دل بلیوں اچھلنے لگا۔

جانا تو انہیں ٹرین سے تھا مگر ملک میں ہونے والے ٹرین حادثے نے پورے گھر کو لرزہ دیا تھا۔

''اف پاپا! میں ٹرین سے نہیں جاؤں گی' مجھے ڈر لگ رہا ہے' اگر ہماری والی ٹرین بھی اف......'' عہدنا نے سوچ کر ہی خوف سے جھرجھری لی۔

''ہاں عمر پلیز! میں کسی صورت بھی ٹرین میں جانے نہیں دوں گی''۔ نازیہ نے بھی لب کشائی کی۔ ماں تھی سو ممتا بھرا خوف دل میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا۔

بات میں وزن تھا خود عمر جلال کا بھی ٹرین پر دل نہ مانتا تھا' اس نے کن اکھیوں سے اماں بی کی طرف دیکھا جو خود تفکر میں تھی۔

''ہم ایروپلین سے چلے جاتے ہیں''۔ عہدنا نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''اماں بی! آپ کیا کہتی ہیں جہاز کا سفر ٹھیک ہے یا پھر......'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ ماں کو تکنے لگے۔

''جہاز گرے گا تو نہیں نا''۔ دفعتاً اماں بی گھبرا کر استفسار کرنے لگیں۔ عہدنا اور نازیہ کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ چھلکی۔

''بالکل نہیں گرے گا آپ ڈریں مت''۔ عمر جلال نے ماں کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دیتے حوصلہ دیا اماں بی کے اندر طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔



بالآخر وہ مبارک دن آ ہی گیا جب انہیں ایئرپورٹ کے لئے نکلنا تھا۔

''چندا او چندا! جلدی کر ڈرائیور کھڑا ہے''۔ لاؤنج میں کھڑی تیار اماں بی نے بلند ہانک لگائی تھی' اسی اثناء میں عہدنا اور نازیہ دونوں نمودار ہوئیں جیسے عہدنا کی نگاہیں اماں بی سے ٹکرائیں وہ چہکی۔

''واؤ اماں بی! آج تو آپ لشکارے مار رہی ہیں''۔ سلک کے آف وائٹ غرارے میں ملبوس سر پہ اسی رنگ کا ریشمی دوپٹہ اوڑھے اماں بی تمام کے دنوں کے حساب سے مختلف ہی نظر آ رہی تھیں ہاتھوں میں موٹے موٹے گولڈ کے کنگن کھنک رہے تھے' آنکھیں سرمے سے بجی ہوئی تھیں اور ہونٹ مسواک سے سرخ لال' دانت تو تھے ہی نہیں سو مسواک ہونٹوں پر چمکایا گیا تھا۔ اماں بی کا سر فخر سے تن ہو گیا۔

''بس بچی! مجھے تو یہی سادگی کا اوڑھنا پہننا پسند ہے' کسی کی طرح میک اپ منہ پر تھوپ کر سولہ الہڑ نہیں بنتی''۔ اماں بی نے صاف نازیہ پر طنز کیا۔ نازیہ جل بھن کر پہلو بدل گئیں اور بات بدل دی۔

''چلیں اماں بی! ایئرپورٹ''۔ نازیہ نے پوچھا۔

''تو کہاں......'' اماں بی نے سوالیہ نظریں جمائیں نازیہ اماں بی کے سوال پر بوکھلا گئی تھیں۔

''ہمیشہ کا کی ہی بنتی رہنا' کوئی ضرورت نہیں ہے' ارے ملازموں کے سر پر اکیلا گھر چھوڑ جاؤ گی' پیچھے سب صفایا کر گئے تو ملتی رہنا ہاتھ''۔

''مگر اماں بی...... ممی......'' ابھی عہدنا نے ماں کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر ماں کی حمایت کرنی ہی چاہی تھی کہ اماں بی نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

''ماں کی چمچی مت بنو' ارے ملازموں کا کوئی بھروسہ نہیں آج کے دور میں وہ زمانہ گیا جب خاندانی اور ایماندار ملازم ہوتے تھے' اب چلو کہیں جہاز نکل نہ جائے چلو بھی''۔ اماں بی نے گھر کا۔ عہدنا ماں کے منہ بسورتے چہرے سے نظر چراتی بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ آخر دل کی بھڑاس بھی تو نکالنی تھی نا۔



عہدنا نے ایک نظر اپنے کندھے پر مزے سے اونگھتی اماں بی کے ڈھے سر پر ڈالی اور تلملا اٹھی۔

''ایئرپورٹ کے ویٹنگ روم میں چہار سو بھانت بھانت لوگوں کی چہل پہل تھی' اس کا بھی جی چاہا وہ ادھر ادھر ایک چکر لگا آئے مگر شانے پر دھرے اماں بی کے سر کے باعث وہ بے بس تھی۔ اس نے اپنا سیل فون لیا اور بورنگ دور کرنے کے لئے گیم سے ٹائم پاس کرنے لگی۔ مگر چند لمحوں میں ہی اس نے اکتا کر موبائل پرس میں پھینک دیا اور چہل پہل لوگوں کو حسرت بھری نگاہوں سے تکنے لگی۔ لاہور جانے والی فلائٹ میں آدھا گھنٹہ تھا' یک لخت اس کی آنکھیں کسی چیز کو دیکھ کر پہلے ٹھٹکیں پھر چمکی' چیخ مار کر وہ اچھلی۔

''ہم...... ہمایوں سعید''۔ اماں بی عہدنا کے اچانک اچھلنے پر ہڑبڑا اٹھیں۔

''کک...... کیا ہوا......؟ کیا دھماکہ ہو گیا......؟'' اماں بی ہراساں اور پھیکا چہرہ لئے پوچھ بیٹھیں۔

''اماں بی! ٹی وی والا ہمایوں سعید''۔ وہ تمتماتے چہرے سے اماں بی کو بتاتے اٹھنے کو ہی تھی کہ لپک کر اماں بی نے اپنے ہاتھ میں بازو دبوچ لیا۔

''خبردار جو ہلی' شرم نہیں آتی مردوں سے ملنے چلی ہے' ارے وہ سعید ہو یا وحید تیرا کیا''۔ اماں بی نے ماتھے پر شکنیں ڈال کر لتاڑا۔

''چلا گیا چلا گیا...... اماں بی! آپ بھی نہ بس......'' عہدنا نے تاسف سے منہ بگاڑا۔

''لگاؤں اب پورے ایئرپورٹ کے سامنے کٹ (مار)''۔ اماں بی نے سرخ سرخ آنکھیں لئے طیش سے کہا تھا۔ عہدنا کھسیا کے سر جھکا گئی مگر اندر ہی اندر غم بدستور کھائے جا رہا تھا۔



''لائیں اماں بی! سیٹ بیلٹ باندھوں''۔ عہدنا نے جیسے ہی جہاز میں فلائی ہوتے وقت بیلٹ باندھنے کو اناؤنسمنٹ سنی تو اماں بی کا بیلٹ باندھا اور پھر اپنا بھی باندھ لیا۔ جہاز آہستہ آہستہ زمین پر رینگتا فلائی ہونے کو اٹھ رہا تھا۔

''اماں بی! ڈر تو نہیں لگ رہا''۔ عہدنا کے سوال پر وہ ہنسیں۔

''لو چندا! مجھے کیا ڈر لگے گا میرے سامنے دس جن بھی آ جائیں تو میں نہیں ڈرنے والی لیکن اگر تجھے ڈر لگے نا تو گھبرانا مت میرا بازو تھام لینا' میں ہوں نا تیرے ساتھ''۔ اماں بی نے پیار سے پچکارتے ہوئے سمجھایا۔ عہدنا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چمکی' اماں بی بھول گئی تھیں کہ عہدنا نہیں خود اماں بی پہلی بار جہاز کا سفر کر رہی ہیں عہدنا تو عادی تھی جیسے ہی جہاز نے اوپر ہونے کو رفتار تیز پکڑی اماں بی کا اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا' کان سائیں سائیں ہوتے جا رہے تھے' دل کانپتا جا رہا تھا جسم لرز رہا تھا۔

''ارے چندا! میں مر گئی میرا سر چکرا رہا ہے' کم بخت جہاز کو روک' ہائے میرا دل پھٹ گیا' ارے جہاز کو روکو

روکو"۔ اماں بی عہدنا کا بازو تھامے چلاتی بین کرتی جارہی تھیں۔ عہدنا کے ہاتھوں سے طوطے کبوتر سب اڑ گئے اس کے ہاتھ پھولنے لگے اس نے بے ساختہ ایئر ہوسٹس کو آواز دی نیم بے ہوش اماں بی نے اس کے حواس گم کر دیئے تھے۔ اماں بی نے جیسے نیم بوجھل آنکھیں وا کیں تو عہدنا کو خود پر جھکے پایا۔

"اماں بی! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" عہدنا نے تشویش سے پوچھا تھا وہ بدستور ان کا ہاتھ مسلتی جارہی تھی وہ اس لمحے کو کوسنے لگی جب اس نے لاہور آنے کی حامی بھری تھی۔

"ٹھیک ہوں چندا! تم پریشان مت ہو"۔ اماں بی نحیف آواز میں بولی تھیں پوتی کا اترا ہوا پریشان کن چہرہ دیکھ کر اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ پرواز برق رفتاری سے اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں تھی جہاز لینڈ میں بس کچھ ہی ٹائم تھا مسافروں اور ایئر ہوسٹس کا ہجوم جو اماں بی کی تشویش ناک حالت پر کھڑے تھے وہ اب اپنی سیٹوں کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ عہدنا آنکھوں میں پھیلی نمی پونچھتے ایئر ہوسٹس کی طرف متوجہ ہوئی جو جوس لئے کھڑی تھی عہدنا نے ایئر ہوسٹس کو مشکور نگاہوں سے دیکھتے اماں بی کے منہ پر جوس غٹا غٹ چڑھانے لگی۔



وہ لوگ جیسے ہی ایئر پورٹ سے باہر نکلیں تو فوراً سامنے ماریہ آنٹی کے ساتھ کھڑے لڑکے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔

"شاید یہ آنٹی کا بیٹا ہے"۔ عہدنا نے دل میں قیاس لگایا۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ آنٹی کے تین بچے ہیں ایک بیٹا اور دو چھوٹی جڑواں بیٹیاں اریشے پریشے مگر حسن اتفاق تھا کہ بچپن کے بعد عہدنا نہ کبھی ماریہ آنٹی سے مل پائی نہ دیکھ پائی البتہ اریشے پریشے دو سال قبل ہی ان کے ہاں چکر لگا پائیں تھیں اماں بی ماریہ آنٹی سے ملنے کے بعد ساتھ کھڑے لڑکے کو دیکھ کر پہلے ٹھٹکیں پھر پہچان کر خوشگواریت سے بولیں۔

"ارے یہ ارشان بیٹا اتنا بڑا ہو گیا ہے"۔ اماں بی حیرتوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ ارشان ہنستے ہوئے اماں بی کے آگے جھکا تو جھٹ اماں بی گلے ملتے بلائیں لینے لگیں۔

"اماں بی! عہدنا تو بڑی خوبصورت ہو گئی ہے"۔ ماریہ آنٹی نے اپنے ساتھ لگائے عہدنا کو پیار بھری نگاہوں سے تکتے کہا عہدنا شرما کر جھینپ سی گئی۔

"ہائے...... آئی ایم ارشان"۔ اماں بی اور ماریہ آنٹی اپنی باتوں میں محو ہو گئیں تو ارشان اس کے سامنے کھڑا ہوا۔

"نائس ٹو میٹ یو آئی ایم عہدنا عمر"۔ عہدنا جھجکتے ہوئے بولی تھی۔

"اماں بی سفر میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی نا"۔ ماریہ اپنی شال کا فال ٹھیک کر کے پوچھنے لگیں۔

"پریشانی...... ارے مت پوچھو"۔ اماں بی کو جہاز والا واقعہ یاد آ گیا تو ماتھے پر ہاتھ دے مارا۔

"کیوں کیا ہوا خیریت"۔ ماریہ آنٹی پریشان ہوئیں۔

"بیٹا! گاڑی میں چلو بتاتی ہوں ورنہ سردی تو ہڈیوں میں اترتی جارہی ہے"۔ اماں بی سردی سے کانپتے بولیں تو سب گاڑی کی طرف ہم قدم ہوئے۔

"جی اماں بی! بتائیں خیریت......؟" ماریہ آنٹی گاڑی میں چھوٹتے ہی بولیں تو اماں بی پوری عن و من کھولنے بیٹھ گئیں ارشان مسکراتے محظوظ ہونے لگا۔

☆

پہل پہلے تو دو دن گھر میں ملنے ملانے میں لگے البتہ تیسرے روز ارشان نے مینار پاکستان گھومنے کا پروگرام بنایا

تو عہدنا کے ساتھ اریشے پریشے بھی جوش میں آ گئیں۔

اماں بی تو پہلے جانے سے انکاری تھی مگر جب دھوپ کا سایہ اور موسم دیکھا تو جھٹ تیار ہو گئیں دھوپ کی کرنوں کی وجہ سے سردی کم تھی ماریہ آنٹی اور خالد انکل ڈاکٹر تھے سو انہوں نے جانے سے معذرت کر دی۔

وہ لوگ جیسے ہی مینار پاکستان کے قریب پہنچے تو اماں بی کی حیرت سے آنکھیں پھٹ گئیں۔

"ہائے ہائے اتنا لمبا"۔ اماں بی چلائیں۔

"ارشان بھائی! اوپر چلیں"۔ عہدنا نے فرمائش شروع کر دی۔

"خبردار جو تم میں سے کوئی گیا اگر بم وم پھٹ گیا تو تمہارے اماں باوا کو کیا منہ دکھاؤں گی"۔ عہدنا کے ساتھ ساتھ عریشے پریشے کا بھی منہ لٹک گیا۔

"پلیز اماں بی! جانے دیں نا مجھے بہت شوق ہے"۔ عہدنا مچل کر مصر ہوئی۔

"ارے آگ لگے تیرے شوق کو میں کہتی ہوں چل یہاں سے میرے تو ہول اٹھ رہے ہیں جیسے ابھی گری"۔ اماں بی خوف زدہ انداز سے بولیں۔ عہدنا ارشان کے سامنے اماں بی کے بیانات پر کھسیا گئی۔

"اف ایک تو اماں بھی نا نہ محل دیکھتی ہیں نہ موقع بس شروع ہو جاتی ہیں"۔ عہدنا دل میں کلسی۔

ارشان اماں کی طبیعت کے پیش نظر بادل نخواستہ وہاں سے ٹلنے لگا۔ اماں بی اور عریشے پریشے آگے آگے تھیں جبکہ عہدنا ہولے ہولے قدم لئے پیچھے کی طرف تھی۔ ارشان آہستگی سے کھسک کر عہدنا کے ہم قدم ہوا۔

"سوری عہدنا! اماں بی کی وجہ سے...... تم دل برداشتہ اور گھوم نہ پائیں فکر مت کرو ہم کل یہاں آئیں گے پھر تم جتنی دیر کہو گی اتنا ہی رکیں گے"۔

"سچی ارشان بھائی!" عہدنا کی آنکھیں چمکیں۔

"ہاں بالکل پکا وعدہ"۔ ارشان نے یقین دلایا۔

"او تھینکس ارشان بھائی!" وہ چہک اٹھی دفعتاً ارشان کا دل دھڑکا اسے لگا اس کا دل عہدنا کی ہنسی سے گھائل ہو گیا ہے وہ بس پیار بھری نگاہوں سے اسے تکتا رہ گیا۔

☆

گھومنے کی اگلی منزل انارکلی بازار تھا جہاں ارشان انہیں شاپنگ کروانے لایا تھا سب سے پہلے ان کا ارادہ کسی کپڑوں کی شاپ میں گھسنے کا تھا تو وہ چاروں شاپ کی طرف بڑھنے کو ہی تھیں کہ بیچ راستے میں لگے چوڑیوں کے اسٹال نے عہدنا کی نظر اپنی طرف مبذول کروائی تو وہ رک کر وہیں اسٹال پر ٹک گئیں۔ اماں بی کچھ فاصلے پر دور کھڑی تنتنا اٹھیں۔

"اف ایک تو یہ لڑکیاں بھی"۔ وہ ناگواری سے سوچتے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

☆

پھر ساری شاپنگ کے بعد وہ جانے کا قصد باندھ ہی رہے تھے کہ اچانک عہدنا کو یاد آیا کہ جیولری تو لی ہی نہیں ارشان نے اسے گھورا تو وہ التجائیہ لہجے میں گڑبڑائی۔

"پلیز پلیز...... بس یہ آخری چیز ہے سنا ہے یہاں کی جیولریز کافی مشہور ہے"۔ وہ اتنے معصوم لہجے میں بولی تھی کہ ارشان کو ماننا ہی پڑا۔ عہدنا کو وہ نازک نازک سی گرین نگوں اور وائٹ نگوں والا سیٹ بہت پسند آیا تھا وائٹ نگ جیسے ہیروں کا تاثر پیش کر رہے تھے اس نے فوراً لینے کی ٹھانی۔

"بھائی! یہ کتنے کا ہے"۔ اس نے دکاندار سے قیمت پوچھی۔ دکاندار کے منہ سے قیمت سن کر اماں بی اچھل پڑیں۔





”کیا کہا ہزار کا یہ سوا لاہار اور بندوں کا سیٹ ہزار کا اتنی لوٹ مار ہائے ہائے میری پوتی کو لوٹ رہے ہو بھیا! خدا کا خوف کر“۔ اماں بی ہاتھ نچا نچا کر بولیں۔ وہ چاروں سٹپٹا گئے' دکاندار کا چہرہ لال ہو گیا۔

”ماں جی! ایسے کونسے آپ لوگوں میں لعل جڑے ہوئے ہیں جو آپ کو لوٹوں گا' لینا ہے تو لیں ورنہ دماغ مت کھائیں' جائیں یہاں سے“۔ دکاندار نے بھی شرافت کا چولہ پھینک دیا۔

”ہمیں بھی شوق نہیں تمہاری گھٹیا چیزوں کو لینے کا' وہ تو غریب سمجھ کر تمہاری مدد کرنی چاہی پر کیا پتہ چوری کا مال ہو“۔

”جاؤ بھائی جاؤ اس پاگل بڑھیا کو لے جاؤ“۔ دکاندار عاجز آ گیا تھا سو صاف جانے کا اشارہ دیا۔

”ارے پاگل ہو گا تو......“ اماں بی لعن طعن پر اتریں۔

”پلیز اماں بی! بس کریں“۔ ارشان نے جلدی جلدی دکانداروں سے سوری کر کے اماں بی کو کھینچتے گاڑی کی طرف بڑھنے لگا' پیچھے پیچھے افتاں وخیزاں اریشے' پریشے اور عہدنا تھیں۔



دنوں کا چرخہ سبک روی سے گزرتا مست تھا اماں بی اور عہدنا کو آئے ہوئے 13,12 روز گزر گئے تھے' عہدنا کو اریشے' پریشے اور ارشان کی سنگت میں مزا تو بہت آ رہا تھا' مگر وہ بہت اداس تھی اس نے دل کی اداسی سے گھبرا کر ماں کو فون کیا۔ کافی دیر بعد بات کر کے اس کا دل مطمئن ہو چکا تھا' وہ اریشے' پریشے کے کمرے میں گئی تو وہ دونوں کارٹون نیٹ ورک پر باربی کارٹون موووی دیکھنے میں کھوئی ہوئی تھیں۔ عہدنا کے لبوں پر مسکراہٹ آئی کہنے کو دونوں 9th کی اسٹوڈنٹس تھیں مگر شوق وہی بچوں والے' ماریہ آنٹی اور اماں بی یقیناً کچن میں تھیں جہاں ڈنر کی تیاری ہو رہی تھی۔ عہدنا نے بور ہو کر ارشان کا کمرہ نوک کیا تو اندر سے اجازت ملتے ہی وہ جیسے اندر داخل ہوئی تو وہ چونکا۔

”ارے عہدنا! آؤ نہ یہاں بیٹھو“۔ وہ یکدم کھڑا ہوا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے ہاتھ میں جکڑے ریموٹ سے ٹی وی آف کر دیا۔

”میں وہ۔ بس بور ہو رہی تھی تو آ گئی“۔ عہدنا انگلیاں موڑتے جھجکتے ہوئے بولی۔

”آپ کا رزلٹ آ گیا ارشان بھائی!“ اسے یاد تھا کہ ان ہی دنوں ارشان کا ایم بی اے کا رزلٹ آنے والا ہے۔

”ہاں وہ۔ بس آنے والا ہے ویسے تمہارا کیا ارادہ ہے آگے پڑھو گی یا بس اویں“۔ اس نے عہدنا کو چھیڑا۔

”اویں کیوں' میں تو کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی کروں گی“۔ عہدنا نے اپنے نیک ارادے ظاہر کیے۔

”ہوں گڈ“۔ ارشان نے اسے سراہا۔

”ویسے ارشان بھائی! اب آپ کی نیک بخت کو آنا چاہئے کیا خیال ہے“۔ عہدنا شریر ہوئی ارشان بے ساختہ ہنس پڑا۔

”ہاں آنا تو واقعی چاہئے“۔ اس نے سر ہلایا۔

”پھر بتائیں کب کریں گے شادی“۔ عہدنا بے تاب ہو گئی۔

”آں...... “ وہ سوچتے رکا۔

”شادی تو نہیں ابھی ہاں انگیجمنٹ کروالوں......؟“ اس نے سوالیہ نظریں جھکا کر اس سے پوچھا تھا۔

”ہائیں...... اتنی جلدی“۔ عہدنا کو حیرت ہوئی۔

”اور میری تیاری اتنی جلدی کیسی ہو گی اف......“ وہ پریشان ہو گئی تھی۔

”اوہ کم آن عہدنا! تم پریشان مت ہو میری منگنی کی ساری شاپنگ میری طرف سے اوکے“۔

”آہا پھر تو ڈونٹ وری“۔ وہ خوشی سے چہکی۔

”ویسے ارشان! لڑکی کونسی ہے' کیسی ہے' آپ کی پسند ہے یا ماریہ آنٹی کی......؟“ وہ شوخی سے اسے گھیرنے لگی۔

”پہلے میری پھر ممی کی“۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا تھا۔

”اوہ ہو اوہ ہو......“ عہدنا کے منہ سے معنی خیز اوہ نکلی یکلخت اریشے نے گردن اندر کر کے دروازے سے جھانکا۔

”اماں بی کہہ رہی ہیں اگر آپ لوگوں کی اگرم بگرم باتیں ختم ہو گئی ہیں تو ڈنر پر ٹوٹ پڑنے کے لئے تشریف لائیں“۔ وہ پیغام رساں فرماتی یہ جا وہ جا۔ وہ دونوں باتیں منقطع کر کے ڈنر کے لئے اٹھ کر گئے۔



اماں بی نے کل کا رخصت سفر باندھنے کا عہدنا کو حکم صادر کر دیا' آج اس گھر میں آخری رات تھی سو عہدنا' اریشے پریشے سے گپ شپ میں بزی تھی کہ اچانک ملازمہ اماں بی کا بلاوا لے کر آئی' عہدنا منہ بگاڑتے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اماں بی کے کمرے میں جیسے انٹر ہوئی تو ماریہ آنٹی شاید کہیں ارشان بھائی کے ساتھ جا رہی تھیں۔

”جی اماں بی! آپ نے بلایا“۔ اس نے اکتا کر عہدنا لو چھا۔

”ہاں بلایا تھا مگر تیرا غبارے جیسے بوتھے کو دیکھنے کو نہیں“۔ اماں بی نے بغور اس کا جائزہ لے کر ٹوکا' ماریہ آنٹی اور ارشان کے لبوں پر ہنسی دوڑ گئی البتہ کمرے میں آتی اریشے' پریشے منہ پھاڑ کر ہنسی تھیں' عہدنا کو اپنی سبکی پر رونا آنے لگا مگر صورت سے عیاں نہ ہونے دیا۔

”میرے کل کے کپڑے استری کر دیئے......؟“

”کونسے کپڑے......؟“ وہ حیرانگی میں اتری۔

”لو بتاؤ کونسے کپڑے' دیکھتی ہو ماریہ......“ اماں بی شکوہ کناں ہو کے ماریہ آنٹی کو بتانے لگیں۔

”اماں بی! بچی ہے پلیز آپ ڈانٹیں تو مت اچھا چلتی ہوں آج نائٹ ڈیوٹی نہ لگتی تو میں نہ جاتی' خالد بھی بہت شرمندہ تھے کہ آپ اتنے سال بعد آئی ہیں انہوں نے آپ کو ٹائم نہ دیا“۔ ماریہ آنٹی شرمندگی سے وضاحت کرنے لگی تھیں۔

”نہ بیٹا! اس میں تم لوگوں کا کیا قصور جاؤ خیر سے جاؤ...... ارشان بیٹا! ماں کو چھوڑ آؤ“۔ اس نے ارشان کو رسانیت سے کہا۔ تو ارشان ماں کو چھوڑنے ہاسپٹل چلا گیا۔ خالد انکل ان لوگوں کے آنے کے بعد باہر ملک چلے گئے ڈاکٹرز ٹیم کے ساتھ' ان کی واپسی کچھ دن بعد متوقع تھی۔

”ہاں تو میں کپڑوں کا پوچھ رہی تھی یاد آیا جو شام کو استری کرنے کو دیئے تھے“۔ اماں بی نے دائیں بازو میں اریشے اور بائیں میں پریشے کو گلے لگاتے کڑک دار آواز میں گھر کا۔

”وہ...... وہ تو میں بھول گئی پریس کرنا“۔ بالآخر عہدنا کو یاد آ گیا اور اپنا گناہ ظاہر کیا۔ اماں بی نے جواباً ایسی طنزیہ اور بھنائی نظروں سے گھورا کہ وہ گڑبڑا گئی اور فوراً کمرے سے رفو چکر ہوتی پریس کرنے بھاگی' جاتے جاتے اس نے اریشے' پریشے کے فلک شگاف قہقہے سنے تھے۔



شلوار اور دوپٹہ استری کرنے کے بعد اس نے قمیض استری اسٹینڈ پر رکھی اور دلجمعی سے استری کرنے لگی۔ دفعتاً چر سے دروازہ کھول کر پریشے تیزی سے آئی۔

”عہدنا آپی! آپ کا فیورٹ فواد خان ٹی وی پر نمودار ہوا ہے“۔ یہ کہتی ہوئی وہ سرعت سے بھاگ گئی جیسے ہوا کے رتھ پر سوار ہو۔ عہدنا نے جیسے فواد کا سنا وہ بھی بھاگتی ہوئی لاؤنج کی طرف دوڑی جہاں ٹی وی پر فواد خان چھایا ہوا

تھا، عہدنا کے ذہن سے استری اور اماں بی کے کپڑے سب نکل چکا تھا۔

وہ تینوں آدھے گھنٹے بعد ہنستی ہنستی جیسے کمرے میں داخل ہوئیں تو ایک عجیب سی نامانوس بو نے استقبال کیا۔

''یہ بو کیسی کمرے میں پھیلی ہوئی ہے''۔ پریشے نے نخوت سے ناک پر ہاتھ جماتے کہا تھا۔

''ہاں ہاں لگتا ہے کچھ جل رہا ہے''۔ اریشے نے بھی منہ بسورتے دہائی دی۔

یکدم عہدنا کے دماغ میں کچھ کوندا سا لپکا وہ پھرتی سے بھاگتی سرعت سے استری اسٹینڈ تک آئی، تو قمیص پر چپکی ہوئی دہکتی استری سے اڑتا اڑتا دھواں عہدنا کے ہوش بھی اڑا گیا۔

''او مائی گاڈ اماں بی کا سوٹ''۔ پریشے چیخی۔

''آپی! آپ نے اماں بی کا سوٹ اللہ میاں کو پیارا کر دیا''۔ عہدنا پر سکتا طاری تھا وہ گنگ سی کھڑی تھی، پریشے نے کھینچ کر استری کا سوئچ بند کر کے جیسے استری کھینچی تو عہدنا کا دل رونے لگا، قمیص پر بہت بڑا گول سوراخ اپنا نقش ثبت کر چکا تھا۔

''اب کیا کریں......؟'' عہدنا گھبراہٹ سے ہاتھ مسلنے لگی۔

''عہدنا آپی! کیا اسے بھی زمین میں دفن کیا جائے گا......؟'' اریشے کی سوالیہ آواز ابھری۔

''اور آپی! کیا اس کا بھی چہلم ہوگا''۔ پریشے بھی میدان میں اتری۔ عہدنا کا خون کھولنے لگا غصے سے پارہ آسمان کو چھونے لگا۔

''چپ کرو تم دونوں، میں اتنی پریشان ہوں اور تم دونوں کو مذاق سوجھ رہا ہے''۔ روتی سی صورت لئے عہدنا نے ان کی کلاس لی تو وہ دونوں چپ چاپ بیٹھ گئیں۔ عہدنا جلے پیر کی بلی کی طرح ٹہل ٹہل کر کوئی تدبیر سوچے جا رہی تھی۔

''آپی! ایسا کریں سوٹ چھپا دیں، اماں بی پوچھیں تو آپ مکر جانا کہ مجھے کب دیا تھا''۔ عہدنا کے دل کو یہ مشورہ خوب لگا۔

ابھی وہ اپنی ان چیلوں کے ساتھ گھسی کونے کھدرے میں قمیص مدفون کرنے کو تھی کہ دھڑ سے دروازہ کھلا آنے والی یا پنپتی کانپتی جوڑوں کے درد کو کوستی۔ شاید کہ فرشتے نے ان کو اپنے نئے نکور سوٹ کے داغ مفارقت کی اطلاع دی تھی تبھی اماں بی نے اچانک چھاپہ مارا تھا۔ عہدنا نے جھٹ قمیص اپنے ہاتھوں میں مقید کر کے ہاتھ پیچھے چھپا لیا۔

''شرم نہیں آتی تم تینوں کو، میں بوڑھی اکیلی کمرے میں بیٹھی ہوں اور تم تینوں یہاں سر جوڑ کر باتیں کر رہی ہو میں نے سوچا جا کر دیکھتی ہوں...... مہارانیاں کون سے کارنامے انجام دے رہی ہیں''۔ اماں بی غراہٹ سے بولتی ان کی روح فنا کر گئیں۔

''ام...... اماں بی! وہ...... وہ بس ہم آنے ہی والے تھے''۔ عہدنا نے مارے گھبراہٹ سے تھوک نگلا۔

''اچھا......'' اماں بی نے لٹھ مار انداز میں اچھا کہا جیسے یقین نہ آیا ہو۔ اچانک اماں بی کی زیرک نگاہوں نے عہدنا کے پیچھے ہاتھوں پر کچھ بھانپ لیا۔

''یہ تیرے پیچھے ہاتھوں میں کیا ہے......؟''

''کچھ نہیں اماں بی! کچھ نہیں''۔ اس نے بے نیازی واری۔

''کچھ نہیں ہے تو ہاتھ پیچھے کیوں......؟'' وہ مبہم انداز میں دریافت کرنے لگیں۔

عہدنا نے باری باری اریشے، پریشے کی طرف دیکھا جو خود صورت حال سے خائف تھیں۔ عہدنا نے با دل نخواستہ ڈرتے ڈرتے ہاتھ آگے کیے۔

''ارے یہ تو میری قمیص ہے''۔ اماں بی نے چونک کر قمیص چھینی پھر اس نے جیسے قمیص لہرائی تو بیچ میں پڑا گول سوراخ اماں بی کا منہ چڑا رہا تھا، اماں بی کا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے بچا اپنے نئے نکور سوٹ کا حشر دیکھ کر اور پھر اریشے پریشے نے دیکھا اماں بی بادل کی طرح عہدنا کے سر پر کھڑیں گرج برس رہی ہیں اور عہدنا بیڈ پر بیٹھی سوں سوں کر کے چھکوں پھکوں رو رہی ہے۔



سی آف کرنے انہیں سب ہی آئے تھے۔

''اماں بی! کراچی پہنچتے ہی فون کر کے اپنی خیریت بتا دیجئے گا''۔ ماریہ آنٹی اماں بی سے گلے ملتے تلقین کرنے لگیں۔

''ہاں ہاں میں کر دوں گی''۔

''اماں بی! پھر ہم کچھ دن بعد آ جائیں نا کراچی......؟'' ماریہ آنٹی نے تصدیق چاہی، عہدنا چونک اٹھی، کہ بھائی کی انگیجمنٹ ہے پھر یہ کراچی...... وہ الجھی، ارشان جیسے اس کا چہرہ بھانپ گیا۔

''وہ کراچی میری سسرال ہے نا''۔ اس نے عہدنا کے کان میں سرگوشی کی۔

''ارے ہاں ہاں تم تو پہنچ جانا...... تمہاری خود ہی تو بات ہوئی تھی نا عمر اور نازیہ سے وہ تو رضامند ہیں''۔ اماں بی رسانیت سے بولیں تو ماریہ سب خدشے بھول گئیں اور مطمئن ہو گئیں۔



جب سے وہ لوگ لاہور سے واپس آئیں تھیں اماں بی سر تا پیر بدل گئی تھیں کہاں تو اماں بی ہر وقت ٹوکتے قاتلانہ نگاہوں سے وارتی تھیں اب وقت بے وقت اپنی ممتا نچھاور کر کے عہدنا کو بوکھلا دیتی تھیں بلکہ ایسی ایسی میٹھی نظروں سے تکتیں، واری واری اور صدقے جاتی تھیں کہ عہدنا کو لگتا تھا اللہ نے نئی روح اماں بی کے جسم میں ڈالی ہے، اس وقت تو عہدنا بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی جب اماں بی کے سامنے عہدنا کے ہاتھ سے ان کو ٹی وی کا ریموٹ چھوٹ کر نیچے سجدہ ریز ہو کے شہید ہو گیا تھا تو عہدنا خوف سے نیلی، پیلی، ہو گئی اور خود کو تیار کر لیا اماں بی کو خشوع و خضوع سے جاری کوسنوں کو سننے کے لئے مگر اماں بی کے الفاظ......

''کوئی بات نہیں چندا! ٹوٹنا تھا ٹوٹ گیا''۔ اور عہدنا دم سادھے سکتے کی کیفیت میں تھی، کیا یہ وہی اماں بی ہے جو اپنے ریموٹ پر ہاتھ لگانے پر بھی غصہ سے بل کھاتی تھیں۔



اور بالآخر عہدنا پر واری جانے کا گوہر نایاب راز افشاں ہو ہی گیا۔

''کیا ماریہ آنٹی نے میرا پروزل بھیجا ہے''۔ عہدنا حیرت سے چلائی۔

''ہاں تو اس میں چلانے کی کیا بات ہے''۔ اماں بی کو اعتراض ہوا۔

اس وقت اماں بی کے کمرے میں اماں بی، عہدنا کے ساتھ نازیہ بھی تھیں، خوش باش چمکتا چہرہ لئے ظاہر ہے بیٹی کا اتنا شاندار رشتہ جو آیا تھا۔

''مم مگر ارشان بھائی کی منگنی تو......'' عہدنا منمنائی۔ اماں بی اور نازیہ ہنس پڑیں آج تو وہ ساس بہو دو جسم یک جان بنی بیٹھی تھیں۔

''ارے میری معصوم بے وقوف چندا! وہ ہی تو تیرے ساتھ طے ہے، اچھا اب زیادہ بک بک نہ کر جا اپنے کمرے میں جا، میں تیری ماں کے ساتھ تیاریوں پر بات کر لوں''۔ اماں بی نے اپنے پرانے روپ میں آنے کی دیر ہی نہ کی

عہدنا کلس کر اپنے روم میں آئی۔

"ارشان بھائی اتنا بڑا دھوکا' مگر اب دیکھنا میں کیا کرتی ہوں"۔ وہ زیر لب مسکرائی' وہ اپنی اچانک وارد ہونے والی منگنی اور منگیتر کو قبول کر چکی تھی دل جان سے' اس نے ادھر ادھر سیل فون کی تلاش میں نگاہیں واری تو بکس کے نیچے اس کا سر جھلملا رہا تھا' اس نے لپک کر اٹھایا اور ارشان کا نمبر ڈائل کر کے سیل کان پر لگا دیا۔ اگلے ہی لمحے اس کی دلکش آواز عہدنا کی سماعت سے ٹکرائی۔

"اسلام علیکم عہدنا! کیسی ہو......؟" وہ خوشگواریت سے حال احوال کر رہا تھا۔

"آپ نے کیا سوچ اور سمجھ کر میرا پرپوزل بھیجا ہے ارشان خالد"۔ عہدنا نے سپاٹ لہجے سے پوچھا تھا۔

"کیوں کیا مطلب......؟" وہ اس کے لہجے پر چونکا۔

"آپ جیسا دھوکے باز تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا' واہ دل میں پسند کسی اور کو کیا' اس کے ساتھ منگنی کرتے پھر رہے تھے مگر اس نے انکار کیا تو اب میرے نام کی مالا جپ کر میرے لیے پرپوزل بھیجتے ہیں کیوں کیوں کیوں......؟" وہ چیخ کر سوال گو ہو کر رو دی۔

"اف میں اتنی اچھی ایکٹر ہوں جو مجھ احمق کو پتہ ہی نہیں چلا' خیر اب تو یونیورسٹی میں ہر ڈرامے کی ہیروئن میں......واہ" وہ دل ہی دل میں خود کو داد دے رہی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں عہدنا! میں کل بھی تمہیں پسند کرتا تھا اور آج بھی......اور میری منگنی تو طے ہی تمہارے ساتھ ہوئی تھی ہاں یہ میری غلطی ہے کہ میں نے تمہیں نام نہ بتا کر سسپنس میں رکھا مگر...... میں تمہارے ساتھ سچا ہوں' میں نے تمہارے متعلق ممی اور اماں بی کو بتا دیا تھا' تبھی یہ سب طے ہوا"۔ وہ روہانسا ہو کر وضاحت کرنے بیٹھا۔

"مگر میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی یہ میرا آخری فیصلہ ہے"۔ عہدنا نے آخری لفظ پر زور دیا۔

"ایسا تو مت کہو عہدنا! تم جو سزا دو منظور ہے مگر پلیز نہ مت کرنا شادی سے"۔ اس کی رونے والے انداز پر عہدنا کی زوردار ہنسی نکل گئی اور پھر نکلتی گئی۔ ادھر ارشان حق دق تھا کہیں یہ پاگل تو نہیں ہو گئی۔

"مجھے ماریہ آنٹی کا بیٹا قبول ہے"۔ وہ ہنسی روک کر اظہار کر بیٹھی۔

"ایں......تو وہ سب......" ارشان متحیر ہوا۔

"نہ بتانے کا بدلہ"۔ عہدنا ترنگ میں چہکی۔ ارشان کے دھڑکتے دل میں سرائیت پھیل گئی۔

"او مائی گاڈ تم مجھے فول بنا رہی تھی جان نکال ڈالی تھی قسم سے......جاؤ نہیں بولتا"۔ وہ خفگی اور روٹھے پن سے بولا تھا۔

"او کے یوں ہی سہی"۔ عہدنا نے کال منقطع کرنی ہی چاہی کہ ارشان ٹپٹا کر چلایا۔

"سنو سنو سنو"۔

"جی......" عہدنا ہمہ تن گوش ہوئی۔

"مجھ سے شادی کرو گی......؟" وہ گاتا گاتے گنگنایا تھا۔ عہدنا ہنس پڑی' ارشان اس کا جواب محسوس کر گیا۔

"تیار رہنا میری جیل میں اسیری کے لئے"۔ ارشان نے اسے معنی خیز لہجے میں چھیڑا۔ عہدنا نے شرما کر کال منقطع کر دی۔

"بدتمیز جیلر"۔ وہ آپ ہی آپ مسکرائی۔ اور پھر باہر کی طرف قدم بڑھانے لگی جہاں نازیہ اور اماں بی کا با آواز بلند آوازوں میں نیا جھگڑا چھڑ چکا تھا۔

☆

نائلہ طارق

افسانہ

اک کوئی خوشبو جیسی بات

ایک طویل انگڑائی لینے کے بعد اس نے جمائیاں روکتے ہوئے بیزاری سے قریب بیٹھی بہن کو دیکھا تھا جو پیروں پر کمبل ڈالے خشک میوے پھانکتی ہزار بار دیکھی ہوئی مووی دیکھنے میں مگن تھی۔



"والیوم تو کم کردو"۔ کچھ جھلا کر اس نے کہا تھا جس پر منیبہ نے اس کو گھورا تھا۔

"روٹیاں بنا لو جا کر' مریم کوچنگ سے آنے والی ہے' گھر آتے ہی وہ کھانے پر ٹوٹتی ہے"۔

"میں بہت تھک گئی ہوں' آج بہت کام تھا پارلر میں"۔ دوبارہ اونگھنے کی تیاری کرتی وہ بولی تھی۔

"تین گھنٹے ہو چکے ہیں تمہیں بستر توڑتے ہوئے ابھی بھی اگر تھکن نہیں اتری تو صبر کر جاؤ' ابھی امی شروع ہونے والی ہیں"۔ منیبہ نے ناگواری سے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے ان کے شروع ہونے تک میں تھوڑا اور نیند لے لوں"۔ ڈھٹائی سے بولتے ہوئے اس نے کمبل منہ پر ڈالا تھا تب ہی ایک دھماکے سے دروازہ کھلا تھا۔ منیبہ کی طرح وہ بھی اچھل پڑی تھی مگر آنے والے کو دیکھ کر منیبہ کی طرح پرسکون نہیں ہوئی تھی۔

"بے وفا' سنگدل' کٹھور عورت' تم نے میری زندگی برباد کر دی ہے"۔ غصے میں بھڑکتا وہ خونخوار نظروں سے منیبہ کو گھور رہا تھا۔

"جو کہنا ہے کہہ دو مگر خبردار جو مجھے عورت کہا' اچھی خاصی لڑکی کو عورت کہتے ہوئے شرم نہیں آتی تمہیں"۔ منیبہ کا بس نہیں چلا ورنہ کچا چبا جاتی اسے۔

"اور تمہیں شرم نہیں آئی میری زندگی سے کھیلتے



ہوئے' پورے دو مہینے تم نے مجھے اپنے عشق کے بخار میں رکھ کر اسی دن کیلئے پروان چڑھایا تھا محبت کے پودے کو کہ آج صبح ہی صبح اس کی جڑوں میں زہر انڈیل دیا"۔ وہ پھر بھڑکا تھا۔

"اگر تمہیں ایسا لگتا ہے تو اس پودے کو اکھاڑ کر نیا پودا لگا لو' اس سے پہلے بھی تو تم یہ کام کرتے رہے ہو اور صبح صبح تو میں نے مٹھائی بھیجی تھی تمہیں......"

"اپنا رشتہ طے ہونے کی مٹھائی"۔ وہ درمیان میں غرایا تھا۔

"صبور بھائی! آپ پہلے بیٹھ جائیں"۔ معظمہ نے بمشکل کہا تھا۔

"میں بیٹھوں گا نہیں' اب صرف لیٹوں گا وہ بھی قبر میں' تین چار اور قبریں تیار کر کے"۔ منیبہ کے مسکراتے چہرے کو گھورتا وہ سلگا تھا۔

"صبور بھائی! یہ رشتہ منیبہ کی مرضی سے نہیں ہوا"۔ معظمہ نے منیبہ کو بچانے کی کوشش کی تھی۔

"سب کچھ میری مرضی سے ہوا ہے' میں پاگل ہوں جو واثق کو ٹھکرا دیتی تم جیسے خالص نفسیاتی کیلئے"۔ منیبہ نے تنک کر بھانڈا پھوڑا تھا۔

"میں نفسیاتی ہوں' اس سے پہلے تو تمہارے لیے مجھ جیسا ہینڈسم کوئی نہیں تھا دنیا میں"۔ خونخوار لہجے میں بولتا وہ رُکا تھا کہ منیبہ نے کھلکھلا کر ہنسنا شروع کر دیا تھا جبکہ معظمہ کے رہے سہے اوسان صبور کے تیوروں پر خطا ہو گئے تھے۔

"آخر تم بھی وہی نکلیں...... خالہ زاد پر چچا زاد بھاری نہیں پڑا بلکہ اس کا اسٹیٹس بھاری پڑ گیا' آخر کیوں نہ اس کا پلڑا تمہاری نظر میں بھاری ہوتا' تم جیسوں کا دین ایمان ہی پیسہ ہوتا ہے"۔ وہ بگڑ کر بولا تھا۔

"ایسا ہے تو ایسا ہی سہی"۔ منیبہ خاطر میں لائے بغیر ڈرائی فروٹس پھانکنے لگی تھی۔

"اسے چنا تھا تم نے میرے لیے' یہی رہ گئی تھی تمہارے خیال میں میرے لیے؟" اس کا رخ اب معظمہ کی طرف ہو گیا تھا جو فق چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی۔

"اس پر اپنا غصہ مت نکالو' تمہاری نیت مجھ پر خراب ہوئی تھی جو اس نے تم پر میرے جیسی بہن تک کو قربان کر دیا' وہ تو اچھا ہوا مجھے ہی عقل آ گئی"۔ منیبہ فوراً درمیان میں بولی تھی۔

"ایک ایک کر کے اس نے اپنی ساری دوستوں کے دماغ میں فتور بھرا اور تمہاری محبت میں اپنی سگی بہن کو بھی نہ بخشا"۔ بولتے ہوئے منیبہ نے اسے بھی گھورا تھا جو شرمندہ بیٹھی تھی۔

"کچھ نہیں کیا میری محبت میں اس نے...... اس کی اپنی گوٹ پھنسی ہوئی ہے ورنہ یہ تو اپنا بخار بھی مجھے نہ دے"۔

"کیا کہہ رہے ہو...... کون سی گوٹ؟" منیبہ بھونچکی رہ گئی تھی جبکہ معظمہ کا دل چاہا سامنے کھڑے شخص کو حقیقتاً قبر میں اتار دے۔

"کچھ خدا کا خوف کر لیں' اس پورے سال کا حساب لگائیں' کوئی درجن بھر افیئرز کیلئے میں نے اپنی دوستوں کو پیش کیا تھا آپ کی خدمت میں"۔

"ہاں بالکل' مگر ان میں سے کوئی بھی افیئر کامیاب نہیں ہوا' مہینہ بھر سے زیادہ ہوا نہیں' کسی کی منگنی ہو گئی' کسی کا نکاح...... سب کی سب چڑیلیں ٹاٹا بائے بائے کہہ گئیں"۔ بری طرح وہ جس طرح تپ کر بولا تھا منیبہ کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

"لے دے کر ایک یہ رہ گئی تھی اسے بھی لے اڑا وہ ہونق واثق"۔

"بہت بول چکے تم' منہ بند کر لو اب"۔ واثق کی شان میں گستاخی منیبہ سے برداشت نہیں ہوئی تھی۔

"ویسے ایک بات ہے درجن بھر لڑکیوں کی قسمت سنوارنے کے بعد تم میرے لیے بھی مبارک ثابت ہوئے' واثق کی بینک میں جاب بھی لگ گئی اور میری

شادی اس سے طے ہو گئی"۔ منیبہ چہکی تھی۔

"میں بھی دیکھتا ہوں واثق کی بینک کی جاب تمہیں سونے سے پیلا کرتی ہے یا نیلا"۔ ڈرائی فروٹس کی پلیٹ منیبہ سے چھینتا وہ معظمہ کی طرف آیا تھا جس نے فوراً پیر سمیٹ کر اسے بیٹھنے کی جگہ دی تھی۔

"تم کیوں جیلس ہو اس بے چارے سے' لڑکیوں اور افیئرز کے چکروں سے نکلو تو کوئی اچھی جاب تمہیں بھی ملے"۔

"ساری برائیاں اب نظر آ رہی ہیں مجھ میں' اس سے پہلے نابینا تھیں تم؟" وہ پھر بھڑکا تھا۔

"بھول گئیں اپنی فرمائشیں...... صبور! برگر کھانے چلیں؟ صبور! آئسکریم کھلانے کب چلو گے؟" جل کر اس نے جس طرح منیبہ کی نقل اتاری تھی معظمہ بمشکل ہنسی روک سکی تھی۔

"یہ فرمائشیں تو میں پہلے بھی تم سے کرتی تھی' اس گھر میں ہم تین ہی بہنیں ہیں' ہم نے تو ہمیشہ تمہیں بھائی کی نظر سے ہی دیکھا ہے"۔

"توبہ استغفار یا اللہ! میں مر کیوں نہ گیا یہ سننے سے پہلے"۔ حیرت کے شدید حملے کے ساتھ صبور نے دہائی دی تھی۔

"اپنے مطلب کیلئے تم لڑکیاں کسی بھی وقت گدھے کو بھی باپ بنا سکتی ہو"۔

"آپ سب لڑکیوں کو درمیان میں مت لائیں"۔ معظمہ سے برداشت نہیں ہوا تھا۔

"چپ کرو"۔ وہ فوراً ہی اسے جھڑک گیا تھا۔

"اور بات سنو' میری اپنی ذاتی تین بہنیں ہیں اور اللہ کا شکر ہے سب کی سب شادی شدہ ہیں' میرے ماں باپ نے تین پر اکتفا کر لیا تھا اور میں بھی ان سے مطمئن ہوں"۔ اس نے خشمگیں نظروں سے منیبہ کو دیکھا تھا۔

"اچھا اب غصہ ختم کرو' یہ تمہارا پہلا بریک اپ تو نہیں' معظمہ کے ہوتے ہوئے بار بار تمہارا اجڑا چمن آباد ہوتا رہے گا"۔ منیبہ کے مطمئن انداز پر معظمہ بل کھا کر رہ گئی تھی۔

"زیادہ اپنائیت نہ جتاؤ اب' یہ سب تم ویلنٹائن کے بعد نہیں کر سکتی تھیں۔ کتنا خوش تھا میں کہ یہ میری زندگی کا پہلا ویلنٹائن ڈے ہو گا جس میں' میں تنہا نہیں رہوں گا' مگر تم نے میری ساری خوشیوں میں آگ لگا دی واثق کے ساتھ مل کر"۔ اس کے جذباتی انداز پر معظمہ کو اس پر ترس آیا تھا۔

"چھوڑیں صبور بھائی! اس ویلنٹائن پر صبر کر لیں"۔ معظمہ ڈرتے ڈرتے بولی تھی۔

"کیا گناہ کیا ہے میں نے جو صبر کروں' تمہیں قتل نہ کر دوں"۔ وہ اس پر برسا تھا۔

"میرا مطلب تھا اچھی لڑکی ملنے تک"۔ وہ منمنائی تھی۔

"جو لڑکیاں اب تک اسے انگوٹھا دکھا گئیں ہیں مجھ سمیت وہ بھی دنیا کی بہترین لڑکیوں میں شامل ہیں"۔ منیبہ نے مضحکہ اڑایا تھا۔

"چائے لے آؤ میرے لیے ورنہ ابھی واثق کو فون کھڑکا دوں گا"۔ صبور کے دھمکی آمیز انداز پر منیبہ خشمگیں نظروں سے اسے گھورتی کمرے سے نکل گئی تھی جبکہ صبور اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جس کا چہرہ بالکل اتر گیا تھا۔

"کان کھول کر سن لو دو دن کے اندر اندر اپنی بہن سے بھی اچھی لڑکی کا بندوبست کرو میرے لیے"۔ اس کے حکم نے معظمہ کو حق دق کر دیا تھا۔

"میں نے کیا لڑکیاں بنانے کی فیکٹری کھول رکھی ہے جو اتنا شارٹ نوٹس دے رہے ہیں' بخش دیں مجھے خدا کیلئے"۔

"بہت زبان چل رہی ہے تمہاری...... انکار کا مطلب سمجھتی ہو؟ جانتی ہو کیا انجام ہو گا؟" اس کے آنکھیں نکالنے پر معظمہ کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

"پرفیوم میں بھیگا محبت و عشق کے نقاط پر مشتمل خط

میں نے لے جا کر تمہارے ابا حضور کے قدموں میں رکھ دینا ہے اور ہنٹر ان کے ہاتھ میں تھما دینا ہے"۔ اس کے سفاک لہجے پر وہ جو اسے کچا چبانے کی آرزو رکھتی تھی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔

"آپ کب تک مجھے بلیک میل کرتے رہیں گے؟" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"جب تک میری لو میرج نہیں ہو جاتی"۔ ڈرائی فروٹس مٹھی میں بھرتا وہ اطمینان سے بولا تھا۔

"پھر تو میں ساری زندگی بلیک میل ہوتی رہوں گی"۔

"میں تھپڑ مار کر چہرہ بگاڑ دوں گا"۔ ناگواری سے اسے گھورتا وہ اٹھ گیا تھا' پیچھے وہ پیچ و تاب کھاتی اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں نگلنے کی حسرت میں رہ گئی تھی۔

☆

آج بھی وہ اس وقت کو کوس رہی تھی جب شہر کے حالات خراب ہونے کی وجہ سے معظمہ کی بہت منت سماجت کے بعد صبور اسے پک کرنے اس کے کالج پہنچا تھا اور بس یہیں سے ساری خرابی شروع ہوئی تھی' اس کی ساری فرینڈز نے صبور کو بہت اچھی طرح دیکھا تھا اور کتنی اچھی طرح دیکھا اس کا اندازہ اسے دوسرے دن کالج میں ہی ہوا۔ معظمہ کا یہ کہنا ہی غضب ہو گیا کہ صبور اس کے بھائی جیسا ہے۔

"تم پاگل ہو گیا...... اتنے گڈ لکنگ کزن کو تم نے بھائی بنا رکھا ہے' عقل گھاس چرنے گئی ہے کیا تمہاری؟ اس بندے کیلئے تو میں تمہاری آستین کا سانپ بن جاؤں اور تم منہ پھاڑ کر اسے بھائی کہتی ہو' تمہیں تو اب تک اس کی محبت میں گٹے گوڈوں تک ڈوب جانا چاہیے تھا' اس سے پہلے کہ کوئی اور آ کر اس پر اپنا حق جمائے تم خود اس پر مسلط کیوں نہیں ہو جاتیں احمق اعظم"۔ بس اس کی فرینڈز جو شروع ہوئیں تو پورا ہفتہ اس کی برین واشنگ میں گزر گیا۔ ہونق زدہ بیٹھی وہ ان کے چہرے تکتی رہتی اور وہ اسے نت نئے طریقے سمجھاتیں کہ کس طرح شروعات کرنی ہے' کس طرح اسے لبھا کر صبور کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہے وغیرہ وغیرہ...... پتھر پر بھی بوند بوند گرے تو پتھر پر اثر ہوتا ہے' جیسا کہ اس کے پاس تو بہت ہی نرم اور شفاف دل تھا' کیسے اثر نہ ہوتا' سوچ و نظر کو ایک نئی سمت مل تو گئی تھی مگر وہ جانتی تھی کہ اپنی فرینڈز کے کسی بھی ٹوٹکے پر عمل کرنا اس کے بس کی بات ہی نہیں ہے' یہ ٹھیک تھا کہ اسے سب ہی کزنز کے مقابلے میں اس نے صبور کو اپنے گھر میں سب کے ہی قریب شروع سے دیکھا تھا۔ منیبہ کے ساتھ صبور کے تعلقات زیادہ دوستانہ اس لیے بھی تھے کہ ان دونوں کی اسکولنگ ساتھ ختم ہوئی تھی' وہ دونوں کلاس میٹ بھی رہے تھے' جبکہ معظمہ کیلئے وہ گھر میں بالکل ایسا ہی تھا جیسے دوسرے افراد۔

اپنی فرینڈز کے دباؤ پر اس نے نیا چاند چڑھا تو لیا تھا مگر اس کی طرف صبور کو متوجہ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہ اس معاملے میں کتنی بزدلی کے مظاہرے کر سکتی تھی اس کا ذکر اپنی فرینڈز کے سامنے کر کے وہ شرمندہ نہیں ہونا چاہتی تھی مگر قدم پیچھے بھی نہیں ہٹانا چاہتی تھی لہٰذا اپنی زندگی کی سب سے بھیانک غلطی اس نے یہ کی کہ ایک لمبے چوڑے کاغذ پر حال دل کے موتی بکھیرے تھے' نیٹ یا ایس ایم ایس جیسی سہولیات کو ٹھوکر مار کر اس نے اپنے طور پر ایک منفرد امپریشن ڈالنے کی کوشش کی تھی' کچھ جتن اٹھا کر بہادری کا غیر معمولی مظاہرہ کرتے ہوئے وہ خط صبور کے ہاتھوں تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئی تھی کسی بھی تیسرے فرد کی مداخلت کے بغیر۔ جوش و جذبات کی یلغار اس وقت ٹھنڈی پڑنے لگی جب صبور کی طرف سے مکمل خاموشی چھائی رہی۔ روز اس کے ایک دو چکر گھر پر لگتے تھے' مگر دو دن تک نہ وہ گھر آیا اور نہ ہی کسی ذریعے سے ردعمل کو ظاہر کیا' چور بنی وہ پریشان حال گھر میں گھومتی رہی تھی' ہر وقت دل کو دھڑکا لگا رہتا' اگر

صبور نے اس کے کارنامے سے اس کے ماں باپ کو باخبر کر دیا تو کیا انجام ہو گا؟ تصور کرتے ہوئے بھی اسے غش آنے لگے تھے۔

تیسرے دن تک ساری محبت سارے جذبے بھاپ بن کر اڑ گئے تھے' اس کی نمازیں طویل ہو گئیں' پوری سچائی کے ساتھ اس نے اللہ سے اپنی غلطی کی معافی مانگی کہ وہ بہک گئی تھی' ہر چیز سے زیادہ اسے اپنی عزت پیاری تھی' کسی قیمت پر وہ اپنے ماں باپ کے بھروسے' اعتبار کو دھچکا نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ تیسری رات اس نے ہر طرف سے اطمینان کرنے کے بعد اور بہت ہمت کرتے ہوئے صبور کو فون کیا تھا اور اسے یاد تھا کہ وہ کس طرح ڈر و خوف سے کانپ رہی تھی۔ صبور کی آواز سنتے ہی اس نے رونا شروع کر دیا تھا' وہ اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی تھی کہ اس نے اپنی فرینڈز کے اکسانے پر یہ کام کیا تھا اور یہ کہ اس کے دل میں ایسا کچھ نہیں جو خط میں لکھا ہے۔ وہ یقیناً اپنی پشیمانی میں صفائیاں دیتے دیتے صبح کر دیتی مگر صبور نے اسے روک دیا تھا' یہ یقین کرنے کے بعد کہ وہ اسے معاف کر چکا ہے اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

صبور نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا' نہ کوئی باز پرس نہ کوئی ڈانٹ ڈپٹ' اس رات وہ سکون سے سوئی تھی' کوئی بوجھ تھا جو کندھوں سے ہٹ گیا تھا' بہرحال اس کے دل میں صبور کیلئے بہت عزت بڑھ گئی تھی۔

دوسرے دن اس نے کالج جاتے ہی اپنی فرینڈز کو آڑے ہاتھوں لیا تھا' فساد کی جڑ تو وہی تھیں' کس طرح اسے ورغلاتی اور اکساتی رہی تھیں۔ دن پر دن گزرتے رہے' وہ اس بات کو بھولنے لگی تھی' صبور کی طرف سے بھی کوئی خدشہ نہیں تھا' مگر ایک چیز وہ یہ نوٹ کرتی رہی تھی کہ پہلے صبور سے جو بات چیت ہو جایا کرتی تھی وہ اب نہیں ہوتی۔ صبور کی آمد پہلے کی طرح ہی ہوتی تھی' گھر قریب تھا وہ بھی کسی نہ کسی کام سے یا بے وجہ ہی اس کے گھر جاتی تھی مگر اسے محسوس ہوا تھا کہ صبور اور اس کے درمیان کچھ تو گڑبڑ تھی' زیادہ غور کرنے پر انکشاف ہوا تھا کہ صبور نے سرے سے اسے مخاطب کرنا ہی ترک کر دیا تھا' اس بات کو اپنا وہم سمجھ کر اس نے کئی بار صبور کو مخاطب کیا مگر یا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا یا پھر اتنے اجنبی سپاٹ انداز میں مختصراً جواب دیتا کہ وہ اس کا چہرہ ہی دیکھتی رہ جاتی۔ اسے بہت افسوس ہوا کہ اتنی معافیاں مانگنے کے باوجود صبور اسے غلط ہی سمجھتا ہے' یہ افسوس چند دن تک اسے پریشان ضرور کرتا رہا مگر پھر اس نے بھی سب نظر انداز کر کے سر پر آتے ایگزامز کی فکر شروع کر دی تھی۔

اس دن آخری پیپر تھا جس کی خوشی میں وہ اپنی ایک فرینڈ کو ساتھ لنچ کیلئے گھر پر انوائٹ کر گئی تھی۔ راستے میں ہی صبور کا گھر تھا' اس نے سوچا کہ خالہ سے حال وغیرہ پوچھتی جائے' خلاف توقع گیٹ صبور نے کھولا تھا' پھر کچھ نہیں ہوا تھا' اپنی دوست کے ہمراہ وہ کچھ دیر میں خالہ سے اجازت لے کر اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گئی تھی۔ اسی شام وہ حیران ہوتی صبور کے بلاوے پر اس کے گھر پہنچی تھی' بہت مہذب طریقے سے صبور نے اسے گھر بلانے کی وجہ بتائی تھی جسے سن کر وہ ہکا بکا ہی رہ گئی تھی' وجہ یہ تھی کہ صبور کو اس کی وہی فرینڈ اٹریکٹ کر گئی تھی جسے وہ معظمہ کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔

معظمہ نے چاہا کہ کوئی بہانہ کر دے جیسے کہ اس کی فرینڈ انگیج ہے وغیرہ وغیرہ' مگر وہ یہ جھوٹ نہیں بول سکی تھی۔ صبور نے کہا تھا کہ وہ اس کی فرینڈ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا' نہ ہی کوئی فلرٹ اسے کرنا ہے بلکہ وہ اس سے شادی بھی کرے گا۔ اب صبور کی اتنی بڑی بات نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی فرینڈ سے بات کرے جو کہ ایک پیر پر ہی کھڑی تھی۔

معظمہ مطمئن ہو گئی تھی کہ اگر اس طرح صبور کی

ناراضگی ختم ہوسکتی ہے تو یہ اچھا موقع ہے‘ خیر صبور اور اس کی فرینڈ کا افیئر کوئی مہینہ بھر ہی چلا ہوگا کہ اچانک ہی اس کی فرینڈ کا رشتہ کہیں خاندان میں ہی طے ہوگیا۔ معظمہ نے اسے شرم دلائی تھی کہ وہ کوئی اسٹینڈ کیوں نہیں لیتی‘ جواباً اس کی فرینڈ نے کہا کہ اس معاملے میں وہ اپنے گھر والوں کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتی۔ بقول اس کے اس کا منگیتر صبور سے زیادہ بہتر ہے اور یہ کہ اسے صبور جیسے روکھے پھیکے انسان کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی فرینڈ کے اس طرح آنکھیں بدل جانے پر معظمہ نے افسوس کے ساتھ اس سے ناراضگی کا اظہار کیا تھا مگر حیرت انگیز طور پر صبور پر اس چیز کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے معظمہ سے کہا کہ وہ ایک وسیع فرینڈز سرکل رکھتی ہے اور یہ کہ وہ جس لڑکی کو چاہے اس کے سیکنڈ افیئر کیلئے چن سکتی ہے۔

اس بار بھی وہ انکار نہیں کر سکی تھی‘ مگر اس کیلئے سمجھنا مشکل تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ دوسری بار بھی شروع ہونے والا افیئر زیادہ دن تک نہیں چلا تھا‘ وجہ وہی پہلے افیئر جیسی تھی۔ اپنے تیسرے افیئر کیلئے بھی جب صبور نے مطالبہ شروع کیا تو وہ ضبط نہیں کر سکی تھی‘ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اب اس کام میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی جس پر صبور نے اس پر الزام لگایا کہ اس کے ناکام افیئر کی ذمہ دار وہی ہے اور یہ کہ اگر اس نے انکار کیا تو وہ اس کا لکھا ہوا محبت نامہ منظر عام پر لے آئے گا۔ صبور کی اس دھمکی نے اس کے ہوش اڑا دیئے تھے‘ وہ تو یہی سمجھتی رہی تھی کہ صبور اس خط کو ضائع کر چکا ہوگا‘ وہ بری طرح پھنس چکی تھی‘ اس کے پاس حکم کی تعمیل کے علاوہ کوئی راہ نہیں بچی تھی‘ اسے معلوم تھا کہ صبور کتنا اسٹریٹ فارورڈ ہے۔ منیبہ کو وہ کسی چیز کی بھنک تک نہیں لگنے دینا چاہتی تھی کہ وہ صبور سے بھی دو چار ہاتھ آگے تھی۔ پورا سال گزر گیا‘ صبور اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھے بلیک میل کرتا رہا تھا اور وہ ہوتی رہی تھی‘ حالانکہ وہ دل سے چاہتی تھی کہ صبور کا کوئی تو افیئر کامیاب ہو جائے تاکہ اس کی جان چھوٹے مگر یا تو صبور کی خواہش کے مطابق اس کی قسمت میں لو میرج نہیں تھی یا پھر خود معظمہ کی اپنی قسمت مشکوک تھی۔

☆

”دو دن کی مہلت کا مطلب تھا کہ دو دن کی ہی مہلت“۔

منیبہ آتے جاتے اسے یہ بات یاد دلاتی رہی تھی‘ اپنی طرف سے تو وہ اسے چھیڑ ہی رہی تھی مگر معظمہ کا دل چاہا کہ اسے کھری کھری سنا ڈالے‘ اب تو اس کے پاس کوئی فرینڈ بھی نہیں بچی تھی صبور پر وارنے کیلئے۔

کتنی منت سماجت کی تھی اس نے منیبہ کی‘ صبور کی اچھائیاں بھی بیان کی تھیں جو سرے سے اس میں تھیں ہی نہیں‘ صبور جاب لیس تھا مگر ہے تو انجینئر اور یہ کہ منیبہ کی گز بھر کی زبان ابھی صبور برداشت کر لیتا ہے تو بعد میں خالہ بھی کر لیں گی۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح اس نے صبور کیلئے منیبہ کو راضی کر کے درجن بھر افیئرز تو مکمل کر ہی دیئے تھے اور اس کا انجام بھی پہلے افیئرز جیسا ہی ہوا تھا اور اب معظمہ کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ موقع ملتے ہی وہ آج پھر صبور کے کمرے کو چھان کر اپنا اعمال نامہ ڈھونڈ رہی تھی حالانکہ یہ کام وہ پہلے بھی کرتی رہی تھی‘ کئی بار صبور نے رنگے ہاتھوں اسے پکڑا تھا اور وارننگ کے ساتھ اپنے کمرے سے نکالا تھا۔ شیلف کھنگالتے ہوئے ایک کتاب اس کے ہاتھ لگی تھی جسے کھولتے ہی باسی پھول کی مہک اس کے اردگرد پھیل گئی تھی‘ غم و غصے سے اس کا برا حال ہو گیا تھا‘ خط کے ساتھ جو پھول اس نے رکھا تھا اس کائیاں انسان نے اسے بھی شاید ثبوت کے طور پر سنبھال رکھا تھا‘ اس سے پہلے کہ وہ سوکھے گلاب کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا ارادہ کرتی کسی نے سرعت سے وہ کتاب اس کے ہاتھ سے نکال لی

تھی۔ صبور کی موجودگی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا‘ اس نے دوبارہ شیلف سے کتابیں نکال کر چیک کرنی شروع کر دی تھیں۔

”کیا ڈھونڈ رہی ہو؟“ سوال آیا تھا۔

”وہی چیز جسے مہرہ بنا کر آپ مجھے استعمال کر رہے ہیں“۔ غصیلی نظروں سے اس نے صبور کو دیکھا تھا۔

”اور تمہیں لگتا ہے کہ وہ چیز تمہیں مل جائے گی“۔ اس کے استہزائیہ لہجے پر معظمہ نے سلگ کر اسے دیکھا تھا۔

”میں آج آر یا پار کر کے رہوں گی‘ میں خود سب کو بتا دوں گی کہ میں نے کیا کام کیا تھا جس کا فائدہ آپ اٹھاتے جا رہے ہیں“۔

”سب کو خود ہی اپنے کارنامے سے آگاہ کرو گی؟ اتنی بہادر کب سے ہو گئی ہو تم؟“ وہ اسی لہجے میں بولا تھا۔

”نفرت محسوس ہوتی ہے مجھے آپ سے‘ جس کام کیلئے میں آپ سے معافی مانگ چکی ہوں اس پر آپ مجھے مزید بے عزت نہیں کر سکتے‘ سمجھے آپ“۔ وہ ہتھے سے اکھڑی تھی۔

”بے عزت میں نے تمہیں نہیں بلکہ تم نے مجھے کیا ہے اور اب تک کر رہی ہو“۔ اس کے سخت لہجے نے معظمہ کو دنگ کیا تھا۔

”پہلے خط لکھ کر تم نے مجھ سے محبتوں کے اظہار کر کے مجھے آسمان پر پہنچا دیا اور تیسری ہی رات فون پر آنسو بہاتے ہوئے مجھ سے کہتی ہو کہ تم سے غلطی ہوئی‘ تمہاری دوستوں نے تمہیں ورغلایا تھا‘ تمہیں تو معلوم ہی نہیں محبت کرتے کیسے ہیں۔ بہت اچھی طرح آسمان سے کھینچ کر زمین پر پٹخا تھا تم نے مجھے“۔ اسکے خونخوار انداز نے معظمہ کے قریب ایک الارم بجایا تھا۔

”مجھے لگا کہ آپ شدید ناراض ہیں‘ آپ نے گھر آنا جانا بھی چھوڑ دیا تھا“۔ اس کی زبان لڑکھڑائی تھی۔

”میری زندگی کا وہ پہلا موقع تھا‘ جوابی خط تیار کرنے کیلئے کچھ دن تو دیتیں فون کھڑکانے سے پہلے۔ ادھورا خط پھاڑ کر ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے میں چاہتا تھا تمہیں توڑ پھوڑ کر اس میں پھینکوں‘ تمہیں کیا لگ رہا تھا میرا دل توڑ کر میرے جذبات سے کھیل کر تم چند آنسو بہا کر بچت کر لو گی اپنی“۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو‘ میں آپ کو بھائی کہتی ہی نہیں سمجھتی بھی ہوں“۔

”بکومت...... لو لیٹر لکھتے ہوئے تمہیں یہ سب یاد تھا؟“ اس کے جھڑکنے پر معظمہ کا چہرہ فق ہوا تھا۔

”پہلے میں نے سوچا کہ شاید خوف کی وجہ سے تم مکر گئی ہو‘ ایک امید کے تحت میں نے تمہاری دوست پر نظر ڈالی کہ شاید تمہیں اپنا اظہار محبت یاد آ جائے مگر نہیں...... ایک کے بعد ایک نہ صرف تم نے اپنی دوستوں کی لائن میرے سامنے لگا دی بلکہ اپنے بچاؤ کیلئے اپنی ہی بہن کو سامنے لے آئیں‘ وہ تو شکر ہے منیبہ نے اس چیز کو مذاق میں لیا تھا اور جس قسم کی تمہاری فرینڈز تھیں...... خدا کا شکر ہے میری نیکیاں کام آ گئیں‘ میں جانتا ہوں انہوں نے تمہیں آج تک یہ سچ نہیں بتایا ہوگا کہ کس طرح میں نے انہیں ہری جھنڈی دکھا دی تھی“۔ صبور کے انکشاف پر وہ حیرت کے سمندر میں ڈوب گئی تھی۔

”اور اسی پر بس نہیں کیا تم نے‘ تم نے مجھے یہ باور کروا دیا کہ واقعی تمہیں مجھ سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں ہے‘ مزید یہ کہ میری دھمکی کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے تم نے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا۔ زندگی کے اتنے سال ساتھ گزارنے کے بعد بھی میں تمہارے لیے قابل اعتبار نہیں ہوا‘ تمہیں یہ لگتا رہا کہ میں کسی بھی وقت تمہارے کارنامے سے تمہارے گھر والوں کو آگاہ کر دوں گا‘ اسی لیے تم میری ہر بات مانتی رہیں۔ اول درجے کی بزدل اور بے وقوف ہو تم...... اگر میری جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو جانتی

ہو بلیک میلنگ کے چکر میں تمہارے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا تھا''۔ اس کے بری طرح گھرکنے پر معظمہ کا سر جھک گیا تھا۔

''اگر تمہیں لگتا ہے کہ تم سے غلطی ہوئی ہے تو کیا اسے چھپانے کیلئے تم سب کچھ داؤ پر لگا دو گی؟ غلطیاں سب سے ہوتی ہیں' اور تم نے ایسا کوئی بھیانک جرم نہیں کیا تھا جس نے تمہیں حد سے زیادہ بزدل بنا دیا تھا۔ کچھ ہوش کے ناخن لو' آئندہ اپنی بزدلی سے کسی کو اتنا موقع نہ دینا کہ وہ تمہیں کٹھ پتلی بننے پر مجبور کر دے''۔ گھرکنے والے انداز میں وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

''اب جاؤ یہاں سے' کھڑی کیوں ہو''۔ اس کی خاموشی پر صبور کے تیور بگڑے تھے۔ سر جھکائے وہ جاتے جاتے رکی تھی۔

''وہ......خط......''

''نہیں ملے گا وہ خط...... اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا قبر میں''۔ بکھری کتابیں سمیٹتا وہ غرایا تھا۔

''نہیں...... میں کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی''۔ اس کی ہچکچاہٹ پر صبور نے اسے دیکھا تھا۔

''آپ کو اس خط نے سنجیدہ کر دیا تھا؟'' وہ بمشکل اتنا ہی بول سکی تھی۔

''تمہارے اس جھوٹ کے پلندے کی مجھے پرواہ نہیں ہے مگر اس پھول نے ضرور میرا دماغ خراب کر دیا تھا جو پہلی اور آخری بار کسی لڑکی کی طرف سے مجھے ملا تھا''۔ صبور کے خشمگیں لہجے پر وہ پھر رکی نہیں تھی۔

☆

''یہ صبور اتنا مہربان کب سے ہو گیا کہ ایک ہی بار کہنے پر تمہیں پارلر لے جانے پر رضامند ہو گیا''۔ منیبہ کی حیران آواز پر وہ بس ایک پل کیلئے اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''آ گیا ہے وہ اب جلدی کرو' اور یہ اتنے فیشن کیا ویلنٹائن ڈے کی خوشی میں کر رہی ہو؟ معلوم ہے ناں وہ چادر کے بغیر تمہیں اپنی بائیک کے قریب بھی نہیں آنے دے گا''۔ منیبہ نے اسے یاد دلایا تھا اور پھر کمرے میں آتے صبور کو دیکھا تھا۔

''میں تو سمجھ رہی تھی کہ آج ویلنٹائن تم کمرے میں بند ہو کر میرے غم میں گزار دو گے''۔ منیبہ نے شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''ابھی اتنے بھیانک دن نہیں آئے مجھ پر''۔ وہ بولا تھا۔

''ہاں وہ تو نظر آ رہا ہے''۔ منیبہ نے معنی خیز نظروں سے ایک نگاہ معظمہ پر ڈالی تھی جو ڈریسنگ کے سامنے کھڑی تھی۔

''میں نے سنا ہے کہ تمہارا کوئی چاہنے والا' چھپا ہوا پرستار بڑی پابندی سے گھر پر تمہارے لیے پھول بھیج رہا ہے' ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ تمہیں اس کی خبر نہ ہو' عشق و مشک چھپتے نہیں' اور سنو! اس بار افیئر کے چکر میں اسے بھی نہ گنوا دینا''۔ منیبہ نے نصیحت کی تھی۔

''فکر نہ کرو اس بار میرا افیئر شادی تک پہنچے گا مگر یہ تو کنفرم ہو جائے کہ پھول بھیجنے والی کو معلوم بھی ہے سرخ گلاب کسی کو دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے''۔ ڈریسنگ سے پرفیوم اٹھاتے صبور نے ایک مسکراتی نظر معظمہ پر ڈالی تھی جو کانوں میں ٹاپس ڈالتی سرخ چہرے کے ساتھ نظر چرا گئی تھی۔ سرخ گلاب کسی کو دینے کا مطلب وہ اچھی طرح جانتی تھی اور صبور کا یہ شکوہ بھی دور کر چکی تھی کہ اس کی طرف سے ملنے والا پھول صبور کی زندگی کا واحد اور آخری پھول ہرگز نہیں تھا۔ ویسے بھی اس کی لغت میں دل کے قریب رہنے والوں سے محبت کا اظہار کرنے کیلئے کوئی خاص وقت یا دن پہلے بھی مخصوص نہیں تھا۔ ہر دن گلاب کے پھول نہ سہی بس گلاب جیسی کوئی بات ہی کافی ہوتی ہے زندگی کو مہکانے کیلئے۔

☆

شازیہ مصطفیٰ عمران

قسط نمبر 8

سلسلے وار ناول

کبھی عشق ہو تو پتہ چلے



لائبہ' شیبا کے پاس آئی ہوئی تھی اور ساری تفصیل اسے بتا رہی تھی۔ شہران لاؤنج سے گزر کے اوپر جا رہا تھا' چونک کے رک گیا۔

''میں تو حرما باجی کی منگنی پر بھی نہیں جاؤں گی' دیکھنا کیسے مجھے بار بار بلوانے بھیجے گی''۔ لائبہ کو بہت غصہ آ رہا تھا۔

''دوستوں میں تو ایسی ناراضگی چلتی رہتی ہے' آپ چلی جایئے وہ خود ناراضگی بھول جائیں گی''۔ شیبا نے سمجھایا۔

''شیبا! تمہیں نہیں پتہ یہ لیل ماہ ہمیشہ خود لڑائی کرتی ہے اور اوپر سے اکڑ کے بیٹھ جاتی ہے''۔

''چلئے چھوڑیئے آپ دونوں میں دوستی بھی تو بہت ہے''۔

شہران دروازے کے ساتھ ہی لگ کے کھڑا سب سن رہا تھا۔ تین چار دن سے دیکھ تو رہا تھا لائبہ اور لیل ماہ یونیورسٹی کیلئے ساتھ نہیں نکلتی تھیں' اب سمجھ آیا دونوں میں جھڑپ ہوگئی ہے۔

''یہ بتایئے حرما باجی کی منگنی ہو کہاں رہی ہے؟''

''ان کے ابو کے کوئی جاننے والے ہیں ان کے اکلوتے بیٹے سے ہو رہی ہے' کل ہی تو ہے' میں کل شام میں تمہاری چھت پر آ جاؤں گی وہاں گلی کا سارا منظر صاف نظر آتا ہے''۔

''نہیں لائبہ باجی! وہ شہران بھائی چھت پر جانے نہیں دیتے ہیں بہت ناراض ہوں گے''۔ وہ ڈر کے فوراً ہی منع کرنے لگی۔

''شہران بھائی کو پتہ نہیں چلے گا جب وہ نہیں ہوں گے تب چلیں گے''۔

شہران نے قدم اوپر کی سمت بڑھا دیئے مگر اس کا دماغ خاصا زرخیز تھا' اسے بے چینی ہوگئی کسی طرح بھی یہ منگنی ہونے سے رکوانا ہے ورنہ تو ٹھیک نہیں رہے گا۔ وہ اپنے کمرے میں دونوں ہاتھ پشت پر ٹکائے پریشان سا چکر کاٹ رہا تھا۔

''کچھ تو کرنا ہی ہے''۔ دھڑ سے بیڈ پر بیٹھا۔

وہ شام میں کچھ دیر آرام کیلئے ضرور گھر آتا تھا۔ حمیرا بیگم سے اس کا سامنا نہیں ہوا تھا ورنہ وہ فوراً اس سے کھانے وغیرہ کا ضرور پوچھنے آتی تھیں۔ شیبا' لائبہ سے باتوں میں مصروف تھی۔ بسمہ کی بھی کوئی چہکار نہیں تھی۔ ذیشان یونیورسٹی سے آنے کے بعد چھ بجے ٹیوشن پڑھانے کو چنگ چلا جاتا تھا اور محمد احمد انہیں ادھر اُدھر پھرنے سے ہی فرصت نہیں تھی' ورنہ آتے ہی دونوں باپ بیٹے کی چونچیں ضرور لڑتی تھیں۔

''یہ تو طے ہے اسد مرزا کی دونوں بیٹیاں اسی گھر میں رخصت ہو کر آئیں گی کسی طرح بھی''۔ وہ ذہن میں منصوبے بنا رہا تھا۔

لیل ماہ کا برہم اور نفرت سے بھرا چہرہ یکدم ہی اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا' کیسے اس سے دوبدو ہو کر جواب دیتی تھی' اتنی نڈر اور پراعتماد بنتی تھی مگر جب وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا تھا پزل سی ہو کر سراسیمگی سے پیچھے ہٹ جاتی تھی۔

''میں بھی شہران احمد ہوں۔ لیل ماہ اسد نہ تمہیں اپنے قدموں میں جھکایا تو''۔ وہ بڑبڑا کے پرعزم لہجے میں گویا ہوا۔ نازک سا سرخ و سپید سراپا' بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں' نرم و نازک مومی انگلیاں' نازک سی نڈر سی لیل ماہ کو بلاوجہ ہی سوچے گیا۔

''لیل ماہ اسد! زندگی تو تمہارے ہی ساتھ گزرے گی' یہ میرا وعدہ ہے' تم ایسے مجھ سے بچ کے کہیں نہیں جا سکتی ہو اور تمہارا باپ جو شریف بنتا ہے' دیکھنا کیسے تمہاری وجہ سے سر جھکا کے بات کرے گا سب سے''۔ اس پر تو انتقام کی روح گھس گئی تھی۔ اسد مرزا کا نفرت انگیز اور نخوت زدہ انداز وہ کبھی نہیں بھولا تھا۔

''پہلے تمہیں اپنے جال میں پھنساؤں گا ایسے کہ یاد رکھو گی' کہیں رہائی نہیں ملے گی''۔ وہ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے لیٹا ہوا تھا۔

''کل کی کہانی میں بھی تو پہلے گڑبڑ مچانی ہے''۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ حمیرا بیگم اس کے روم میں آ گئی تھیں' کھانے وغیرہ کے لئے کچھ لائی تھیں۔

''آج بڑی خاموشی سے آ کر لیٹ گیا میرا بیٹا!'' وہ حیرانگی سے اس کا پرسوچ چہرہ دیکھنے لگیں۔

''لگتا ہے گھر میں کوئی مہمان آیا ہوا ہے' میں سیدھا اوپر آ گیا''۔ وہ انجان بن کے بولا۔

''وہ لائبہ آئی ہے''۔ انہوں نے ٹرے بیڈ پر اس کے آگے رکھی۔

''خیریت تو ہے''۔ وہ کھانے میں لگ گیا۔

''ہاں وہ شیبا کے پاس آئی ہے''۔ انہوں نے اتنا ہی بتایا۔

''بسمہ نہیں ہے گھر میں؟''

''دوپہر سے کچھ بخار ہے سو رہی ہے''۔

''بخار ہے' ڈاکٹر کے پاس تو نہیں لے گئی ہوں گی''۔ وہ سن کے فکرمند ہوا کیونکہ بسمہ سب سے چھوٹی تھی' سر پر بھی سب سے زیادہ اس نے چڑھایا ہوا تھا۔

''میں نے پیناڈول کھلا دی تھی اب کچھ کم ہے بخار''۔

''میں لے جاؤں گا اسے ڈاکٹر کے پاس''۔ کھانے سے فارغ ہو کے بیڈ سے اٹھا۔

''اب ٹھیک ہے ضرورت نہیں ہے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی اتنے سے بخار میں''۔ وہ ویسے بھی کسی کو بیماری سر پر سوار نہیں کرنے دیتی تھیں۔

''بھائی کوچنگ گئے ہیں؟''

''ہاں وہیں گیا ہے''۔ وہ اس سے بہت محتاط انداز میں بات کرتی تھیں۔

''آج ابو بھی گھر پر نظر نہیں آ رہے ہیں''۔

''واہ صاحبزادے! آج تو اپنے باپ کو پوچھ لیا' خیریت تو ہے''۔ تمسخر اڑاتے ہوئے طنز کیا۔

''ظاہر ہے باپ ہیں تو پوچھنا تو پڑے گا''۔

''شہران! میرے چاند کبھی بغیر غصے کے بھی بات کیا کر' کیا لٹھ مار لہجے میں بولتا ہے''۔ وہ رنجور سی ہو جاتی تھیں۔

''اچھا''۔ وہ نرم سی آواز بنا کے بولا۔

''بتا چائے پینی ہے''۔

''نہیں چائے رہنے دیں' میں اب چلوں گا''۔ کی چین اٹھا کے آئینے کے آگے کھڑا بالوں میں برش چلانے لگا۔ مسٹرڈ پینٹ پر ہاف وائٹ ٹی شرٹ میں ہلکی بڑھی شیو میں بھی وہ ڈیشنگ لگتا تھا۔

''اتنی رات تک ٹیکسی مت چلایا کرو' جلدی گھر آیا کرو''۔ انہوں نے سرزنش کرنے کے ساتھ تنبیہ بھی کی۔

''سواریاں ہی رات میں ملتی ہیں''۔ وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایک نظر بسمہ کو دیکھا جو بے خبر سو رہی تھی۔ لائبہ لگتا ہے جا چکی تھی۔ گلی میں آیا تو شام کی سرمئی پھیل چکی تھی' مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں' یہ وقت اسد مرزا کے گھر سے نکلنے کا تھا' وہ ان کے گھر پر نگاہ ڈالتا ہوا جا رہا تھا کیونکہ کل تو اسے رنگ میں بھنگ ڈالنا ہی تھا' کچھ تو ایسا کرنا تھا کہ منگنی ہی نہیں ہو سکے' پورے وقت اس کا ذہن جانے کیا کیا تراش رہا تھا۔



مصباح کو وہ لوگ دیکھ کر چلے تو گئے تھے مگر ابھی تک جوابی فون وغیرہ کچھ نہیں آیا تھا۔ حمدان کو اس کی سب سے زیادہ فکر تھی۔ آج سنڈے تھا حمدان گھر میں تھا' عدین ابھی تک سو رہا تھا۔ وہ صبح ہی اٹھنے کا عادی تھا' ناشتے وغیرہ کے بعد ڈرائنگ روم میں بڑے صوفے پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا' فان کلر کے قمیض شلوار میں ملبوس بہت آرام سے لیٹا تھا۔

''آج کھانے میں کیا بناؤں بیٹا؟'' امی اس سے پوچھنے چلی آئی تھیں۔ حمدان نے ان کا اچار بنوانا سب چھڑوا دیا تھا۔

''کچھ بھی بنا لیجیے''۔ اس نے اخبار میں منہمک کہا۔

''عدین کو ایک گھنٹہ پہلے اٹھاؤ جب وہ کچھ سودا وغیرہ لا کے دیتا ہے''۔ وہ عدین کی سستی سے بہت نالاں تھیں۔

''بے چارے کو چھٹی بھی تو ایک ہی دن ملتی ہے' پورا ہفتہ مصروف گزرتا ہے' مجھے تو بعض اوقات اس کی شکل تک دیکھنے کو نہیں ملتی''۔ حمدان نے مسکرا کے ان کی جانب دیکھا جو اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھی برہم ہو رہی تھیں۔

''اتنی دیر تک وہ موبائل پہ کس سے میسج پر بات کرتا رہتا ہے''۔

''وہ کہتا ہے اریشماء سے''۔ انہوں نے بتایا۔

''اریشماء سے''۔ حمدان کو جھٹکا لگا' تحیر میں مبتلا ہو گیا۔ اس کی اریشماء سے اتنی بے تکلفی کب سے ہو گئی جو میسج پر باتیں ہونے لگیں۔

''بہت اچھی بچی ہے خیر خیریت پوچھتی رہتی ہے''۔ وہ اریشماء کا ذکر کر کے بہت خوش ہوتی تھیں اور جب وہ گھر آ جاتی تھی ان کا بس نہیں چلتا تھا پلکوں پر بٹھا لیں۔

''امی! میں اس کا اپنے گھر میں اتنا آنا جانا پسند نہیں کرتا' وہ میرے باس کی بیٹی ہے''۔ وہ اریشماء کو ہر طرح سے باز رکھنا چاہتا تھا۔

''یہ بات وہ مجھ سے پہلے ہی کہہ چکی ہے کہ حمدان پسند نہیں کرے گا لیکن میں پھر بھی یہاں آؤں گی کیونکہ مجھے اتنا سگوں کی طرح پیار اور اہمیت نہیں ملی ہے''۔ انہوں نے اسے بتایا۔

''پھر بھی امی! یہ ٹھیک نہیں ہے''۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتی' اگر وہ آ جاتی ہے تو آنے دو' کچھ دیر خوش ہو کر چلی جاتی ہے''۔ انہیں حمدان کی لیے دیئے والی عادت سے اکثر پریشانی ہو جاتی تھی کیونکہ وہ زیادہ کسی سے بات چیت کرنا پسند ہی نہیں کرتا تھا۔

''عدین کی اس سے اتنی دوستی ہو گئی ہے''۔

''اب میں کیا کہہ سکتی ہوں' مجھ سے کہہ چکی ہے میرا منہ بولا بھائی ہے کوئی نہیں روک سکتا مجھے یہاں آنے سے''۔

''ہوں''۔ وہ کھسیا گیا۔

''اچھا تم اس سے کچھ نہیں کہنا' تم اپنے کام سے کام رکھو اس پر توجہ کیوں دیتے ہو''۔

''میں اس پر توجہ دیتا بھی نہیں ہوں''۔ وہ جھینپ گیا۔ امی اس سے مزید بحث کرنا مناسب نہیں سمجھتی تھیں' اس لئے وہ وہاں سے ہٹ ہی جاتی تھیں۔

حمدان پورا دن ڈرائنگ روم میں لیٹا ٹی وی دیکھتا رہا' عدین اپنی پڑھائی کر رہا تھا اس کے ایگزام بھی قریب تھے۔ کافی دیر سے عدین کے سیل کی میسج ٹون بجے جا رہی تھی' حمدان سے برداشت نہیں ہوا تو اٹھا۔

''تم پڑھائی کر رہے ہو یا سیل پر میسج''۔ وہ خشمگیں نظروں سے دیکھنے لگا۔ عدین گڑبڑا گیا' وہ کتابیں پھیلائے بیٹھا تھا اور سیل ہاتھ میں تھا۔

''وہ میں تو دوست کو کچھ ایگزام کا بتا رہا تھا''۔

''عدین! پڑھائی پر توجہ دو ورنہ تمہارا سیل ضبط کر لوں گا''۔ وہ وارننگ دینے لگا۔ وہ سر جھکا کے کتاب پر جھک گیا۔ امی کے روم میں وہ پڑھائی کر رہا تھا' حمدان کے جاتے ہی سیل سائلنٹ پر لگایا۔

''باس! بگ برادر نے موقع واردات پر پکڑ لیا' میں آپ کا میسج پڑھ رہا تھا''۔ عدین نے میسج اریشماء کو سینڈ کیا۔

''اوکے میں آ رہی ہوں''۔ اس کا میسج آیا۔ عدین کو ڈر بھی لگ رہا تھا کیونکہ حمدان کا صبح سے موڈ خراب تھا اور امی نے اسے وجہ بھی بتا دی تھی۔

حمدان ٹی وی آف کر کے لیٹ گیا تھا' اخبار سارے ٹیبل پر پڑے تھے' عدین اخبار اٹھانے کے بہانے اسے چیک کرنے آیا تھا' لگتا تھا اس کی آنکھ لگ گئی ہے۔



''ارے اریشماء! کچھ دیر تو ہمارے پاس بھی بیٹھ بیٹا''۔ چچی جان' چچا جان اپنے لاڈلے سپوت کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔

''اصل میں چچی جان! میری دوست کا فون آیا تھا اس کے ساتھ میرا پروگرام ہے''۔ وہ ان کے درمیان سے اٹھنا چاہتی تھی۔ لائٹ پنک کاٹن کی شرٹ کے دامن پر ایمبرائیڈری تھی' اس پر ٹراؤزر اور جارجٹ کا ہم رنگ ایسا ایمبرائیڈری کا دوپٹہ شانوں پر ڈالے' لیئر کٹنگ بالوں کو کیچر میں کر کے پونی بنائی ہوئی تھی' تیمور کی نظر الجھ رہی تھی۔ اریشماء کی پوری کوشش تھی کسی طرح بھی وہ یہاں سے نکل جائے۔ فوزیہ سکندر اپنی بیٹی کے مزاج کو جانتی تھیں وہ کتنی الجھ رہی ہے۔

''ارے بیٹا! اس کو منع کر دو آج تمہاری چچی آئی ہوئی ہیں''۔

''چچی جان! وہ بہت جلدی ناراض ہو جاتی ہے''۔ وہ چہرے کے تاثرات بھی درست رکھے ہوئے تھی۔

''ایسی دوست سے تو فوراً دوستی ختم کر دینی چاہیے''۔ تیمور نے طنز میں ڈوب کے لقمہ دیا۔

''دوست میری ہے تمہیں کیا تکلیف ہے''۔ غرا کے اسے جھاڑ دیا۔

''اریشماء! کس طرح بول رہی ہو''۔ فوزیہ سکندر کا لہجہ خشمگیں اور سرزنش بھرا انداز اسے زچ کر گیا۔

''بھابی! بولنے دو' دونوں میں ایسی ہی نوک جھونک چلتی ہے''۔

اریشماء نے نگاہوں میں ناگواری سمو کے تیمور کو گھورا جو اس کی جانب متوجہ تھا۔

''ممی! میں چلتی ہوں ڈرائیور کے ساتھ جا رہی ہوں''۔

''میں ڈراپ کر دیتا ہوں''۔ تیمور نے اپنی خدمات پیش کیں۔

''نن نہیں میں خود چلی جاؤں گی' تمہیں راستہ بتانا پڑے گا جبکہ مجھے ڈرائیور کو بتانا نہیں پڑے گا''۔ وہ اسے ہری جھنڈی دکھاتی بیگ اٹھا کے تیزی سے نکل گئی۔ باہر آ کے سکون کا سانس بھرا' جب سے گاڑی چوری ہوئی تھی ڈرائیور کے ساتھ ہی آتی جاتی تھی' یہ بھی ڈیڈی کا آرڈر تھا۔

پہنچتے ہی عدین کو میسج کیا' وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر آ گئی' آہستگی سے گیٹ کھولا تھا۔

''حمدان ہے؟'' وہ سرگوشی میں پوچھنے لگی۔ عدین نے اشارہ کیا وہ اندر آ گئی تھی۔ امی نے اور مصباح نے تو اسے ہمیشہ کی طرح گلے لگا کے پیار کیا۔

''کچھ دیر پہلے آ جاتی تو بہت مزے دار بریانی بنائی تھی امی نے' ہم مل کر کھاتے''۔ عدین خوش ہو کر بتانے لگا۔

''کیوں آنٹی! بریانی کیا ختم ہو گئی''۔ عدین نے اشتیاق بڑھا دیا' پھر گھر سے لنچ بھی کر کے نہیں نکلی تھی' چچی جان

جو آ گئی تھیں ورنہ شاید کرکے ہی نکلتی۔

''وہ بیٹی! نیچے کے چاول رہ گئے ہیں پتیلی میں لگے ہوئے''۔

''ارے آنٹی! کوئی بات نہیں' میں آپ کے ہاتھ کی بریانی چکھ تو لوں گی''۔ وہ بے تکلفی سے کچن میں گھس گئی۔

عدین اور مصباح حیرانگی سے اس کی حرکات وسکنات دیکھ رہے تھے۔ چولہے پر رکھی پتیلی کو کھولا جس میں چند لقمے ہی پڑے ہوں گے' وہ پتیلی آگے رکھ کر اسی میں شروع ہو گئی۔

''مجھے تو شرمندگی ہو رہی ہے' ذرا بھی تمہارا پتا ہوتا تو میں تمہارے لئے الگ نکال کے رکھ دیتی''۔ امی کچن میں چلی آئیں' پلیٹ میں نکالنے لگیں۔

''آنٹی! ان آداب میں نہیں پڑیں' مجھے پتیلی میں کھانے میں زیادہ مزہ آ رہا ہے''۔ وہ ہاتھ سے ہی چھوٹے چھوٹے لقمے بنا کے کھانے لگی' عدین کو بہت دلچسپ لگ رہی تھی۔

''اگر کوئی دیکھ لے آپ کو تو یقین نہیں کرے گا کہ آپ اور اس طرح کھا رہی ہیں''۔

''مجھے کسی کو یقین کروانا بھی نہیں ہے''۔ وہ مزے لے لے کے کھا رہی تھی' مصباح نے پانی کا گلاس اس کے پاس رکھا۔

''بہت مزے کی ہے آنٹی بریانی تو''۔

حمدان کو پیاس محسوس ہوئی تو وہ ڈرائنگ روم سے اٹھ کر آ گیا تھا مگر کچن کا منظر دیکھ کر تو سکتے میں آ گیا۔ وہ کتنے مزے سے پتیلی میں ہاتھ ڈال ڈال کے کھا رہی تھی' آہٹ تک محسوس نہیں ہوئی وہ کب اندر آئی۔

''مصباح! پانی دینا''۔ گمبھیر آواز پر وہ سب ہی چونک کر پلٹے تھے۔ اریشماء کا سانس رک گیا' ہاتھ اس کا رک گیا' پشت پھیرے ہوئی تھی۔ عدین سائیڈ پر ہو گیا۔ امی نے اس کیلئے پانی نکالا اور گلاس تھمایا۔

''ڈیلیکیٹس ہمارے گھر میں ختم ہو گئی ہیں جو انہیں پتیلی میں کھانا پڑ رہا ہے''۔ گلاس خالی کر کے عدین کو دیا۔ سب کی دبی دبی ہنسی نکل گئی' اریشماء شرم سے سیدھی تک نہیں ہو رہی تھی۔

''کہتے ہیں پتیلی میں کھانے سے شادی میں بارش ہوتی ہے''۔ عدین کی بے ساختگی پر اریشماء کو زور کا اچھو لگ گیا۔ مرچیں لگتا تھا دماغ میں چڑھ گئی ہوں' مصباح نے پانی دیا' امی بھی گھبرا گئیں' اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگیں' آنکھوں میں پانی آ گیا' حمدان بھی گھبرا گیا' عدین نے چینی کا ڈبہ اٹھایا۔ کھانس کھانس کے وہ دوہری ہو گئی' جدید اسٹائلش قیمتی سوٹ میں وہ پروقار لگ رہی تھی۔

''امی! انہیں کچن سے باہر تو نکالئے''۔ حمدان پریشان تھا۔ اریشماء نے ہاتھ دھوئے اور نکل گئی' مصباح اس کیلئے کسٹرڈ لے آئی جو اس نے بنایا تھا۔

''یہ میٹھا کھائیے مرچیں ختم ہوں گی''۔

ڈرائنگ روم میں وہ بیٹھی تھی۔ حمدان نے عدین کو گھورا جو نادم سا کھڑا تھا جبکہ اس میں قصور تو کسی کا بھی نہیں تھا۔ کافی دیر میں جا کر اس کی حالت ٹھیک ہوئی تھی۔ امی تو اس کے پاس سے ہل ہی نہیں رہی تھیں۔

''ہر وقت فضول مت بانکتے رہا کرو''۔ حمدان نے اسے سرزنش کی۔ اریشماء نے ایک نظر حمدان پر ڈالی جو کتنا پریشان اور فکر مند لگ رہا تھا۔

''سچ بات پر بھی اریشماء باجی آپ کو اچھو لگ گیا' یہ سچ ہے جو پتیلی میں کھاتا ہے بارش ہوتی ہے''۔ اس نے پھر اپنی بات دہرائی' وہ مسکرانے لگی' حمدان نے پشت پھیر لی۔

''عدین! بکواس بند کرنی ہے یا لگاؤں''۔ وہ تیز لہجہ میں وارننگ دینے لگا۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا' امی

اور مصباح مسکرا رہی تھیں' اریشماء نے اسے متوجہ ہو کر دیکھا' سنگل صوفے پر بیٹھا خاصا بے زار لگ رہا تھا۔

''اتنے خشک کیوں ہو حمدان احمد؟'' دل میں مخاطب ہوئی۔

''آپ کا بس چلے تو سانس لینے پر بھی پابندی لگا دیں''۔ عدین کو غصہ آیا تو اٹھ کر اندر چلا گیا۔

''اریشماء! آپ کو تو بھوک لگی ہوگی' میں کچھ اور لاتی ہوں''۔ قدرے توقف کے بعد مصباح گویا ہوئی۔

''نہیں نہیں مصباح! مجھے جتنا کھانا تھا کھا لیا''۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے واپس بٹھانے لگی۔ امی اندر چلی گئی تھیں' حمدان کو احساس ہوا ضرور وہ گھر سے کھانا کھا کے نہیں آئی ہوگی جب ہی وہ اتنی بے تابی سے کھا رہی تھی' وہ اپنا والٹ لینے اندر چلا گیا۔

''مصباح! یہ تمہارے بھائی گھر میں بھی نہیں ہنستے''۔ اریشماء نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''نہیں ہنستے تو ہیں مگر زیادہ تر سنجیدہ رہتے ہیں' ابو کے بعد سے ان پر زیادہ ذمہ داری بڑھ گئی ہے اس لئے چپ سے ہو گئے ہیں''۔ اریشماء سنبھل گئی' وہ سامنے ہی امی سے کچھ بات کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسی اثناء میں سیل کی بیپ نے اریشماء کو چونکا دیا جو سامنے ڈائننگ ٹیبل پر بیگ رکھا تھا اسی میں سیل تھا' فوراً ہی اٹھی' حمدان پیچھے ہو گیا' سیل نکالا کال تیمور کی تھی' کڑوا سا منہ بنایا' حمدان اس کے تاثرات پر چونکا جو ریسیو نہیں کر رہی تھی۔

''اسے پتہ نہیں کیا مصیبت رہتی ہے''۔ مجبوراً کان سے لگا لیا۔

''ہوں بولو''۔ بے زاری چہرے پر عیاں تھی۔

''میں اپنی فرینڈ کے ہاں ہوں جب مجھے آنا ہوگا میں آ جاؤں گی ڈرائیور ساتھ ہے''۔ لہجے میں ناگواری اور اکتاہٹ سموئے اس سے گویا تھی۔ حمدان سمجھ گیا تیمور ہے جب ہی اریشماء نے نخوت زدہ منہ بنایا ہوا تھا۔

''ایک بات تمہاری سمجھ نہیں آتی' ابھی میرے آنے میں ٹائم ہے پلیز مجھے کال کر کے ڈسٹرب نہیں کرو''۔ یہ کہہ کر سیل آف کر دیا۔

''تیمور تھا''۔ حمدان کو بتایا۔

''آپ نے جھوٹ کیوں بولا فرینڈ کے ہاں ہوں''۔ حمدان کو اعتراض ہوا۔

''ہاں اسے بتا دیتی تا کہ وہ گھر میں بتا دیتا اور ویسے بھی چچا جان اور چچی جان رشتہ پکا کرنے کے چکر میں ہیں''۔ حمدان کو تڑخ کے جواب دیا وہ جز بز سا ہو گیا۔

''برائی تو کوئی نہیں ہے' تیمور کزن ہے آپ کا''۔

اریشماء نے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا جو اسے کتنا اگنور کر رہا تھا اور جانتے بوجھتے یہ کہہ رہا تھا تیمور سے رشتہ جوڑ لے جبکہ جانتا بھی ہے تیمور کس نیچر کا ہے۔

''آپ اپنے مشورے اپنے پاس رکھا کریں یہ میں نے پہلے بھی کہا تھا''۔ بیگ اٹھا کے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ دل اداس ہو گیا' کتنی خوش خوش یہاں آئی تھی اور حمدان جس نے تہیہ کیا ہوا تھا ہر طرح سے مایوس کرے گا۔

''اریشماء! کیوں آپ خود کو خوار کر رہی ہیں' کچھ حاصل نہیں ہوگا' آپ کیوں سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہیں''۔ ڈرائنگ روم میں وہ دونوں تھے۔ امی اور مصباح لگتا تھا اس کیلئے کچھ بنا رہی تھیں۔ عدین اس وقت سے پھر سامنے ہی نہیں آیا تھا۔

''حمدان! یہ تو آپ کہہ رہے ہیں سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہوں مگر مجھے پتہ نہیں کیوں یقین سا ہے کبھی تو آپ کو خیال آئے گا''۔ لہجے میں حسرت وافسردگی تھی۔

"میں نے آپ کو بتایا تھا میں ایسا کبھی نہیں سوچوں گا' مجھے بہت کچھ کرنا ہے مجھے آگے جانا ہے اتنا کہ جو کچھ میری دسترس سے دور ہے سب حاصل کرنا ہے"۔ اسے تو یہ لگن تھی سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے' گاڑیوں کا شوروم واپس مل جائے' ان کا بنگلہ سب جو ابو نے گروی رکھ دیا تھا۔

"میری دعا ہے تم آگے تک جاؤ مگر جو راستے میں کھڑا ہے اسے اگنور بھی مت کرو"۔

"راستے پر کھڑے لوگوں کا اعتبار نہیں ہوتا"۔ وہ ترکی بہ ترکی بولا۔ نگاہ اس کے ملکوتی حسن میں جہاں الجھتی وہ خود کو کنٹرول کر لیتا' اریشماء کا پیکر ہی ایسا تھا جو اسے اول روز سے اپنے سحر میں لئے ہوئے تھا۔

"لو بیٹا! جلدی میں یہی بن سکا"۔ امی اور مصباح اس کیلئے ٹرے میں لوازمات سجا کے لے آئی تھیں۔ حمدان اٹھ کر باہر چلا گیا' اس کے دل پر ایک بوجھ سا آ گیا تھا۔



گلی میں ٹینٹ لگا کے مہمانوں کیلئے انتظام کیا گیا تھا' چند خاص خاص لوگ ہی مدعو تھے۔ حرما اسکائی بلیو کامدانی سوٹ میں لائٹ سے میک اپ میں سوگواری سی بیٹھی تھی۔ لیل ماہ لائٹ پرپل کاٹن کے ایمبرائیڈری کے سوٹ میں لائٹ میک اپ میں خاصی منفرد اور نمایاں نظر آ رہی تھی۔

"پلیز آپی! ایسے منہ بنا کے تو مت بیٹھو"۔ لیل ماہ اسے ٹوکے جا رہی تھی۔

حماد کے گھر والے آ گئے تھے' پھل مٹھائی وغیرہ لائے تھے' رسم کیلئے اسے باہر لے جانا تھا۔ حماد بھی ساتھ ہی آیا تھا مگر وہ بھی گم صم سا تھا' کبھی اپنی امی سے باتوں میں لگ جاتا تو کبھی دوسری خواتین سے۔

"میرے سر میں درد ہے' چلی جاؤ یہاں سے"۔

"لیل ماہ"۔ امی گھبرائی ہوئی اندر آئی تھیں' وہ چونک گئی۔

"امی! خیریت تو ہے"۔

"ہاں وہ حرما کی رسم ہو تو تم باہر اس کے ساتھ ٹینٹ میں نہیں جانا"۔

"مگر کیوں امی؟" وہ تو ہکا بکا سی رہ گئی' یہ امی کیا کہہ رہی تھیں۔

"بس تمہارے ابو نے کہا ہے"۔

"امی! اگر کوئی بات ہے تو بتایئے نا"۔ اس نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"کچھ نہیں ہے"۔ وہ باہر چلی گئیں۔

اس نے حرما سے بھی نہیں کہا ورنہ وہ سن کر اور پریشان ہو جاتی۔ لائبہ ابھی تک ناراض تھی ورنہ اس کے ذریعہ ہی اصل بات پتہ تو لگ جاتی' متفکر سی وہ چیئر پر بیٹھ گئی۔ بھابی' حرما کو لینے اندر آ گئی تھیں' حرما ہلتی جلتی ان کے ساتھ جا رہی تھی۔

"لیل ماہ! آؤ تم بھی"۔ اس نے پکارا۔

"آپ چلئے آتی ہوں"۔

"لیل ماہ! تم ادھر ہی رہو' باہر نہیں آنا"۔ بھابی نے اشارے سے اسے روکا۔

لیل ماہ کی عجیب حالت تھی' آخر بات کیا ہوئی ہے جو امی اور بھابی نے ایسا کہا۔

"کہیں وہ کمینہ شہران اس نے تو کچھ گڑبڑ نہیں مچا دی"۔ دل بیٹھنے لگا' گھبراہٹ ہونے لگی۔

ابو کے اور ارباز بھائی کے غصے کو وہ جانتی تھی اگر انہیں کچھ بھی پتہ چل گیا تو یہ تو بالکل ان دونوں کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ شہران کی دھمکیاں بھی یاد آ رہی تھیں۔

"شہران احمد! اگر تم نے کچھ بھی بکواس کی' میں تمہیں جان سے مار دوں گی"۔ اندر کے انتشار کو مٹھیاں بھینچ کے روکا۔ اپنی بہن کی منگنی کی رسم بھی تو وہ انجوائے نہیں کر سکی تھی' حرما کو بھابی اندر لے آئی تھیں۔

لیل ماہ نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے باہر ٹینٹ کا سارا منظر دیکھا۔ حماد کے چہرے پر تناؤ' ناگواری سی چھلک رہی تھی' وہ فکرمند سی ہو گئی تھی' کچھ تو بات ہے' جس کی پردہ داری ہے۔

"آپی! سب ٹھیک تو ہوا"۔ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

"لیل ماہ! میرا دل بہت گھبرا رہا ہے' کچھ تو ہے جو امی اور بھابی بھی پریشان ہیں"۔ حرما نے اپنے ٹھنڈے برف جیسے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"اچھا اب تم اتنا پریشان مت ہو' اللہ بہتر کرنے والا ہے"۔ اس نے حرما کو تسلی دی حالانکہ وہم تو اسے بھی پریشان کر رہے تھے۔

کب ڈنر شروع ہوا اور کب مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہوئے' وہ تو اندر اپنے روم میں ہی رہی' کھانے کو بھی دل نہیں کر رہا تھا صرف زہر مار کیا۔

حرما عشاء کی نماز پڑھنے لگی تھی' پورا گھر پھیلا ہوا تھا وہ اسے سمیٹنے میں لگ گئی۔ سب کچھ اسے ہی کرنا تھا' بھابی تو بچوں کو سونے کی ہدایتیں دیئے جا رہی تھیں۔

ابو' امی اور ارباز بھائی بھی وہاں موجود تھے' جانے کیا باتیں کر رہے تھے۔ مٹھائی کے ڈبے اور پھلوں کے ٹوکرے وہیں لاؤنج میں رکھے تھے۔ وہ لیل ماہ نے اٹھا کے کچن میں ہی لے جا کے رکھے مگر اس کے کان ان کی گفتگو پر ہی لگے تھے مگر سنائی ابھی تک نہیں دیا تھا۔ وہ سارے کاموں سے فارغ ہو کر 2 بجے سونے لیٹی تھی۔ حرما کو تو چپ لگ گئی تھی' وہ اس سے بھی کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔



پورا دن آفس میں اتنا مصروف گزرا تھا اس کی گردن اکڑ گئی تھی۔ روحیل سکندر نے اس کا اسلام آباد کا ٹور او کے کر دیا تھا' اس کی بھی اس پر ذمہ داری آ گئی تھی' اتنے کام تھے اور وقت کم تھا۔ مگر اسے ایک اہم میٹنگ بھی اٹینڈ کرنی تھی وہاں سے بھی دس بجے فارغ ہوا۔ اریشماء آج پورا دن آفس نہیں آئی تھی' اسے تعجب بھی تھا' کل اسے پھر اتنا ہرٹ کیا تھا اس کی ناراضگی اور خفگی تو بجا تھی۔ حمدان اس پر توجہ نہیں دینا چاہ رہا تھا مگر پتہ نہیں ذہن بار بار اس کی طرف بھٹک رہا تھا۔

روحیل سکندر نے اسے ڈنر پر گھر بلایا تھا' انہیں حمدان کو اسلام آباد کے پروجیکٹ پر کچھ ضروری ڈسکس کرنا تھا' جس وقت بائیک اس نے لمبی لال اینٹوں سے بنی روش پر کھڑی کی تو اسی وقت اریشماء کی گاڑی بھی اندر آئی تھی۔ ڈرائیور نے فرنٹ ڈور کھولا' وہ بلیک شیفون جارجٹ کے پرنٹڈ لانگ شرٹ پر دوپٹہ' بلیک ٹراؤزر پر میچنگ سینڈل میں شولڈر پر بیگ لٹکائے اسے حیرانگی سے دیکھا۔

"حمدان اور اس وقت یہاں"۔ مسکرا کے سلام دعا کی۔ حمدان خفیف سا سر ہلا کے رہ گیا' وہ اس کے سائیڈ سے نکلتی ہوئی اندر چلی گئی۔ وہ چونکا بھی آج پہلے جیسا اس میں وہ خوشی کا رنگ نہیں تھا جب بھی وہ یہاں آیا تھا۔

روحیل سکندر اس کے انتظار میں ہی بیٹھے تھے۔ وہ کچن میں نظر آئی' ہال کمرے سے کچن کا نظارہ واضح ہوتا تھا۔

"ممی! یہ زویا مجھے اٹھنے نہیں دیتی ہے میں تو آ رہی تھی"۔ وہ مسز سکندر کو صفائیاں دے رہی تھی۔

"آج تم صبح سے گئی ہوئی ہو' گھر اتنا خالی خالی ہو رہا تھا' کبھی اپنی ماں کے پاس بھی ٹک کر بیٹھا کرو"۔ وہ خفگی بھرے لہجے میں شکوہ کرتی ہوئی ہال کمرے میں ہی آ گئیں۔ حمدان مسکرا کے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اریشماء سائیڈ

پر دوپٹہ ڈالے ننگے پاؤں وہیں چلی آئی۔

''ممی! کہہ تو رہی ہوں اس کی وجہ سے دیر ہوئی ہے''۔

''تم باپ بیٹی مجھے بے وقوف سمجھتے ہو' سارا دن آفس میں سر کھپاتے رہتے ہو' ذرا جو تم لوگ میرا خیال کرو''۔ ان کی توپوں کا رخ روحیل سکندر کی سمت ہو گیا' وہ ہنس رہے تھے۔

''ڈیڈی! آپ کیوں ممی کو اتنا اگنور کرتے ہیں' ان کیلئے ٹائم نکالئے' ایسا کریں آپ دونوں کچھ دنوں کیلئے کسی پرفضا مقام پر چلے جائیے' آفس میں سنبھال لوں گی''۔ شرارتی لہجہ مسز سکندر کو اور غصہ دلا رہا تھا۔

''چپ کرو''۔ وہ جھینپ سی گئیں۔ حمدان بھی وہاں موجود تھا وہ ان ماں بیٹی کی بحث سن رہا تھا۔

''دیکھا ممی!''

''آپ اسے منع کیوں نہیں کرتے ہیں آفس میں کیوں سر کھپاتی رہتی ہے' گھر داری میں اسے ذرا دلچسپی نہیں ہے''۔ انہوں نے روحیل سکندر سے شکایت کی۔

''ممی! اب ایسے تو نہیں بولئے' کچن میں آج کل کچھ نہ کچھ بنانے لگی ہوں''۔ اسے حمدان کے سامنے ایسی بات شرمندہ کر گئی کیونکہ اس دن کیسے کھلا اور واضح طنز کر کے گیا تھا۔

''ویسے فوزیہ! تمہاری بیٹی بہت جینئس ہے' اتنا کچھ آفس کا اس نے سنبھال لیا ہے''۔ روحیل سکندر ستائشی لہجے میں گویا ہوئے۔

''یہ لڑکی ہے اسے یہاں سے رخصت بھی کرنا ہے''۔

''ممی!'' اریشماء تو احتجاجاً چیخی۔

''چپ کر ممی کی بچی...... اتنی سی لڑکی نے ہم میاں بیوی کو نچا کے رکھا ہوا ہے''۔ مسز سکندر کو تو آج بہت ہی غصہ آ رہا تھا۔ اریشماء کو حمدان کے سامنے ایسی باتیں' وہ پہلو بدل کے رہ گئی۔

''اگر آپ ماں بیٹی اپنی لڑائی کہیں اور جا کر کر لیں تو میں کچھ حمدان سے ڈسکس کر لوں''۔ انہیں حمدان کی موجودگی اور اس پر ایسی باتیں' ضرور اُسے گراں گزر رہی ہوں گی۔

''ہاں جہاں میں اس طرح کی بات کرتی ہوں آپ مجھے ٹالنے لگتے ہیں''۔ خفگی سے شکوہ کیا۔

''اریشماء بیٹا! چائے تو بنا کے لاؤ ہمارے لئے''۔ انہوں نے ان کی بات کا نوٹس لیے بغیر اریشماء کو آرڈر دیا۔

''نو نو سر! چائے نہیں''۔

''بیٹا! ڈنر میں لگتا ہے کچھ ٹائم لگے گا کیونکہ ہماری بیگم کو غصہ آ رہا ہے''۔

''سر! میں ویسے بھی اتنی جلدی نہیں کھاتا ہوں' آپ میری فکر نہیں کریں''۔ وہ جھٹ گویا ہوا۔

''ڈیڈی! چائے بناؤں؟'' اریشماء نے حمدان کو گھورا' وہ اچٹتی نگاہ ڈال کے رہ گیا۔

''چائے بعد میں بیٹا! میں کھانا لگواتی ہوں''۔ مسز سکندر کو خود ہی پھر احساس ہوا حمدان تو آیا بیٹھا ہے۔

''چلو کچن میں کھانا لگواؤ''۔ وہ اریشماء کی پشت پر تھپکی دیتی ہوئی چلی گئیں۔

روحیل سکندر اور حمدان کافی دیر گفتگو میں مصروف رہے' کھانے میں دیر ہوئی پھر اس کے بعد وہ جانے کیلئے کھڑا ہو گیا۔

''چائے بنا رہی ہوں''۔ اس نے ڈائریکٹ حمدان کو مخاطب کیا۔

''چائے کا موڈ نہیں ہے''۔

''اتنی بری بھی نہیں بناتی ہوں''۔ وہ سمجھ گئی اُس دن کی چائے کی وجہ سے وہ منع کر رہا ہے۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے' وہ جلدی ہے کافی ٹائم ہو گیا ہے۔ سر! اجازت''۔ وہ ان سے سلام دعا کے بعد نکل گیا۔ اریشماء لب بھینچ کے رہ گئی۔ مگر حمدان کی سرد مہری پر اسے رونا آنے لگا' کل بھی اس نے کتنا ہرٹ کیا تھا اور آج تو دیکھنے تک سے گریز کر رہا تھا۔

''آپ نے چائے اس لئے منع کی ہے کہ میں پھر اتنی بری بناؤں گی''۔ اس نے اُسے پورچ میں جا لیا۔

''آپ کی ممی ٹھیک کہتی ہیں آپ کو گھر داری پر توجہ دینی چاہیے''۔ بائیک پر بیٹھ چکا تھا۔

''پھر اس کے بعد گنجائش نکلتی ہے حمدان احمد کے دل میں''۔ معنی خیزی سے نگاہ جھکائے گویا ہوئی۔

''حمدان احمد کا دل بنجر ہے اس پر کسی قسم کی گنجائش نکلتی ہی نہیں ہے''۔ یہ کہہ کر وہ نکل گیا۔

اریشماء دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ اسے جاتا دیکھتی رہ گئی' جتنا حمدان اسے اگنور کر رہا تھا اریشماء میں شدت آتی جا رہی تھی۔



''پاگل لڑکی بات کو سمجھتی ہی نہیں ہے''۔ حمدان کو آج تو بہت ہی غصہ آنے لگا۔

''میں جتنا اسے رُوڈ ہو کے جواب دے رہا ہوں پھر بھی نہیں سمجھ رہی ہے' جاب چھوڑ بھی نہیں سکتا کیونکہ چھوڑنے جو نہیں دے گی''۔ پشت پر ہاتھ ٹکائے پریشان ہو رہا تھا' اسلام آباد بھی جانا تھا' کچھ بھی پیکنگ وغیرہ نہیں کی تھی۔

''امی...... امی......'' ذہن کو جھٹک کے ان کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کے بیٹھی تھیں۔

''ہوں کیا ہوا؟'' وہ گھبرا گئیں۔

''میرا بیگ تو ریڈی کروا دیں کل دوپہر کی فلائٹ ہے اسلام آباد کی''۔ وہ ان کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''مصباح نے کپڑے استری تو کر دیئے تھے اب تم خود دیکھ کر رکھ لو جو بھی کپڑے لے جانے ہیں''۔ وہ گھٹنے پکڑ کے بیڈ سے اتریں۔ حمدان کا ذہن اتنا منتشر ہو رہا تھا وہ تذبذب کا شکار تھا' امی کو بتائے یا نہیں' اریشماء بہت آگے بڑھتی جا رہی تھی اور اس کا گھر میں آنا یہ بھی ٹھیک نہیں تھا' اب تو عدین سے بھی اس کی بات ہوتی رہتی تھی۔

امی اس کے کمرے میں چلی گئیں تھیں' وہ بھی اندر آیا' مصباح کو امی نے آواز دی۔

''مصباح! بھائی کے کپڑے اس کے بیگ میں رکھ دو''۔

''بھائی! کون سے بیگ میں رکھوں؟'' مصباح اس سے مخاطب ہوئی۔

''ہاں ایسا کرو بیڈ کے نیچے دیکھو بلیک والے بیگ میں رکھ دو''۔

وہ پھر اپنی ضرورت کی چیزیں اٹھا اٹھا کے رکھنے لگا' ایک گھنٹہ پیکنگ میں لگا' سیل کی بیپ پر چونکا۔

''کس کی کال ہے؟'' وہ نہانے کیلئے باتھ روم میں گھس رہا تھا پلٹ کے آ گیا۔

''اوہ نو''۔ سر پکڑ کے بے زاری سے چتون سکیڑ کے رہ گیا۔ جتنا وہ اسے سوچنا نہیں چاہتا تھا وہ اتنا ہی اس کا راستہ روکنے کیلئے کھڑی ہو جاتی تھی۔ دونوں ہاتھ پشت پر ٹکائے سوچ رہا تھا ریسیو کرے یا نہیں' مگر پھر سوچا ہو سکتا ہے کوئی ضروری بات ہی نہ کرنی ہو۔

''یس''۔ کال ریسیو کرتے ہی گویا ہوا۔

''وہ حمدان! میں نے کال آپ کو اس ٹائم اس لئے کی ہے کہ ڈیڈی آپ کو پک کر لیں گے''۔ اریشماء وضاحت دیتی اتنی معصوم سی لگی کہ حمدان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''میں خود آ جاؤں گا ایئر پورٹ''۔

''ڈیڈی نے مجھ سے کہا میں کال کر کے آپ کو کہہ دوں مگر وہ میں بھول گئی تھی''۔ وہ کچھ افسردہ بھی لگ رہی تھی۔
''تھینکس''۔ حمدان نے اتنا ہی کہا۔
''آپ کیا سمجھے میں نے کال کیوں کی تھی؟''
''میرے خیال میں ہم اس بحث میں تو پڑتے ہی نہیں ہیں کہ کیوں کال کی تھی کیونکہ میں کہتا ہوں وضاحت وہاں دی جاتی ہے جہاں آپ کے دل میں کچھ اور ہو''۔ وہ آہستگی سے گویا ہوا۔
''حمدان! آپ نے ٹھیک کہا مگر میرے دل میں کیا ہے یہ آپ بہت اچھی طرح جانتے ہیں مگر آپ جان بوجھ کر مجھے اوائیڈ کر رہے ہیں''۔
''جب میں اوائیڈ کر رہا ہوں آپ سمجھتی بھی ہیں تو پھر کیوں اپنا ٹائم ویسٹ کر رہی ہیں''۔ بے رخی اور سرد مہری تو جیسے اس کی عادت میں شمار تھی' وہ خود ہر بات میں چڑنے لگا تھا۔
- ''یہ تو آپ سمجھ رہے ہیں میں ٹائم ویسٹ کر رہی ہوں جبکہ میں ایسا بالکل نہیں کر رہی ہوں' ٹائم آپ ویسٹ کر رہے ہیں''۔ الٹا اس پر طنز کیا۔ حمدان بیڈ کے سرے پر بیٹھ گیا' رات کے اس پہر اریشماء کی آواز اتنا سرور طاری کر رہی تھی وہ کھونے سا لگا۔
''ہاہ...... میں ویسٹ کر رہا ہوں''۔ استہزائیہ انداز میں ہلکی سی ہنسی ہنس کے رہ گیا۔
''بعض اوقات میری یہ سمجھ میں نہیں آتا میم! آپ کو میں کیا کہوں''۔
''شٹ اپ' مجھے یہ میم' میڈم آخر کیوں بولتے ہیں''۔ وہ تنگ گئی۔
''اس لیے کہ آپ باس ہیں''۔
''میں باس نہیں ہوں' باس میرے ڈیڈی ہیں''۔ فوراً تصحیح کی۔
''مگر آفس میں زیادہ تر میرا واسطہ آپ سے ہی پڑتا ہے' سر سے تو بہت کم جب میٹنگ ہو یا پھر وزٹ پر''۔
''آفس میں کام کرنا میرا شوق ہے''۔ وہ لاجواب ہو گئی۔
''اینی ویز میں بحث کرنا پسند نہیں کرتا ہوں یہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں''۔
''ایک بات بتائیے' آپ نے تہیہ کر لیا ہے کہ کبھی بھی مجھے اہمیت دے کر بات نہیں کریں گے''۔
''میں آپ سے بالکل ٹھیک طرح بات کرتا ہوں اور آپ جس طرح کی مجھ سے اہمیت چاہ رہی ہیں اس کیلئے معذرت''۔ معنی خیز لہجے میں اسے گویا جتانے لگا۔
''حمدان! کیوں کر رہے ہیں آپ ایسا؟''
''یہ لمبی بحث چل نکلے گی' مجھے نیند آ رہی ہے کل صبح پھر جلدی اٹھنا بھی ہے''۔ وہ اگنور کر کے بات کو لپیٹنے لگا۔
''حمدان! کبھی میرے بارے میں سوچ لیں' میں صرف آپ سے تھوڑی سی توجہ چاہ رہی ہوں''۔ اس کی آواز روہانسی ہو رہی تھی۔
''مجھے آپ اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے بالکل اچھی نہیں لگتی ہیں''۔
''یعنی آپ کو اچھی لگتی ہوں''۔ وہ تو چونک گئی۔
''اب میں نے ایسا بھی نہیں کہا''۔ وہ جھینپ گیا۔
''اچھا اجازت دیں' میں کل ڈیڈی ہو جاؤں گا' مگر آپ بتا دیجیے گا اللہ حافظ''۔ آگے سے اس کی بات وہ سننا ہی نہیں چاہتا تھا اریشماء نے کال بند کر دی۔

حمدان عجیب الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ اریشماء کا لب ولہجہ اس کا چہرہ اسے اتنا ڈسٹرب کرنے لگا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ کہیں پگھل ہی نہیں جائے مگر وہ ایسا کچھ کرنے والا نہیں تھا۔ روحیل سکندر اسے اتنی اہمیت دیتے تھے ان کے اعتماد کو توڑنا نہیں چاہتا تھا' ان کے ساتھ رہ کے ان کی اکلوتی بیٹی پر نگاہ نہیں رکھ سکتا تھا اور وہ تیمور اس سے ہر گھٹیا حرکت کی توقع تھی' کتنی ہی دفعہ آفس میں الجھ چکا تھا۔ اسلام آباد کے پروجیکٹ پر تو وہ تپ ہی گیا تھا پھر اریشماء نے ہی اس کی طبیعت صاف بھی کر دی تھی۔ اریشماء اسے اہمیت نہیں دیتی تھی۔ تیمور چڑ کے طنز اور اعتراض کرتا تھا' وہ تیمور سے جنگ نہیں کر سکتا تھا۔



''آپ کو خبر ہے بھائی جان' حرما اسد کی منگنی ہو گئی ہے''۔ بسمہ نے اس کے کان میں گھس کے اطلاع دی۔ وہ لیٹا ہوا کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا چونک کر اس کی صورت دیکھی' بیڈ پر پاس ہی تو بیٹھی تھی۔
''یہ کون ہے؟'' انجان بننے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔
''بھائی جان! اب بنیے مت' سامنے جو بلڈنگ ہے اسد انکل کی بیٹی ہیں ان کی منگنی ہو گئی ہے' میں نے تو ٹینٹ میں جا کر جھانکا تھا اتنے لوگ تھے''۔
''تم کیوں گئی تھیں وہاں؟'' ذیشان اٹھ کے بیٹھا' اس کی خبر لینے لگا' وہ سہم کے رہ گئی۔
''وہ بھائی جان! میں تو لیلیٰ ماہ باجی کو دیکھنے گئی تھی وہ کیسی لگ رہی ہیں' ان کی بھی تو لائبہ باجی سے لڑائی ہو گئی ہے''۔
''تمہیں بڑی سب کی خبریں رہتی ہیں''۔ ذیشان کل سے بہت الجھا ہوا تھا۔ حرما کی منگنی ہوئی تھی وہ کسی اور کی ہو گئی تھی' کب سے اسے نہیں دیکھا تھا اور اب تو جیسے ملنا تو کیا دیکھنا تک ناممکن ہو گا۔
''پتہ ہے بھائی جان! وہ دلہا مجھے تو ذرا بھی اچھا نہیں لگا''۔
''تم وہاں جھانکنے گئی تھیں یا سب کا جائزہ لینے''۔ اس نے بسمہ کے سر پر چپت لگائی۔
''میں نے تو ایک منٹ میں سب کو دیکھ لیا''۔ چٹکی بجاتے مسکرا کے تفاخر زدہ لہجے میں بولی۔
''ہوں...... اچھا اٹھو اب''۔ وہ کچھ افسردہ ہو گیا۔
''ہوں جا رہی ہوں ایک بات اور حیرانی کی بتاؤں؟''
ذیشان نے سوالیہ نگاہ اس پر ڈالی جو اس کے قریب آ گئی۔
''شہران بھائی کی آج کل ابو سے لڑائی نہیں ہو رہی' آپ خود دیکھ لیں شہران بھائی لاؤنج میں بیٹھے ہیں اور ابو بھی وہیں بیٹھے ہیں''۔
''چلو یہ تو اچھی بات ہے' اب تم بھاگو''۔
ذیشان کا ذہن و دل بوجھل اور مضطرب ہو گیا تھا۔ حرما کا خیال ایک لمحے کو دل سے نہیں نکل رہا تھا بلکہ اسے ایسا لگ رہا تھا اس کی محبت میں اور شدت آ گئی ہے' جبکہ وہ پرائی ہو گئی ہے مگر دل کے اتنے قریب کیوں ہو گئی ہے' اس کا شرمایا لجایا انداز' لب ولہجہ کتنی پاکیزہ اور پر وقار سی تھی' وہ اکثر کن انکھیوں سے دیکھتا رہتا تھا اور وہ بالکل بے خبر لیکچر سننے میں مگن ہوتی تھی۔
ابھی تو اس کی محبت پروان بھی نہیں چڑھی تھی' اس کی محبت کے پر نوچ لئے گئے تھے' اس نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ حالات اس حد تک چلے جائیں گے کہ وہ اس سے دور ہو جائے گی' وہ اسے دیکھ بھی نہیں سکے گا۔
کب دونوں میں عہد و پیمان ہوئے تھے' ابھی تو سیڑھی پر ٹھیک طرح قدم بھی نہیں رکھے تھے کہ وہ راستہ سے ہی ہٹ گئی تھی۔ اُف کیسے رہ پائے گا اس کے بغیر جبکہ اس کا گھر بالکل سامنے ہے' آتے جاتے کتنی ہی دفعہ نگاہ بھی پڑے

گی، کیسے کسی دوسرے شخص کے ساتھ برداشت کرے گا۔

''کاش لیل ماہ! تم میری بات سن لیتی تو شاید میرے اندر اتنی بے چینی نہیں بڑھتی''۔ اس دن سے لیل ماہ کی بے رخی بھی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ ہمیشہ وہ اس سے کتنی عزت سے بات کرتی تھی مگر اب ایسا کیا ہوا ہے' ذہنی خلفشار کا شکار روم سے باہر آگیا۔ شہران بڑے صوفے پر ٹانگیں لمبی کیے سو رہا تھا' شام میں گھر کا چکر ضرور لگاتا تھا' محمد احمد نیوز دیکھنے میں مصروف تھے۔ ذیشان کے قدم سیڑھیوں پر اٹھ گئے شاید تازہ ہوا میں اس کے اندر کی گھٹن کم ہو جائے۔

شہران کی اسی وقت پٹ سے آنکھ کھلی' حیرانگی سے اسے اوپر جاتا دیکھا' سرعت سے اٹھا کیونکہ اس کے سارے راز وہاں پھیلے تھے اور وہ یہی نہیں چاہتا تھا' ذیشان کو یا گھر کے کسی فرد کو خبر ہو وہ چھپ چھپ کے پڑھائی کرتا ہے۔

''بھائی! اوپر کیوں جا رہے ہیں؟'' بلیو جینز پر بلیو شرٹ میں گھبرایا بوکھلایا ہوا لگ رہا تھا۔ ذیشان کی استفہامیہ نگاہوں نے اس کا جائزہ لیا' وہ نروس سا ہو کر رہ گیا اور اس کے مقابل آکے کھڑا ہو گیا۔

''یار! ایسے ہی ہوا میں جانے کو دل کر رہا ہے''۔ وہ رک گیا۔

''آیئے آپ میرے ساتھ لانگ ڈرائیو پر چلیے' دونوں بھائی ہوا خوری بھی کر لیں گے''۔ شہران خلاف توقع اتنا نرم اور لہجہ بھی اتنا شہد آگیں' وہ تو حیرت وانبساط سے دیکھنے لگا۔

''شہران! کیا ہو گیا ہے خیریت تو ہے''۔

''کچھ نہیں ہوا چلیے میرے ساتھ''۔ زبردستی اس کا ہاتھ گھسیٹ کے باہر لے گیا۔ وہ شہران کے بدلتے روپ پر حیران تھا۔ آج سے پہلے وہ کبھی اتنے اچھے موڈ میں مخاطب ہی نہیں ہوا تھا پھر ایسی کیا بات تھی' شہران اس سے ہلکی پھلکی گفتگو کر رہا تھا۔

''خیریت تو ہے؟'' وہ استفسار کر بیٹھا۔

''جی بالکل خیریت ہے''۔ مبہم سی مسکراہٹ لیے ہوئے تھا۔

''گاڑی روکو''۔ ذیشان نے سنجیدگی سے حکم دیا۔ اس نے پبلک پلیس پر گاڑی روک دی' گاڑیوں کا اژدھام اتنا تھا اسے سائیڈ پر پارک کرنی پڑی تھی۔

''اب بتاؤ ہوا کیا ہے؟''

''ارے کچھ بھی تو نہیں' میں خود آپ کو لایا ہوں تاکہ باہر کی ہوا کا ہم دونوں کے مزاجوں پر اچھا اثر پڑے''۔ وہ ہنسی کے ساتھ گویا ہوا۔ ذیشان نے نگاہ سامنے مرکوز کر دی' ایک شاپنگ سینٹر تھا جہاں لوگوں کا رش تھا' طبیعت اتنی اداس ہو رہی تھی کہیں دل نہیں لگ رہا تھا۔

''آپ کو پتہ ہے اسد مرزا کی بڑی بیٹی کی منگنی ہو گئی ہے''۔

''ہم کچھ اور بات نہیں کر سکتے''۔ جس ذکر سے بچنا چاہ رہا تھا شہران نے وہی چھیڑ دیا۔

''بالکل نہیں' مجھے آپ کی اداسی ذرا اچھی نہیں لگتی' اور یہ تو طے ہے اسد مرزا کی دونوں بیٹیاں ہمارے گھر ہی آئیں گی''۔ ازلی ضد' ہٹ دھرمی عود کر آئی۔

''شہران! کیوں شریف لوگوں کیلئے مسئلے پیدا کرو گے''۔ رنجور مغموم اور افسردہ ہو رہا تھا۔

''شریف لوگوں نے ہی تو مجھ جیسے انسان کو مشتعل کیا ہے''۔

''شہران! گاڑی چلاؤ اور مجھے گھر ڈراپ کرو''۔ لہجہ اتنا سخت اور درشت تھا کہ وہ لب بھینچ کے رہ گیا۔ مگر دل میں تو مصمم ارادہ باندھ ہی چکا تھا جو کرنا ہے۔

☆......☆......☆

گھر میں کچھ ہلچل سی تھی۔ لیل ماہ تو تجسس کے مارے ابو اور امی کے روم کے باہر کھڑی ہو کر سب باتیں سن رہی تھی' وہ ساکت رہ گئی جو کچھ اس نے سنا تھا۔

''یہ بکواس کی کس نے ہے''۔ اسد مرزا کی گرجدار غصہ سے بھری آواز نے لیل ماہ کو ڈرا دیا۔

''مجھے خود سمجھ نہیں آرہا یہ ہو کیا رہا ہے''۔ امی تو سر تھام کے بیٹھی تھیں۔

''تم پوچھتیں تو''۔

''بہت پوچھا' یہی بول رہی تھیں آپ نے ہم سے چھپایا اور الٹا ہمیں کہہ رہی ہیں''۔ وہ روہانسی ہو رہی تھیں۔

''میری بچی' ابھی تو مہینہ بھی نہیں ہوا ہے' کتنا کہا تھا میں نے اچھی طرح دیکھ بھال کر لیں مجھے وہ لڑکا ٹھیک نہیں لگ رہا ہے''۔

''پہلے سے کیوں دہائیاں دیتی ہو ابھی انہوں نے کچھ کہا تو نہیں ہے''۔ اسد مرزا خود پریشان ہو رہے تھے۔

''اگر رشتہ انہوں نے توڑ دیا تو......''

''ایسے کیسے توڑ سکتے ہیں''۔ وہ ان کی بات کاٹ کے گویا ہوئے۔

''اتنا کچھ سننے کے بعد آپ یہ کہہ رہے ہیں''۔ امی تو حیران تھیں' کہ انہیں ابھی بھی ذرا خیال نہیں آرہا ہے۔

لیل ماہ الٹے قدموں واپس روم میں آگئی' یہ سب اس نے کیا سنا تھا دل گھبرانے لگا تھا۔ حرما عصر کی نماز پڑھ رہی تھی' ابھی اسے بتا کے پریشان بھی نہیں کرنا چاہتی تھی' لائبہ سے بھی اس کی ہنوز ناراضگی تھی' کیا کرے اس ٹائم ابو بھی گھر پر تھے وہ جا بھی نہیں سکتی تھی۔

''میری پیاری بہن کے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے''۔ سوچنے لگی۔

''کہیں ذیشان احمد تمہاری بددعا تو نہیں لگ گئی''۔ وہ کھڑی ہو گئی۔

''نہیں وہ ایسا نہیں' کیوں بددعا دے گا' آپی سے محبت کرتا ہے اور ایسا کچھ وہ سوچتا بھی نہیں ہوگا''۔

''کیا ہوا ہے اتنی چپ کیوں ہو؟'' حرما نماز سے فارغ ہو کر اس سے تشویش بھرے لہجے میں پوچھنے لگی۔

''کک کچھ نہیں''۔ اچھل گئی۔

''پھپھو! آپ کو دادی جان بلا رہی ہیں''۔ حمزہ اسے بلانے آیا' وہ اٹھ کر چلی گئی۔

حرما لب کچلتی ہوئی بیڈ کے سرے پر بیٹھ گئی۔ ذہن بھٹک بھٹک کے ذیشان احمد کی طرف چلا جاتا تھا۔ وہ معصوم سا انسان۔

''پتہ نہیں مجھے سوچتا بھی ہوگا یا نہیں''۔ وہ دل میں خود سے مخاطب ہوئی۔

''کاش ذیشان احمد! تم اور میں ملے ہی نہ ہوتے' نہ تمہارا دل ٹوٹتا نہ میرا دل ٹوٹتا''۔ کھڑکی میں آکر کھڑی ہو گئی۔ بے کل بے چین اور رنجور سی رہنے لگی تھی' منگنی ہونے کے بعد بھی حماد کو دیکھ کر اس کے دل نے دھڑکنا ہی شروع نہیں کیا تھا نہ ہی دھڑکنیں شور مچاتی تھیں۔

مگر جب بھی ذیشان کو سوچتی افسردہ ہو جاتی' اس کا سنجیدہ اور پروقار انداز اس کی آنکھوں میں احترام پیار کا رچاؤ' مبہم سے الفاظ میں محبت کا اظہار' وہ جب بھی دیکھتا اتنی مخمور سی نگاہوں سے دیکھتا کہ اس کے ہاتھوں سے پسینہ پھوٹنے لگتا' دل کی دھڑکن بڑھ جاتی اور جب وہ قریب آتا اس کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگتی تھیں' گھبرا کے نگاہ چراتی لب بھینچ لیتی' شرمایا شرمایا انداز وہ مسکرا دیتا تھا۔

''ذیشان احمد! کیسے رہوں گی میں تمہارے بغیر' میرے دل و دماغ میں تم... اپنے اس دل کی سرزمین پر

تمہارے ہی قدموں کی آہٹ ہے' پتہ ہے تم مجھے نہیں مل سکتے مگر پھر یہ دل کیوں اتنا ویران ہے' کیوں دل سے تمہاری یاد نہیں جاتی' کیوں مجھے اتنا یاد آئے جارہے ہو"۔ کرب سے لب کچل ڈالے۔ اُسی وقت گھر میں شور اٹھا' حرما نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا۔ لیلیٰ ماہ پریشان سی ہوگئی' منہ پر ہاتھ رکھ کر جیسے اپنی آواز کو گھونٹ رہی تھی۔

"لیلیٰ ماہ! کیا ہوا ہے؟" وہ گھبرائی ہوئی اس کی حالت دیکھنے لگی۔

"آپی! وہ وہ اچھا نہیں ہوا یہ"۔ سر پکڑ کے وہ روتی چلی گئی۔

"بات کیا ہے لیلیٰ ماہ! بتاؤ"۔ اس کا دل بھی دھڑ دھڑ کرنے لگا' باہر دیکھتی تو کبھی لیلیٰ ماہ کو دیکھتی۔

"آپی! حماد کی امی اور بھابی آئی ہیں"۔

"پھر کیا بات ہوئی ہے' کیوں روئے جارہی ہو میرا دل بیٹھ رہا ہے"۔ حرما کی خود حالت غیر ہونے لگی۔

"وہ حماد کی امی نے کہا ہے کہ آپ نے اپنی چھوٹی بیٹی کو کیوں چھپا کے رکھا' حماد کو وہ پسند آئی ہے جبکہ حرما کا رشتہ تو آپ کے پڑوس میں کسی ذیشان سے طے ہے"۔

"کیا......؟" وہ تو بیٹھے سے کھڑی ہوگئی۔ یہ کیا سن رہی تھی ایسی بات' یہ اڑائی کس نے تھی؟ حرما کے تو ہاتھ پاؤں سے لگتا تھا جان نکل گئی ہو۔

"آپی! ابو بہت غصے میں ہیں اور ان کی بھابی نے اتنی باتیں سنائی ہیں کیا بتاؤں"۔ وہ روئے جارہی تھی۔

"ابھی ہیں یا چلی گئیں؟"

"رشتہ توڑ کے گئی ہیں اور یہ کہہ کر گئی ہیں کہ آپ......" آگے لیلیٰ ماہ سے بولا بھی نہیں جارہا تھا۔

"کیا بولا ہے"۔ حرما کا تو لگتا تھا سانس رکنے لگا ہو۔

"آپ کی بیٹی کا عشق چل رہا ہے آپ کو یہ تک خبر نہیں"۔

"کیا......" وہ تو دھک سے سینے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھتی چلی گئی' حرما کے حواس بھی خراب ہونے لگے۔

"آپی! تم تو خود کو سنبھالو"۔ لیلیٰ ماہ بوکھلا گئی۔

"لیلیٰ ماہ! اب کیا ہوگا؟" وہ ابو کے غصے کو جانتی تھی۔

"کچھ نہیں ہوگا' حماد کی ماں اور بھابی بکواس کر کے گئی ہیں"۔ وہ حرما کو تسلی دینے لگی مگر ڈر تو اسے بھی لگ رہا تھا کیونکہ ذیشان احمد کا نام تک بتا گئی تھیں' ابو تو سن کے بھڑک ہی اٹھے تھے' ان کی خشمگیں اور قہر برساتی نگاہیں لیلیٰ ماہ پر اٹھیں تو وہ تو منہ پر ہاتھ رکھ کر بھاگ گئی تھی۔

"لیلیٰ ماہ! میرا دل گھبرا رہا ہے"۔

"اف آپی! ایک تو تم پریشان ہونے لگتی ہو' کچھ نہیں ہوگا"۔ وہ اسے دلاسے دینے لگی' مگر حرما تو وحشت زدہ اور حواس باختہ ہورہی تھی' اگر ابو کو ذرا بھی ایسی ویسی بات کا علم ہوگیا تو وہ اسے تو سنائیں گے مگر گھر میں ایک قیامت برپا ہوجائے گی اور امی انہیں کتنی سننے کو ملیں گی' وہ روئے جارہی تھی' لیلیٰ ماہ الگ پریشان تھی۔

☆

حمدان تو اُسے اور فوزیہ سکندر کو ایئرپورٹ پر دیکھ کر حیران ہوگیا تھا' وہ بھی ساتھ ہی اسلام آباد جارہی تھیں' حمدان پورے سفر میں کوفت میں مبتلا آیا تھا' اریشماء جو اتنا چہک رہی تھی اور وہ جتنا محتاط ہو کر بات کرتا تھا وہ اتنا ہی قریب آگئی تھی۔

"نہیں سر! میں ہوٹل میں رک جاؤں گا"۔ وہ لوگ رات میں آٹھ بجے اسلام آباد پہنچے تھے۔ اریشماء لانگ اسٹائلش شرٹ پر میچنگ ٹراؤزر میں ہمیشہ کی طرح آج بھی منفرد لگ رہی تھی' اس کے چتون تن گئے تھے۔

"جانے کیوں اتنا روڈ رہتا ہے"۔ وہ بڑبڑائی۔

"ارے حمدان! ہمیں بالکل اچھا نہیں لگ رہا کہ تم ہوٹل میں رہو اور ہم اپنے دوست کے گھر قیام کریں"۔

"سر! آپ کی بات اور ہے"۔ وہ چاروں ہی کیب میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حمدان فرنٹ سیٹ پر تھا جبکہ وہ تینوں پیچھے کی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔

"ڈیڈی! میرا جہاں تک خیال ہے جمال انکل کو ان کے وہاں رہنے پر بالکل اعتراض نہیں ہوگا"۔ اریشماء نے گویا جتایا۔ حمدان سپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھا تھا۔

"اگر منع کر رہا ہے تو رہنے دو"۔ فوزیہ سکندر سمجھ گئی تھیں حمدان کی طبیعت کچھ الگ تھلگ سی ہے' وہ زیادہ کسی سے غیر ضروری بات کرنا پسند نہیں کرتا۔

"حمدان! آپ ہمارے ساتھ ہی جائیں گے"۔ روحیل سکندر نے اس کا غور و تردد سب رد کر دیا تھا۔

نیوی کے پوش ایریے میں وہ لوگ داخل ہوگئے تھے۔ روحیل سکندر نے اپنے دوست کو نہیں بتایا تھا وہ لوگ آ رہے ہیں۔ جمال انکل اور آنٹی نے ان کا پرجوش استقبال کیا تھا' یوں اچانک سے ان کے آنے پر وہ سب بہت خوش ہوئے تھے۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا تھا' تینوں ہی اریشماء سے کافی چھوٹے تھے۔

"سر! مجھے جانا ہے"۔ حمدان خوبصورت سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کے بھی اکتا گیا تھا۔ اریشماء کو اس کی ضدی طبیعت پر بہت غصہ آتا تھا۔ وہ اٹھنے کے بہانے تلاش کر رہا تھا۔

"ارے بیٹا! آپ کہاں چلے؟" جمال علی نے اسے بازو سے پکڑ کے بٹھا لیا۔

"وہ اصل میں ہوٹل......"

"بس بس...... ہوٹل میں کوئی نہیں رک رہا ہے' روحیل کے تم خاص آدمی ہو اس لئے ہمارے لئے بھی ہو' آپ ادھر ہی قیام کریں گے"۔ اریشماء ماہم اور جوہم کے ساتھ باتوں میں لگی تھی' اس کے لب مسکرا دیئے' کم از کم وہ اس کے سامنے تو رہے گا۔

"وہ سر! میں آپ کو تکلیف نہیں دے سکتا"۔

"ارے بیٹا! آپ تو ایسے بول رہے ہیں جیسے آپ ہمارے سر پر بیٹھیں گے"۔ مسز جمال نے ہنس کر کہا۔ وہ جھینپ گیا' کب سے خاموش بھی بیٹھا تھا' سفر کی تھکن الگ ہورہی تھی' ان لوگوں کے درمیان خود کو مس فٹ سمجھ رہا تھا۔

"تم حمدان کو روم دکھا دو آرام کر لے گا' کچھ دیر پھر رات کو ڈنر پر ملیں گے"۔ جمال علی نے اپنی بیگم کو مخاطب کیا۔

حمدان نے اپنا بیگ اٹھایا' وہ آگے بڑھیں ان کی تقلید میں روم سے باہر آگیا' خوبصورت سا جدید طرز پر بنا بنگلہ' وہ جائزہ لیتا ہوا جارہا تھا' اریشماء بھی اٹھی تھی۔

"یہ آپ کا روم ہے ہر چیز موجود ہے اور مزید کسی بھی چیز کی ضرورت ہو بیٹا! تو توقف بولنا"۔ مسکرا کے اسے روم میں چھوڑ کے چلی گئیں۔

وسیع و عریض روم درمیان میں بیڈ' ٹی وی' چیئرز اور ٹیبل پر جانے کیا کچھ رکھا تھا۔ وہ جائزہ لینے کے بعد بیگ سے کپڑے نکالنے لگا۔ اریشماء ناک کر کے اندر آگئی' روم کا ڈور کھلا ہوا تھا۔ حمدان کی تیوری پر ناگواری سے بل پڑ گئے' وہ اچٹتی نگاہ ڈال کے رہ گیا۔

(جاری ہے)

عائشہ الیاس

افسانہ

سرد رُتوں کا موسم

شام کے گہرے سائے ہر سو پھیل رہے تھے پرندے بھی چہچہاتے ہوئے اپنے گھونسلوں کی طرف روانہ ہو رہے تھے ٹھنڈی یخ ہوائیں ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں لیکن وہ اس شدید ٹھنڈ سے بے نیاز چھت پر بیٹھی سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہی تھی' اس پر شدید سردی کا کوئی اثر نہ ہو رہا تھا' وہ اس ٹھنڈ کو ایسے محسوس کر رہی تھی جیسے کسی ایئر کنڈیشن روم میں بیٹھی ہو' اتنے میں رمیز اسے ڈھونڈتا ہوا چھت پر آیا اور سامنے اسے سگریٹ پیتا ہوا دیکھ کر اس کے بدن میں غصے کی لہر دوڑ گئی' وہ ملگجے سے حلیے میں تھی' سلکی بکھرے گندے بال اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے جنہیں دو تین دن سے دھویا نہ گیا تھا' چست اسکن ٹراوزر کے اوپر اس نے ریڈلی شرٹ پہنی ہوئی تھی اس کا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ بہت روئی ہے' اس نے جب سامنے کھڑے رمیز کو دیکھا تو بنا کسی ڈر خوف کے کھڑے ہو کر کش لینے لگی' وہ رمیز کو اس حرکت سے اور بھی تپا رہی تھی رمیز سرعت سے آگے بڑھا' اس کے منہ سے سگریٹ لی اور اپنے جوتے سے زمین پر کچل دی' وہ نفرت سے رمیز کو دیکھنے لگی ابھی اس نے کچھ کہنے کے لئے لب وا کئے ہی تھے کہ رمیز نے اس کے گال پر زور دار طمانچہ مارا' اسے امید تھی رمیز کے اس رویئے کی' اس لئے نارمل کھڑی رہی۔

''تو تمہیں اتنے آرام سے میری بات سمجھ نہیں آئے گی' میں نے تمہیں پہلے بھی وارن کیا تھا کہ اب سگریٹ مت پینا' لیکن لگتا ہے تم اتنی آسانی سے نہیں سمجھو گی تو ٹھیک ہے مجھے بھی دوسرا راستہ آتا ہے تمہیں ٹھیک کرنے کا''۔ رمیز کے الفاظوں میں غصہ اور سختی تھی وہ اسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا ہوا چلا گیا اور وہ پیچھے سے چلانے لگی۔

''کر لو جو کرنا ہے میں ڈرتی نہیں ہوں کسی سے سمجھے''۔ اس کی بلند آواز گھر کے باقی مکینوں تک بھی پہنچ گئی تھی پر اسے کسی نے کچھ نہیں کہنا تھا۔

☆

رمیز نے جو کہا تھا وہ کر کے دکھایا تھا' اس نے مناہل کے سارے اخراجات پر پابندی لگا دی' اس کے تمام کریڈٹ کارڈ اپنے قبضے میں کر لئے تھے' مناہل جو اس سے پہلے ہی خفا ہوئی رہتی تھی اب تو اس کی اس حرکت پر اور چراغ پا ہو گئی۔

''آخر تم چاہتے کیا ہو؟ کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ ایسا......؟'' وہ رمیز سے الجھ پڑی۔

''میں کیا چاہتا ہوں' میں جو چاہتا ہوں نا وہ تم اچھی طرح سے جانتی ہو''۔ رمیز نے اسے ایک بار پھر وارن کیا۔

''ہونہہ...... وہ تمہاری بھول ہے اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ میں بالکل تمہاری سوچ کے سانچے میں ڈھل جاؤں گی تو وہ ناممکن ہے''۔ وہ حقارت سے بولی۔

''تو پھر ٹھیک ہے جیو ایسے ہی لیکن اب یہ بھول جاؤ کہ میں تمہیں کوئی پھوٹی کوڑی بھی دوں گا''۔

''تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے اگر تم ایسا کرو گے تو میں مر جاؤں گی''۔ اس نے دھمکی دی۔

''تو مر جاؤ لیکن جیسا تم چاہتی ہو ویسا کچھ بھی نہیں ہوگا' کیونکہ یہ نیویارک نہیں ہے جہاں تم اپنی من مانی کرتی پھرو''۔ وہ اسے ایسا کہنا نہیں چاہتا تھا پر مناہل نے اسے کہنے اور کرنے پر مجبور کر دیا تھا' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا اور مناہل غصے سے دانت پیس کر رہ گئی' اس نے سامنے ڈریسنگ پر موجود ہر شے غصے سے ہاتھ مار کر پھینک دی' کمرے میں ہر طرف کانچ اور ٹوٹی ہوئی چیزیں بکھر گئیں' وہ خود بھی اپنے آپ کو ان ٹوٹی ہوئی چیزوں کی طرح بکھرا ہوا محسوس کر رہی تھی۔



مناہل نے رمیز کی کہی ہوئی بات پوری کر دی تھی وہ سلیپنگ پلز کھا کر نیند کی وادیوں میں ہمیشہ کے لئے اتر جانا چاہتی تھی' وہ اس زندگی سے خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی پر موت شاید ابھی اس کے مقدر میں نہیں تھی اسے بروقت ہاسپٹل لے جا کر بچا لیا گیا تھا' رمیز اور باقی گھر والے اس کی اس جذباتی حرکت پر پریشان ہو کر رہ گئے' جب وہ ڈسچارج ہو کر گھر آئی تو رمیز نے اس سے کوئی بات نہ کی البتہ رفیق احمد نے اس سے بات ضرور کی۔

''رمیز! تم باہر جاؤ' مجھے مناہل سے ضروری بات کرنی ہے''۔ رفیق احمد کے کہنے پر رمیز خاموشی سے کمرے سے چلا گیا اور وہ مناہل کے پاس بیڈ پر آ کر بیٹھ گئے مناہل سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

''تم کیا چاہتی ہو بیٹا......؟'' وہ نرمی سے بولے۔

''مجھے نیویارک واپس جانا ہے''۔ اس نے صاف کہا۔

''وہاں کس کے پاس رہو گی......؟''

''اکیلے رہ لوں گی جیسے اور لوگ رہتے ہیں''۔ وہ دو ٹوک بولی۔

''یہاں آپ کو کیا پرابلم ہے......؟'' رفیق احمد بہت نرمی سے اس سے مخاطب ہوئے تھے۔

''میں یہاں نہیں رہ سکتی' یہاں کا ماحول' یہاں کا رہن سہن مجھ سے برداشت نہیں ہوتا''۔ اس نے صاف کہا' رفیق احمد کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے اور پھر کچھ سوچ کر قدرے توقف کے بعد بولے۔

''مناہل بیٹا! میں اتنے عرصے سے اس لئے خاموش ہوں تا کہ آپ آرام سے سب کچھ قبول کر لیں' اگر آپ کو یہ لگتا ہے کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو آپ غلط ہو' ایسے تو زیادتی رمیز کے ساتھ بھی ہوئی ہے لیکن وہ تو کبھی کچھ نہیں کہتا' میں نے اس سے جو کہا اس نے اس پر سر جھکا دیا' تو بیٹا کیا آپ اپنے مرے ہوئے پاپا کی خواہش تک کا احترام نہیں کر سکتیں......؟ آپ کو کیا لگتا ہے کہ کیا آپ کی اس حرکت پر آپ کے پاپا کو تکلیف نہیں پہنچی ہو گی......؟ بیٹا! ہم سب کے لئے نہ سہی پر اپنے پاپا کے لئے تو سمجھوتا کر سکتی ہو' اور اگر اب بھی آپ کی جانے کی ضد ہے تو میں آپ کو ہرگز اجازت نہیں دوں گا' شاید آپ کو اس بات کا خوف نہ ہو پر قیامت کے روز مجھے تو اپنے بھائی کا سامنا کرنا ہوگا' اپنا خیال رکھنا بیٹا''۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے باہر چلے گئے اور وہ گم صم سی ہو گئی' اس وقت اسے پاپا کی شدت سے یاد آنے لگی۔



رفیق احمد کے چھوٹے بھائی باہر تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے تھے لیکن بس پھر تعلیم حاصل کر کے باہر کے ہی ہو کر رہ گئے' وہیں شادی کر کے آباد ہو گئے' پر ان کے شادی کے سولہ سال بعد ان کی بیوی کینسر کے مرض کی وجہ سے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں اور پیچھے وہ اور پندرہ سال کی مناہل رہ گئی' رفیق احمد نے انہیں واپس آنے کے لئے بہت زور ڈالا' پر مناہل پاکستان نہیں آنا چاہتی تھی اس لئے وہ لوگ نہ آئے' وقت گزرتا رہا مناہل ایم بی اے کے آخری سال میں تھی تب ایک دن اچانک حمید احمد کو ہارٹ اٹیک کا حملہ ہوا' ان کی طبیعت سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی' رفیق احمد بھی فوراً چھوٹے

بھائی کے پاس پہنچ گئے' وہیں رفیق احمد نے اپنے بھائی سے مناہل کا خیال رکھنے کو کہا اور رمیز کے لئے مناہل کی خواہش ظاہر کی' انہیں ڈر تھا کہ ان کے مرنے کے بعد کہیں مناہل نیویارک کے آزاد ماحول میں بھٹک نہ جائے۔ پھر کچھ ہی دنوں میں حمید احمد اس دنیا سے رخصت ہو گئے' مناہل کسی طور پر پاکستان جانے کیلئے تیار نہ تھی' مناہل کی زندگی کی خوبصورت یادیں نیویارک سے وابستہ تھیں لیکن رفیق احمد اسے اپنے بھائی کے واسطے دے کر ساتھ لے آئے اور یہاں اس کا رمیز سے نکاح کروا دیا پر مناہل کو یہ سب قبول نہ تھا' وہ نیویارک کو بھول نہ پا رہی تھی جو آزادی اور ماحول اسے وہاں میسر تھا وہ سب یہاں نہ تھا' وہ اپنے دوست اور اس ماحول کو بھلائے نہ بھول رہی تھی' رمیز نے تو اپنے باپ کے آگے سر جھکا دیا' پر مناہل کے ساتھ زندگی بسر کرنا بے حد مشکل تھا' وہ اس کے مزاج کے بالکل برعکس تھی پر جو تھا اب وہ اس کی بیوی تھی' سمجھوتا تو کرنا تھا' اس نے پہلے پہل تو بہت پیار سے اسے بدلنا چاہا پر اس کی طبیعت میں کچھ بدلاؤ نہ آیا' اس نے اسی طرح سب کو عاجز کر کے رکھا ہوا تھا اور اب جب رمیز نے سختی دکھائی تھی تو انجام اس کے سامنے آ گیا تھا۔ مناہل کے خودکشی کرنے کی کوشش میں وہ تو اب خاموش سا ہو گیا' کہنے کو اس کی شادی کو چار ماہ ہو گئے تھے اور یہ چار ماہ اس کی زندگی کے بدترین دن ثابت ہوئے' اب تو اس نے سب قسمت پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔



رفیق احمد کی باتوں کا کافی اثر ہوا تھا مناہل پر' اس نے ضد کرنا اور سب کو اپنی فضول حرکتوں سے عاجز کرنا بھی چھوڑ دیا تھا' وہ خاموش سی ہو کر کمرے تک محدود ہو گئی تھی' گھر کا اوپر والا پورشن رفیق احمد نے شادی کے بعد رمیز اور مناہل کو دے دیا تھا' باقی گھر میں اور لوگ تھے وہ خود ان کی بیگم اور ان کی دو بیٹیاں' وہ سب نیچے رہتے تھے' مناہل کی زندگی میں کوئی دخل اندازی نہیں کرتا تھا پر پھر بھی وہ خوش نہ تھی یہاں۔

رمیز لیپ ٹاپ پر کام کرتے ہوئے مناہل کو بھی دیکھ رہا تھا تھوڑی تھوڑی دیر بعد نظر اٹھا کر جو گم صم سی کھڑکی کے پاس کھڑی باہر لان کی طرف نجانے کیا دیکھ رہی تھی' رات کافی گہری ہو رہی تھی اور سردی بھی کافی شدید بڑھ گئی تھی' پر وہ اپنے روز کے عام سے حلئے میں تھی' ٹراؤزر کے اوپر شرٹ پہنے اس پر جیسے سردی کا کوئی اثر ہی نہ ہو رہا تھا' اس نے خود سویٹر پہن رکھا تھا' ساتھ کافی پی رہا تھا' اسے حیرت ہو رہی تھی اس لڑکی کے اسٹیمنا پر' وہ اسے چاہنے لگا تھا اسے عادت ہو گئی تھی مناہل کی پر وہ اتنا بے بس تھا کہ اپنی محبت اس لڑکی کے دل میں نہیں ڈال پا رہا تھا۔



گھر میں رفیق احمد کی پہلی بیٹی عائزہ کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں گھر میں رونق کا سماں سا بندھ گیا تھا' روز رات میں ڈھولکی رکھی جاتی اور لڑکے لڑکیاں خوب رونق لگاتے پر وہ سب سے الگ تھلگ اوپر اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی' حالانکہ سب اتنی محبت سے بلاتے' پر وہ صاف منع کر دیتی' نعیمہ بیگم جو کہ اس کی ساس تھیں بڑے چاؤ سے اس کے لئے شادی کے جوڑے بنوا کر دیئے تھے اسے' پر اس کا روکھا رویہ سب کو مایوس کر دیتا' وہ ایسی سنگدل بھی نہ تھی بس یہ سب یوں اچانک سے وہ قبول نہ کر پا رہی تھی۔



رمیز آفس سے آیا تھا ابھی ابھی اور گاڑی سے نکلتے ہی سامنے موجود نائلہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا' نائلہ اس کی ماموں زاد تھی' وہ اس کی ہی ہم عمر اور بہت اچھی دوست بھی تھی' رمیز کو اتنا تو پتا تھا وہ یو کے گئی تھی اسٹڈی کے لئے اور آج اچانک سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''ارے تم کب آئیں یو کے سے......؟'' وہ خوشدلی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''کل ہی آئی ہوں' عائزہ کی شادی کا سنا تو بس

سیدھی بوریا بستر باندھ کر یہاں آ گئی' بھئی عائزہ کے بڑے بھیا کی شادی تو اٹینڈ نہ کر سکی پر عائزہ کی تو کر لوں''۔ وہ ہمیشہ کی طرح اپنے شوخ مزاج کے مطابق نان اسٹاپ بولی' رمیز اس کی بات سن کر جھجک گیا۔

''تم بالکل نہیں بدلیں''۔

''کیوں بدلوں بھئی اور ویسے بھی بدلتے لوگ ٹھیک نہیں ہوتے''۔ اس نے دوٹوک کہا۔

''تم بھی نا''۔ رمیز کو اس کی عجیب و غریب باتوں پر کبھی کچھ نہ کہنا آیا۔

''اچھا بھئی سب چھوڑو اپنی بیگم سے تو ملواؤ''۔ رمیز' نائلہ کی بات پر کچھ خاموش ہو گیا۔

''کیوں تم ملی نہیں ابھی تک......؟'' وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔

''کہاں...... وہ کہیں نظر ہی نہیں آئی' کہیں تم نے اسے چھپا کر تو نہیں رکھا' کیا اتنی خوبصورت ہے......؟'' رمیز اس کی نان اسٹاپ بات پر گہری سانس لے کر رہ گیا' اور ساتھ دل میں سوچا۔ واقعی مناہل ہے تو چھپانے کی چیز۔

''اتنا ظالم نہیں ہوں میں' آؤ اندر چلیں''۔ اس نے سلیقے سے بات بنائی۔

''اور تمہاری بیگم......؟'' اس کی سوئی وہی اٹکی ہوئی تھی۔

''ملوا دوں گا اندر تو چلو' قسم سے اتنی سردی میں باہر کھڑا نہیں ہوا جا رہا''۔ اس نے اب جان چھڑائی تو وہ کھلکھلاتی ہوئی اس کے ساتھ اندر چل دی۔

اوپر ٹیرس میں کھڑی مناہل گہری دھند میں بھی ان دونوں کو ہنستا مسکراتا دیکھ رہی تھی' رمیز کے ساتھ اسے اتنا فری دیکھ کر کئی سوال اس کے دل میں پیدا ہوئے۔

☆

نائلہ جب مناہل سے ملی تو مناہل کا روکھا رویہ دیکھ کر وہ بڑی حیران ہوئی' وہ یہاں رہتے ہوئے مناہل اور رمیز کے کھنچے ہوئے تعلقات کو بھی محسوس کر رہی تھی اس نے رمیز سے بہت پوچھا کہ کیا وجہ ہے؟ رمیز بھی ایک حد تک اسے ٹالتا رہا چونکہ وہ اس سے ہر بات شیئر کرتا تھا شروع سے' اس لئے اس نے ساری صورتحال بتا دی' نائلہ کو کافی دکھ ہوا وہ پریشان بھی ہو گئی۔

''تو اب کیا ہو گا رمیز......؟ تم دونوں کیسے یہ زندگی کا سفر طے کرو گے''۔

''جو قسمت میں لکھا ہے وہی ہو گا''۔ وہ لاپرواہی ظاہر کرتے ہوئے بولا وہ دونوں لان میں گھاس پر ساتھ چلتے ہوئے باتیں کر رہے تھے' شام کے اندھیرے ڈھل رہے تھے' سردی کی بھی شدت کافی تھی ہر طرف دھند اور سردی کا راج تھا' اوپر ٹیرس پر کھڑی مناہل ان دونوں کو دیکھ رہی تھی نجانے جلن کی ایک ٹیس اٹھ رہی تھی اس کے دل میں۔

''پر پھر بھی رمیز! اس کا کوئی تو حل ہو گا''۔ نائلہ کو فکر لاحق ہوئی۔

''پتا نہیں کیا حل ہو گا؟ کیونکہ ہم سب نے اسے راضی کرنے کی کوشش کی ہے پر وہ کچھ بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے''۔ رمیز ہارے ہوئے جواری کی طرح بولا۔

''تم کہو تو میں بات کروں مناہل سے......؟''

''نہیں جو جیسا چل رہا ہے چلنے دو' ویسے بھی محبت کبھی بھی کسی کے دل میں زبردستی ڈالی نہیں جا سکتی''۔ اس نے سنجیدگی سے کہا' وہ دونوں کافی دیر اس موضوع پر بات کرتے رہے' پر مناہل سے زیادہ دیر وہاں کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔

☆

مناہل سے روز روز یوں ان کا گھلنا ملنا برداشت نہ ہو رہا تھا' آج بھی گھر میں مایوں مہندی کا فنکشن تھا اور اس نے وہ بھی اٹینڈ نہ کیا غصے کے مارے' حالانکہ رفیق احمد نے اسے فنکشن اٹینڈ کرنے کا کہا پر اس نے طبیعت خرابی کا بہانہ کر دیا' وہ کمرے کی کھڑکی سے باہر لان کا منظر دیکھ رہی تھی روشنیوں سے جگمگاتا وسیع لان لوگوں کے خوشگوار قہقہوں سے گونج رہا تھا' وائٹ کلف لگے کرتا

شلوار میں رمیز بہت خوبصورت لگ رہا تھا' مناہل نے پہلی بار اسے اتنی توجہ سے دیکھا' مناہل کی نظروں کی تپش ہی تھی کہ رمیز نے اسے یوں تکتا ہوا دیکھ لیا' وہ جھٹکے سے فوراً پیچھے ہٹی دل فوراً دھڑک کر رہ گیا' یوں چوری پکڑے جانے پر' وہ کافی دیر بے چینی سے کمرے میں ٹہلتی رہی اور کڑھتی رہی وہ حیران بھی تھی اپنی کیفیت پر' وہ تو چاہتی تھی اس کی جان چھوٹ جائے پر' اب اتنی حساس ہو رہی تھی رمیز کے معاملے میں' یہ خوف ہی اس کی جان نکال رہا تھا کہ رمیز اس سے جدا نہ ہو جائے یعنی اسے بھی اس کی عادت ہو گئی تھی' یا پھر شاید محبت...... اس نے ٹھان لیا وہ اتنی آسانی سے رمیز کو نہیں کھوئے گی' وہ اس سے بات کرے گی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

رات فنکشن ختم ہونے کے بعد رمیز جب کمرے میں آیا تو مناہل سامنے صوفے پر بیٹھی اسی کا انتظار کر رہی تھی' اسے حیرت کا کافی جھٹکا لگا لیکن وہ خاموشی سے الماری سے نائٹ سوٹ نکال کر چینج کرنے کے لئے واش روم میں جانے ہی لگا تھا کہ مناہل نے پیچھے سے پکارا۔

''بہت خوش رہنے لگے ہو''۔ اس کے الفاظ چبھتے ہوئے تھے' رمیز کو حیرت ہوئی اس کی بات پر۔

''تو تم اب پابندی لگاؤ گی میرے خوش رہنے پر''۔ رمیز بھی اسی کی ٹون میں بولا۔

''ہونہہ...... میری اتنی مجال کہ تم پر پابندی لگاؤں''۔

''تو پھر ان باتوں کا مقصد......؟'' اسے کوفت ہوئی۔

''مطلب صاف ہے تم بتاؤ تم چاہتے کیا ہو......؟'' رمیز کو اس کی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تم کیا کہہ رہی ہو......؟''

''اتنے معصوم مت بنو' میں سب جانتی ہوں تمہارے دل میں کیا چل رہا ہے' تنگ آ گئے ہو نہ مجھ سے' جان چھڑانا چاہتے ہو نہ تم......؟'' وہ سختی سے بولی اور رمیز حیرت میں تھا کہ یہ اچانک اسے ہو کیا گیا ہے۔

''پلیز مناہل...... جو کہنا ہے صاف صاف کہو یوں گول مول باتیں مت کرو''۔ وہ گویا تپ گیا۔

''صاف صاف تو تم بتاؤ یہ نائلہ میڈم کے ساتھ کیا چل رہا ہے......؟'' اس کے الفاظ نے تو رمیز کو حق دق کر دیا' پتا نہیں وہ کب سے سوچ رہی تھی یہ سب' پہلے تو وہ حیرت کی کیفیت میں رہا پھر وہ زیرلب مسکرا دیا یہ سوچ کر کہ وہ اس کے بارے میں فکرمند ہے یعنی وہ اس سے بے نیاز نہیں ہے۔

''بولو اب چپ کیوں ہو......؟'' مناہل اس کی گہری خاموشی پر بولی۔

''تمہیں جو سوچنا ہے سوچو مجھے کوئی وضاحت نہیں دینی ہے''۔ اس نے بھی سوچ لیا وہ اسے تپائے گا' وہ پلٹنے لگا تھا کہ مناہل نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف موڑا۔

''مجھے یہ سب بالکل نہیں پسند' جو تمہارا فیصلہ ہے صاف بتاؤ' مجھے سولی پر مت لٹکاؤ''۔ وہ دوٹوک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی' رمیز اسے تکنے لگا' ان کے بیچ میں کتنی ہی دیر خاموش رہی' وہ ایک دوسرے کو تکتے رہے تھے پھر رمیز بنا کچھ کہے واش روم میں گھس گیا اور وہ دانت کچکچا کے رہ گئی۔

''میں بھی سچ تم سے اگلوا کر رہوں گی''۔ اس نے خود سے چیلنج کیا۔

☆

رمیز نے جب نائلہ کو مناہل کی سوچ بتائی تو نائلہ پریشان ہو گئی پر وہ پہلے سے بھی زیادہ پرسکون تھا' نائلہ نے اسے معاملہ کلیئر کرنے کو کہا پر اس نے فی الحال مصلحتاً منع کر دیا' وہ مناہل کو زچ کرنا چاہتا تھا' اس نے بھی تو اسے تڑپایا تھا بہت۔

عائزہ کی بارات کا دن آ گیا' اس میں تو مناہل کو بہرحال میں شرکت کرنی تھی سو وہ بے دلی سے تیار ہوئی' اس کو رمیز کی بہت فکر تھی' وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی ڈارک مہرون شیفون کی لانگ شرٹ جس کے گلے پر گولڈن موتیوں کا بڑا سا گلا بنا ہوا تھا اور نیچے ٹراؤزر تھا' اور دوپٹہ گولڈن مہرون کلر میں ڈائی ہوا تھا وہ اس سوٹ

میں کھل رہی تھی اس کی گوری دلکتی رنگت چمک رہی تھی ہلکے پھلکے میک اپ اور کھلے بالوں میں اس کا حسن اور بھی جگمگا اٹھا' ہروقت کی سادی رہنی والی مناہل آج یکسر مختلف تھی۔ سب ہی کی رشک بھری نگاہیں اس کی طرف اٹھ رہی تھیں' رمیز کا دل بھی اس کی سنگت کے لئے مچل رہا تھا' پوری شادی مناہل کی نظریں رمیز اور نائلہ پر فوکس تھیں اور رمیز بھی اسے خوب جلا رہا تھا۔

''رمیز! مت کرو اسے تنگ' دیکھو کیسا چہرہ اترا ہوا ہے اس کا''۔ نائلہ نے سمجھانا چاہا۔

''ہونے دو اسے پریشان' اس نے بھی مجھے بہت پریشان کیا ہے''۔ رمیز نے ڈھٹائی سے کہا' نائلہ تو ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔

ولیمے والے دن بھی یہی سب ہوا' آج تو اس نے وائٹ نیٹ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی' ہلکے پھلکے میک اپ اور بالوں کو جوڑا بنایا ہوا تھا' آج تو وہ اور بھی حسین لگ رہی تھی' رمیز کا دل چاہ رہا تھا وہ ساری ناراضگی مٹا کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لے۔ سب کے لئے مناہل کا بدلا ہوا رویہ حیران کن تھا' وہ تو ایسے سب میں گھل مل رہی تھی جیسے عرصے سے ان کے ساتھ ہو' رفیق احمد اور نعیمہ بیگم' مناہل کے بدلاؤ پر بہت خوش تھے' رمیز بھی بہت پر سکون ہو گیا تھا' قسمت اس پر مہربان ہو ہی گئی تھی۔ رات میں فنکشن کے بعد بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے رمیز کو وارن کر دیا۔

''میں صرف شادی ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی اب تمہیں اپنے کارناموں کا اعتراف بابا کے سامنے کرنا ہوگا''۔

''ٹھیک ہے کرلوں گا''۔ اس نے مناہل کو اپنے قریب کرتے ہوئے کہا' مناہل تو اس کی اس حرکت پر حیرت زدہ رہ گئی' شادی کے بعد سے رمیز نے اسے ہاتھ لگانے کی مجال نہ کی تھی اور آج یوں اچانک وہ ہق دق رہ گئی۔

''چھوڑو مجھے یہ کیا حرکت ہے.....؟'' وہ جز بز ہوگئی تھی۔

''کیوں حق رکھتا ہوں تمہیں چھونے کا''۔

''میں مان ہی نہیں سکتی''۔

''میں منا لوں گا''۔ رمیز نے محبت سے کہتے ہوئے اس کے ماتھے پر اپنے لب رکھ دیئے اور وہ بھی جیسے اس کی قربت میں کمزور سی ہوگئی۔

☆

صبح مناہل کا موڈ آف تھا اسے غصہ آ رہا تھا وہ کمزور کیسے پڑ گئی رمیز کے آگے۔

''کیا ہوا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے.....؟'' رمیز نہا کر نکلا تھا سامنے صوفے پر منہ لٹکائے ہوئے بیٹھے دیکھ کر اس کے پاس آ کر بولا۔

''تم بہت برے ہو''۔ اس کا انداز روٹھا تھا' رمیز جانتا تھا اسے ابھی تک اس کی سچائی پر یقین نہیں آیا تھا وہ اسے مسکراتے ہوئے دیکھنے لگا۔

''قسم سے یار! جیسا تم سوچ رہی ہو ویسا کچھ نہیں ہے''۔

''میں کیسے مان لوں''۔

''تمہیں ماننا پڑے گا کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور رہی بات نائلہ کی تو وہ اپنے چچا زاد کے ساتھ منسلک ہے اور وہ دو مہینے بعد اس کی شادی ہے''۔ رمیز نے گویا اس پر دھماکا کیا' وہ حیرت سے رمیز کو دیکھنے لگی۔

''اب اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے اٹھو فریش ہو جاؤ اور ریڈی ہو جاؤ' ہم جا رہے ہیں''۔

''کہاں.....؟'' اس نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔

''مری..... ہنی مون منانے''۔ اس نے سرپرائز دیا اسے۔

''شادی کے پانچ مہینے بعد''۔ اس نے طنز کیا۔

''کیا کریں مجبوری ہے اصولاً تو ہماری شادی کل ہوئی ہے''۔ رمیز نے اسے معنی خیزی سے چھیڑا تو وہ مسکراتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی۔

☆

نائلہ طارق

قسط نمبر 16-

سلسلے وار ناول

سانس رکے اور سکوت

پرنٹر سے پیپر نکالتے ہوئے وہ اس کی جانب متوجہ ہوئے تھے جو دروازے پر ہی رک گئی تھی۔

''آ جاؤ رک کیوں گئیں''۔ ان کے نرم لہجے پر خاموشی کے ساتھ ان کی طرف بڑھ آئی تھی۔

''کچھ کہنا ہے تمہیں یا بس خاموش کھڑے رہنا ہے' بیٹھ جاؤ''۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات دیکھتے ہوئے وہ بولے تھے جبکہ وہ اسی خاموشی کے ساتھ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

''میں آپ سے یہ کہنے آئی تھی کہ......'' سر جھکائے وہ بولتے ہوئے ایک پل کو رکی تھی۔

''آپ پھپھو کو ہاں کر دیں میرے لیے' میں نے انکار کیا تھا تو وہ ناراض ہوئی تھیں مگر وہ اب بھی یہی چاہتی ہیں کہ......'' لرزتی آواز میں بولتے ہوئے اس نے شمس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا' جہاں وہ کسی بھی تاثر سے عاری سپاٹ نظر دونوں پر ڈالتا فوراً ہی پلٹ کر واپس باہر نکل گیا تھا۔

''یہ مشورہ کس احمق نے دیا ہے تمہیں کہ مدر ٹریسا بن کر پھپھو کی اولاد اور اس کی اولاد کو ساری زندگی سنبھالتی رہو''۔ وہ ناگوار لہجے میں بولے تھے۔

''میں جانتا ہوں تم یہ سب کیوں کہہ رہی ہو' اس لیے بغیر کسی تمہید کے میں صرف اتنا کہوں گا کہ مجھے سمجھ آ گیا ہے کہ شیث کی زندگی میں تمہاری اور تمہاری زندگی میں اس کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے' پہلی بار میں نے تمہارے لیے اس کی آنکھوں میں نمی دیکھی تو میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میں یہ سب کیا کر رہا ہوں؟ یا یہ کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں اس کے



بعد جو خلا اس کی زندگی میں ٹھہرے گا اسے میں کس طرح مکمل کر سکوں گا۔ تمہارے علاوہ اور کوئی ایسا نہیں تھا جس کے لیے وہ اتنا بے اختیار تھا کہ ہر رکاوٹ کو عبور کر کے تم تک پہنچنے کی ہمت کرتا رہا"۔ ان کے سنجیدہ لہجے پر وہ بس نم آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"جو کچھ وہ مجھ سے مانگتا رہا ہے آج تک بہت خاموشی کے ساتھ صبر کے ساتھ' وہ سب تو اللہ نے بہت پہلے ہی اس کے حوالے کر دیا تھا تو پھر میں کون ہوتا ہوں اسے تم سے محروم کرنے والا۔ اور تم تو وہ ہو جس کا احسان میں اپنی آخری سانسوں تک بھی اتار نہیں سکوں گا' اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا مقام ہونا چاہیے اس عورت کا جس نے اپنے سر سے چادر اتار کر اس کے وجود پر ڈالی تھی' اور میں پوری سچائی کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس عورت کا وہی مقام ہونا چاہیے جو شیث نے تمہیں اپنے دل میں دیا ہے' اور اس سے بھی بڑھ کر وہ مقام جو تمہیں وہ دینا چاہتا ہے۔ میں نے بھی چاہا تھا کہ اس کی زندگی میں ایک ایسی لڑکی آئے جو اس کا پردہ بن جائے' ایسا پردہ جس میں اس کے ماضی کے اذیت ناک لمحے چھپ کر گم ہو جائیں۔ ایسی لڑکی جو اس سے کوئی سوال نہ کرے' کوئی ایسا طعنہ نہ دے جو اسے منہ کے بل گرا دے اور جب میں نے یہ سوچا یہ چاہا' میرے دل و دماغ میں صرف تمہارا چہرہ تمہارا ہی نام آیا تھا' یہ سچ ہے میں بہت دیر سے یہ اعتراف خود سے یا تم سے کر رہا ہوں مگر ابھی اتنی بھی دیر نہیں ہوئی ہے' اگر شیث کیلئے میں کسی پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکتا ہوں تو وہ صرف تم ہو سارہ! ایک تم ہی ہو جو اس کی ذات کو مکمل کر سکتی ہو"۔ پُریقین لہجے میں بولے تھے اور پھر ایک گہرا سانس لے کر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی سمت آئے تھے جس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا رکھا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں تھوڑے سے آنسو بچا کر رکھنے چاہئیں' کیونکہ تمہاری باتیں سن کر وہ جس طرح یہاں سے گیا ہے وہ تین آنسو تمہارے دیکھے بغیر راضی نہیں ہوگا' میرا خون تو اب تک وہ جلا ہی رہا ہے"۔ اس کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے وہ مسکراتے لہجے میں بولے تھے۔

"اپنی پھپھو سے بے شک تم ساری زندگی محبت کرو مگر اتنی بھی نہ کرو کہ میں یہ بھول جاؤں وہ تمہاری اکلوتی پھپھو ہیں' اچھا"۔ ان کی تاکید پر بھیگی آنکھیں صاف کرتے ہوئے وہ بے ساختہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرائی تھی۔

☆

فجر کی نماز سے فارغ ہو کر اس نے ایسے ہی کھڑکی سے باہر کا جائزہ لیا تھا۔ گرلز کے پار موسم انتہائی دلکش تھا' رات کی تاریکی سے آزاد ہوتا آسمان سورج سے ملاقات کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا اسی لیے تو ہلکی ہلکی بوندیں ہر منظر کو بھگوتی جا رہی تھیں' دل بے اختیار ہوا تھا جو وہ کمرے میں رک نہ سکی تھی۔ گرلز کھولتی وہ بھیگی خنک ہوا سے لطف اندوز ہوتی باہر نکل آئی تھی' گراؤنڈ کی سمت بڑھتے ہوئے اس نے آسمان پر چھائے اودے اودے بادلوں کو دیکھا تھا۔ سرخ اینٹوں کا وسیع و عریض فرش ہلکی بوچھاڑ سے دھل کر نکھر گیا تھا' ہر پورشن کے باہر سجا لہلہاتا سبزہ آنکھوں کو تراوٹ بخش رہا تھا۔ سوندھی مہک سانسوں میں جذب کرتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لی تھیں' برستی یخ بوندیں اپنے چہرے پر محسوس کرتی وہ کسی اور ہی جہان میں پہنچ چکی تھی۔

ادھ کھلے گرلز کو تھوڑا مزید کھولتے ہوئے شیث کی نظریں اس پر ساکت تھیں جو ارد گرد سے غافل نظر آ رہی تھی۔ بوجھل ہوتے دل کے ساتھ وہ ایک بار پھر اضطراب میں مبتلا ہونے لگا تھا کہ دل لاکھ پہرے لگانے کے باوجود اسی کی جانب ہمک رہا تھا' یہ کیسی بے بسی تھی۔ وہ کس قدر اس کے دل کو کمزور کر چکی تھی کہ ٹھوکر کھانے کے باوجود دھڑکنیں اس کا ہی نام الاپ رہی تھیں۔ اسے غصہ آ رہا تھا خود پر اور اس پر جو کتنی پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔

وہ سرتاپا جل رہا تھا' سلگ رہا تھا اور جو اسے شعلوں میں دھکیل چکی تھی' اپنے خنجر جیسے لفظوں کے وار سے زخمی زخمی کر گئی تھی کتنی مگن تھی...... مگر اس حقیقت کے باوجود وہ کب تک اس سے نظر چرا کر رکھ سکے گا' وہ تو اس کے ہر پل میں اپنا حق جما چکی ہے' سوچوں میں' نیندوں میں' خاموشی میں' تنہائی میں' یہاں تک کہ وہ انسانوں کی بھیڑ میں بھی الگ ہونے پر تیار نہیں تھی۔ دھتکارے جانے کے باوجود وہ کس طرح اسے خود سے الگ کر سکے گا اس کے تو سارے راستے وہیں جا کر ختم ہوتے ہیں' سارے راستے وہیں سے شروع ہوتے ہیں جہاں وہ موجود ہے مگر بے نیاز ہے۔ ایسی کون سی زبان ہوگی اس دنیا میں جو دل کو سمجھانے کیلئے کافی ہوگی۔

اپنی پشت پر جلتی نگاہوں کی تپش نے اسے پلٹنے پر مجبور کیا تھا اس کے ساتھ ہی دھڑکن ساکت ہوئی تھی۔ سفید لباس میں وہ کسی ماہر سنگ تراش کا مجسمہ ہی تو تھا جو ادھ کھلی گرلز کے درمیان ایستادہ تھا' خود بخود سارہ کے قدم اس کی جانب بڑھنے لگے تھے۔

برآمدے کا ایک اسٹیپ درمیان میں رہ گیا تھا جب سارہ کے قدم ساکت ہوئے تھے' دنگ نظروں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی جو اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا مگر اس کے مضبوط ہاتھ کی گرفت سختی سے اب بھی گرلز پر موجود تھی جسے ایک جھٹکے سے بند کرتا وہ سارہ کو شدید قسم کا دھچکا دے چکا تھا۔

"تم تک پہنچنے کیلئے یہ رکاوٹ بہت معمولی ہوتی اگر یہ کسی اور کے ذریعے میرے اور تمہارے درمیان آتی"۔ لرزتی آواز میں سارہ نے اس کے ہر تاثر سے عاری چہرے کو دیکھا تھا۔

"رکاوٹ نہیں یہ حد ہے جو تمہارے لیے بہتر ہے' اس حد سے آگے بڑھو گی تو میرا داغدار وجود تمہاری شفاف زندگی پر غلاظت مل دے گا"۔ اس کی جانب دیکھے بغیر وہ سپاٹ لہجے میں بولا تھا۔

"میں نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے' تم جو چاہو مجھے کہہ دو مگر اپنے لیے ایسے لفظ استعمال مت کرو"۔ اس مدھم و زدیدہ آواز پر شیث نے اسے دیکھا تھا جس کے چہرے پر بارش کی بوندیں اور آنکھوں میں نمکین قطرے چمک اٹھے تھے۔

"نہیں...... تم نے مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی' تم نے صرف سچ کہا تھا' تم نے صرف مجھے میری اوقات یاد دلائی ہے"۔ سپاٹ لہجے میں وہ بولا تھا اور اگلے ہی پل گرلز جھٹکے سے واپس کھولتا اس کے برابر سے نکلتا چلا گیا تھا جو دھندلائی آنکھوں اور شدید پچھتاوے کے ساتھ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆

برآمدے میں آتے ہوئے اس نے حیرت سے شاہ رخ کو دیکھا تھا جو وہیں اسٹیپس پر براجمان تھا۔

"اس طرح تنہا اداس کیوں بیٹھے ہو؟" حیرانگی سے پوچھتے ہوئے سارہ نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا جہاں موموا اپنے کچھ کزنز کے ساتھ کھڑی خوش گپیوں میں مگن تھی۔ مسکراہٹ دبائے سارہ بھی وہیں بیٹھ گئی تھی جبکہ شاہ رخ مستقل مومو کو ہی ناگوار نظروں سے گھور رہا تھا۔

"اس میں جیلس ہونے والی بظاہر تو کوئی بات نظر نہیں آ رہی مجھے"۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

"میں کوئی جیلس نہیں ہو رہا' بس انگاروں پر لوٹ رہا ہوں"۔ اس کے تپے ہوئے انداز پر سارہ ہنسی تھی۔

"اس گھر میں پرائیویسی نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے' رات میں کال کروں گا تمہیں پھر بات کریں گے"۔ شاہ رخ کے بدلتے ٹریک پر وہ ایک پل کو دنگ ہوئی تھی مگر اگلے پل اسے شیث کی موجودگی کا احساس ہوا تھا جو رکے بغیر برآمدے کے اسٹیپس اترتا آگے بڑھ گیا تھا۔

"مجھے یہاں بیٹھنا ہی نہیں چاہیے تھا"۔ سارہ نے اس کے ہنستے چہرے کو گھورا تھا۔

"اس گھر میں ایسا کوئی بندہ ہے جسے بخشا ہے تم نے..... ان کا بھی دماغ ایسا گھمایا ہے کہ کوئی رسپانس دینے کو تیار نہیں ہیں"۔ شرارتی نظروں سے سارہ کو دیکھتا وہ بولا تھا۔

"دونوں بالکل لورز برڈ بنے بیٹھے ہیں"۔ مومو اچانک ہی آدھمکی تھی۔

"کیوں آئی ہو یہاں؟ وہیں جاکر بیٹھو جہاں خوب دل لگ رہا تھا"۔ شاہ رخ نے اسے گھورا تھا۔

"تمہاری ہدایتوں کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے' جہاں مرضی بیٹھوں گی سمجھے"۔ مومو نے بھی اسی کے لہجے میں کہا تھا۔

"جاؤ یہاں سے' دماغ نہ خراب کرو"۔ شاہ رخ کے جھڑکنے والے انداز پر مومو کو پتنگے ہی لگ گئے تھے۔

"یہاں رکنا کون چاہتا ہے اور تمہارا دماغ ہمیشہ سے ہی خراب ہے Women's beater"۔ مومو نے تلملا کر کہا تھا جبکہ سارہ حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

"دوبارہ اگر تم نے مجھے یہ کہا تو اچھا نہیں ہوگا"۔ بگڑتے تیوروں کے ساتھ شاہ رخ نے اسے وارن کیا تھا۔

"ایک بار نہیں' دو بار نہیں' ہزار بار کہوں گی Women's beater"۔

"میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا"۔ ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے شاہ رخ غرایا تھا۔ دوسری جانب وہ بھی غصیلی نظروں سے اسے دیکھتی اپنے پورشن کی جانب سرعت سے گئی تھی۔ حق دق کھڑی سارہ جیسے ہوش میں آکر مومو کے پیچھے ہی گئی تھی۔

تیزی سے وہ کھلے گیٹ کے اندر داخل ہونا چاہتی تھی جب اسی وقت اندر سے کوئی باہر نکلا تھا سو تصادم لازمی تھا۔

"معاف کیجیے گا"۔ بری طرح شرمندہ ہو کر معذرت کرتے ہوئے سارہ نے فوراً ہی کچھ فاصلے پر گری اسٹک اٹھا کر اس شخص کے حوالے کر دی تھی۔

"کوئی بات نہیں' غلطی میری ہی تھی"۔ سارہ سے نظر ملائے بغیر وہ بولا تھا اور اسٹک کے سہارے چلتا آگے بڑھ گیا تھا مگر سارہ خود کو ملامت کرتی تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی' وہ اب شیث کی ہی سمت جا رہا تھا جو اس وقت بھی اسی جانب متوجہ تھا جب وہ عاطف سے ٹکرائی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جس میں براہ راست اس نے عاطف کو یا عاطف نے اسے مخاطب کیا تھا۔ سارہ کو وہ بہت کم گھر میں دکھائی دیتا تھا اور اکثر شیث کے ساتھ ہی' شیث کے توسط سے وہ پہلے صرف اتنا جانتی تھی کہ عاطف اس کا کزن اور دوست بھی ہے مگر اس گھر میں آکر اسے اندازہ ہوا تھا کہ ان کی دیرینہ دوستی گھر میں کتنی مشہور ہے' عاطف کی ڈیسنٹ شخصیت سے وہ مرعوب تھی مگر دل میں اس کیلئے زیادہ عزت اس لیے بھی تھی کہ وہ شیث کا بہت قریبی اکلوتا دوست ہے۔



کچن میں سدرہ کے ساتھ ہی موجود تھی جب شان' سدرہ کو پکارتا وہیں آپہنچا تھا۔

"بھابی! چھوٹے بھائی کے چہیتے پلانٹس پھر تباہ ہو گئے ہیں اور وہ دیواروں سے سر ٹکرانے پر تیار کھڑے ہیں"۔

"خبردار..... مجھ پر کوئی شک نہ کرے' اس بار میں نے کچھ نہیں کیا' جاکر شاہی سے پوچھو شیث سے کسی بات پر جلا ہوتا ہے تو اس کی چیزوں پر غصہ نکالتا ہے"۔ سدرہ بولی تھیں مگر پھر چونک کر خاموش کھڑی سارہ کو دیکھا تھا۔

"سارہ! تم صبح ٹیرس پر گئی تھیں"۔ سدرہ کی مشکوک نظروں پر وہ پریشان ہوئی تھی۔

"مگر میں نے تو صرف ان پلانٹس میں پانی ڈالا تھا وہ خراب کیسے ہو سکتے ہیں؟" وہ فکر مند ہوئی تھی۔

"وہ عام پودوں کی طرح نہیں ہیں' ان پلانٹس کو مہینے میں صرف ایک بار مخصوص مقدار میں پانی دیا جاتا ہے' پہلی بار بھابی نے خوب دل لگا کر انہیں پانی دے دیا تھا' دوبارہ چھوٹے بھائی نے اتنی مشکل سے وہ پلانٹس منگوائے تے

جنہیں آج آپ ایک سال کی مقدار کے برابر پانی ایک ہی وقت میں دے چکی ہیں' سانس لینے کا موقع بھی نہیں دیا بے چاروں کو' اب جا کر دیکھیں وہ کھل کر مسکرا اٹھے ہیں"۔ شان کے مضحکہ خیز انداز پر سدرہ نے ہنستے ہوئے سارہ کے شرمندہ چہرے کو دیکھا تھا۔

ٹیرس تک پہنچتے پہنچتے سارہ کا چہرہ اتر گیا تھا کیونکہ شیث بڑی سنجیدگی اور فرصت سے ان پلانٹس کا جائزہ لے رہا تھا جو بالکل ڈھے چکے تھے۔ چونک کر وہ اس کی جانب متوجہ ہوا تھا جو شرمندگی کے ساتھ سامنے آرکی تھی مگر نظریں اس کی مرجھائے پلانٹس پر ہی تھیں۔

"سوری..... مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ عام پلانٹس نہیں ہیں"۔ ندامت کے ساتھ سارہ نے اس بار اسے دیکھا تھا۔

"معذرت کی کوئی ضرورت نہیں..... یہاں تو لفظوں کے نشتر برسا کر دل کو مردہ کر دیا جاتا ہے تو پھر ان پودوں کا مرجھا جانا کسی کیلئے کیا معنی رکھ سکتا ہے"۔ وہ سرد لہجے میں بولا تھا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وہ بمشکل ضبط کرتے ہوئے بول اٹھی تھی۔

"کم از کم تم سے تو اب کچھ نہیں کہنا چاہتا"۔ سرد نظروں سے اسے دیکھتا وہ بولا تھا جبکہ سارہ فوراً ہی جانے کیلئے پلٹ گئی تھی۔

تیز قدموں کے ساتھ سیڑھیاں اترتی وہ شمس کو نہیں دیکھ سکی تھی جن کی گھر میں آمد اسی وقت ہوئی تھی' سارہ کے چہرے کے تاثرات نے انہیں چونکایا تھا۔ اس لیے سوالیہ نظروں سے قریب آتے شان کو دیکھا تھا۔

پلانٹس پر نظر ڈالتے وہ اس کی سمت آئے تھے جو ان کی طرف ہی متوجہ تھا۔

"تم نے سارہ سے کچھ کہا ہے؟" شمس نے بغور اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھا تھا۔

"میں اس سے کیا کہوں گا؟" وہ جواباً سوال کر گیا تھا۔

"اسے دیکھ کر مجھے لگا تھا کہ اس کی غلطی پر تم نے اس سے کوئی سخت بات کی ہے' اس لیے تم سے پوچھ رہا تھا"۔ شمس نے کہا تھا۔

"آپ کو لگتا ہے کہ ان پلانٹس کو لے کر میں اس سے کوئی سخت بات کہہ سکتا ہوں؟ آپ پہلے اس سے پوچھ لیں کہ میں نے کیا غلط کہا ہے یا کیا کہہ کر اسے شرمندہ کیا ہے اس کے بعد آپ چاہیں گے تو میں اس سے معافی بھی مانگ لوں گا"۔

"معافی مانگنے کی بات کہاں سے درمیان میں آگئی' میں نے ایک سوال کیا کر لیا تم اسے کہاں سے اٹھا کر کہاں لے گئے ہو"۔ شمس شدید ناراضگی سے بولے تھے۔

"ٹھیک ہے پھر میں خاموش ہی ہو جاتا ہوں"۔ انتہائی سنجیدگی سے بولتا وہ ان کے سامنے سے ہٹ گیا تھا جبکہ شمس خود بھی وہاں نہیں رکے تھے۔ تعلقات میں دراڑیں اور سرد مہری کو وہ اچھی طرح محسوس کر سکتے تھے مگر شیث سے اس بارے میں کوئی بات کرنا ان کیلئے مشکل ہوتا جا رہا تھا' کیونکہ وہ قبول کرتے تھے کہ پس پردہ ہر چیز کی ذمہ دار خود ان کی ہی ذات ہے۔



لاؤنج میں اسے سوائے شیری کے کوئی دکھائی نہیں دیا تھا' کارپٹ سے اسے اٹھاتے ہوئے وہ صوفے پر بیٹھا ہی تھا جب قریب رکھا سیل فون چیخا تھا۔ سیل فون یقیناً سارہ کا تھا جبکہ اسکرین پر چمکتے نام نے اس کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔ بس ایک نظر اس نے اپنی سمت آتی سارہ پر ڈالی تھی اور سیل وہیں رکھ دیا تھا جہاں سے اٹھایا تھا' دوسری جانب

اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ سارہ نے نا چاہتے ہوئے بھی عاشر کی کال ریسیو کر لی تھی۔

"آپ سب اس وقت کھانے پر جا رہے ہیں مگر میں تو......" وہ گڑبڑا اٹھی تھی جب سدرہ نے سرعت سے سیل فون اس سے لے لیا تھا۔ کن انکھیوں سے سارہ نے اسے دیکھا تھا جو تنے ہوئے چہرے کے ساتھ شیری کی طرف ہی متوجہ تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے عاشر! مگر اتنی رات ہو چکی ہے دوبارہ پروگرام بناؤ گے تو میں بھی ساتھ چلوں گی' کتنے دن ہو گئے ہم سب مل کر کہیں نہیں گئے"۔ سدرہ فون پر بات کرتے ہوئے سارہ کو بھی گھور رہی تھیں۔

"تم کوئی بہانہ نہیں بنا سکتی تھیں' پتا بھی ہے وقت کیا ہو رہا ہے"۔ سدرہ اسے گھر کنا نہیں بھولی تھیں۔

"آپ نے موقع دیا کب مجھے' ایک تو یہاں سب رائی کا پہاڑ بنا لیتے ہیں اور پھر جو دل چاہتا ہے کہہ ڈالتے ہیں مجھے"۔ غصیلے انداز میں وہ بولی تھی کہ پہلے ہی شیث نے عاشر کی کال دیکھ لی ہے او پر سے اس کی موجودگی میں سدرہ کی ڈانٹ مزید اس کے تیور بگاڑ گئی تھی۔ اپنی پشت پر چبھتی سرد نگاہیں محسوس کرتی وہ تیز قدموں کے ساتھ لاؤنج سے نکل گئی تھی۔

☆

صبح کا اجالا مکمل پھیل چکا تھا گیٹ کے قریب پہنچ کر اس نے ارد گرد بکھرے اخبار اٹھائے تھے اور گراؤنڈ کی سمت بڑھ گئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ کون سا اخبار کس پورشن میں جاتا ہے ورنہ وہ خود پہنچا دیتی' سارے اخبارات باؤنڈری پر رکھ کر وہ خود اس اخبار کو پڑھنے بیٹھ گئی تھی جو شمس پڑھتے تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹوں کے درمیان اسے مخصوص ٹک ٹک کی آواز سنائی دی تھی جو چونک کر سر اٹھایا تھا' وہ بھی یقیناً اخبار کی طلب میں اسی جانب آ رہا تھا' کچھ جھجکتے ہوئے سارہ نے اسے سلام کیا تھا' دوسری جانب عاطف نے حیرت سے باؤنڈری پر ترتیب سے رکھے اخبارات کو دیکھا تھا۔

"کیا اس اسٹال سے مجھے اخبار خریدنا پڑے گا"۔ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے سارہ کو دیکھا تھا۔

"یہ تو میں نے اس لیے یہاں رکھ دیئے کہ گیٹ کے پاس پڑے تھے' آپ کو کون سا اخبار چاہیے؟" جھینپ کر بولتے ہوئے سارہ نے پوچھا تھا۔

"میں خود لے لوں گا آپ اخبار پڑھیں"۔ عاطف نے کہا تھا اور ایک اخبار اٹھاتا کچھ فاصلے پر جا کر باؤنڈری کے گرد ہی بیٹھ گیا تھا۔

اخبار کا صفحہ پلٹتے ہوئے سارہ نے اسے دیکھا تھا جو اخبار پڑھنے میں ہی منہمک تھا۔

"آج تعلیمی ادارے بند ہیں' آپ کی اکیڈمی بھی بند ہی ہوگی؟" سارہ کی آواز پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"جی...... ظاہر ہے"۔ اس کا لہجہ سادہ ہی تھا مگر وہ پھر بھی اپنے بے وقوفانہ سوال پر خجل سی ہوئی تھی' تب ہی اس کی نظر سامنے ٹیرس کی طرف اٹھی تھی جہاں موجود شیث اسی جانب متوجہ تھا۔ سارہ کی نظروں کے تعاقب میں عاطف بھی اس کی جانب متوجہ ہوا تھا اور اشارے سے اسے نیچے آنے کی دعوت دی تھی' جواباً وہ بھی اشارے میں کچھ کہتا اب ٹیرس سے جا رہا تھا۔

ٹیرس سے نظر ہٹا کر عاطف نے سارہ کو دیکھا تھا جو گڑبڑا کر اخبار پر جھک گئی تھی' مسکراہٹ چھپاتے ہوئے عاطف نے ایک بار پھر خالی ٹیرس کی جانب دیکھا تھا۔ کچھ دیر گزری تھی جب عاطف کے ساتھ وہ بھی مومو کے پورشن کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔ باؤنڈری سے نکی سیاہ اسٹک تھامتے ہوئے عاطف اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا۔

"امی آپ کو بھی بلا رہی ہیں"۔ وہ سارہ سے مخاطب تھا' جو خود بھی دیکھ چکی تھی اس لیے خاموشی سے نپے تلے

قدموں کے ساتھ عاطف کے قدموں کا ساتھ دینے کی کوشش کرتی آگے بڑھ گئی تھی۔

برآمدے میں عاطف کے ساتھ ہی ٹیبل کے گرد کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے ناشتے کے لوازمات کو دیکھا تھا۔

"سارہ! اب تم ساتھ دو گی تو یہ ناشتہ کرنے میں نخرہ نہیں کرے گا' ورنہ ناشتے کے نام پر یہ چائے کے علاوہ کسی چیز کی طرف دیکھتا بھی نہیں ہے"۔ عاطف کی والدہ کچھ ناراضی سے سارہ کو بتا رہی تھیں۔

"مگر یقین کریں میں تو ناشتہ کر چکی ہوں"۔ اس نے بتایا تھا۔

"تو کیا فرق پڑتا ہے' آپ یہ حلوہ تو ضرور کھائیں' امی بہت مزیدار حلوہ بناتی ہیں"۔ عاطف نے کہا تھا۔

"تم نے پہلے تو کبھی اس طرح تعریف نہیں کی' آج کیسے خیال آ گیا"۔ عاطف کی والدہ نے شکایت کی تھی۔

"تعریف کرو تو شکایت' نہ کرو تو بھی شکایت"۔ عاطف کے کہنے پر سارہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔

"اگر میں خاموشی سے آپ کے بنائے گئے کھانے کھا رہا ہوں تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ وہ سب مجھے پسند ہے اور مرغوب ہو کر کھاتے ہوئے مجھے تعریف کرنے کا موقع نہیں مل رہا"۔ وہ مسکراتے لہجے میں بولا تھا۔

"اب باتوں میں تم سے کون جیت سکتا ہے"۔ اس کی والدہ بولی تھیں۔

"بات تو صرف میں کر رہا ہوں' آپ سارہ کو شامل نہ کریں' وہ تو خاموش ہیں"۔

"تم خاموش ہو گے تو وہ کچھ بولے گی"۔ ان کے خشمگیں لہجے پر سارہ نے مسکرا کر انہیں دیکھا تھا۔

"مومو تو ابھی سو رہی ہو گی؟" اس نے پوچھا تھا۔

"اتنی جلدی وہ جاگ بھی کیسے سکتی ہے۔ تم کھانا تو شروع کرو' میں چائے نکالتی ہوں"۔ ان کی بات ابھی نامکمل تھی جب عاطف نے اسے پکارا تھا جو متوجہ ہونے کے بعد اب اسی جانب آ رہا تھا۔ سارہ نے دوبارہ اس کی جانب نہیں دیکھا تھا جو سلام کرتے ہوئے اب کرسی کھینچتا بیٹھ رہا تھا۔

"اب آرام سے بیٹھ کر ساتھ ہی ناشتہ کرو"۔ عاطف کی والدہ اسے تاکید کرتیں اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھیں۔

"نہیں چچی جان! ابھی تو میں واک کیلئے جا رہا ہوں لیکن واپس آ کر یہ حلوہ ضرور کھاؤں گا"۔ عاطف سے جوس کا گلاس لیتے ہوئے وہ بولا تھا۔

"اچھا پھر ذرا جلدی آ جانا"۔ انہوں نے مزید تاکید کی تھی اور پھر سارہ کو کچھ دیر میں اپنی واپسی کا بتاتیں گھر کے اندر چلی گئی تھیں۔

"سارہ! آپ نے تو کچھ نہیں لیا ابھی تک' کم از کم یہ حلوہ ہی ٹھیک طرح کھائیں' بلکہ میں ہی اور نکال دیتا ہوں"۔ بولتے ہوئے عاطف نے خود ہی اس کی پیالی میں حلوہ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔

"یہ بہت ہو جائے گا' میں اتنا نہیں کھا سکوں گی"۔ سارہ اسے روکتی ہی رہ گئی تھی مگر وہ اَن سنی کر گیا تھا' دوسری جانب گلاس سے سپ لیتے ہوئے شیث کی سنجیدہ نظریں ان دونوں پر ہی تھیں۔

"اب کل واک پر چلے جانا' آج تو کافی دیر ہو گئی ہے"۔ عاطف نے سرسری انداز میں کہا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو' دیر تو واقعی بہت ہو چکی ہے"۔ اس کے لہجے میں کچھ تھا جو سارہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا مگر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آج تو میں گھر میں ہی ہوں' تم آفس سے واپس آؤ گے تو گھر پر آؤں گا' تمہارے کمپیوٹر میں جو بھی پرابلم ہے ساتھ مل کر ہی دیکھ لیں گے"۔ عاطف نے کہا تھا جبکہ وہ اثبات میں سر کو حرکت دیتا جانے کیلئے پلٹ گیا تھا۔

☆

’’بھابی! ذرا جلدی کریں‘ عاطف بھائی نے چائے کی طلب میں دوڑیں لگوا دی ہیں میری‘‘۔ تیسرے چکر میں شاہ رخ جھلا اٹھا تھا۔

’’بس تیار ہے چائے‘ میں آ ہی رہی تھی‘‘۔ سارہ نے کہا تھا۔

’’میں ہی لے جاتا ہوں‘‘۔ وہ عجلت میں بولا تھا۔

’’اس طرف سے نکلیں؟‘‘ سارہ نے کچن کے دوسرے گیٹ کی سمت اشارہ کیا تھا۔

’’تم کہیں سے بھی نکل جاؤ‘ پہنچو گی وہیں سورج مکھی کے باغ میں‘‘۔ ٹرالی سنبھالتے ہوئے وہ بولا تھا۔

’’آپی! آپ سن رہی ہیں؟‘‘ سارہ نے شکایتی لہجے میں کہا تھا۔

’’نہیں...... تم بھی مت سنو‘‘۔ شاہ رخ کو گھورتے ہوئے سدرہ نے کہا تھا۔

’’اتنا فارمل ہونے کی کیا ضرورت تھی‘ میں نے تو صرف ایک کپ چائے کا کہا تھا‘‘۔ عاطف نے حیرت کے ساتھ ان دونوں کو دیکھا تھا۔

’’معاف کیجیے گا یہ سارا اہتمام واحد آپ کیلئے بھابی صاحبہ نے نہیں کیا‘ ان دو محنت کش حضرات کی آمد بھی ہونے والی ہے جن کے علاوہ باقی سب مکھیاں مارتے ہیں‘‘۔ شاہ رخ پتا نہیں کیوں جل کر بولا تھا۔

’’ایسا بالکل نہیں ہے‘ اس سارے اہتمام میں میری محنت زیادہ ہے‘ تعریف سننے کا مجھے شوق ہے تو ابتداء آپ ہی کر دیں‘‘۔ کیک پیس پلیٹ میں نکالتے ہوئے سارہ نے کہا تھا۔

’’تمہاری یہ حسرت ہی رہ جائے گی‘ عاطف بھائی ہر معاملے میں کنجوس ہیں‘‘۔ شاہ رخ نے خبردار کیا تھا۔

’’ایسا ہے تو مجھے حیرت نہیں ہو گی کیونکہ عموماً میرا سابقہ ایسے ہی انسانوں سے پڑتا ہے‘‘۔ سارہ نے مسکراتے ہوئے عاطف کو دیکھا تھا۔

’’میرا خیال ہے کہ میں اس دنیا کا واحد انسان ہوں جس کی بدنامی کے چرچے اس کے اپنے ہی گھر سے شروع ہوتے ہیں‘‘۔ عاطف کی بات پر شاہ رخ بے ساختہ ہنسا تھا۔

’’میں مذاق کر رہا ہوں سارہ! عاطف بھائی تو اتنے دریا دل ہیں کہ عنقریب میری سیلری ڈبل کرنے والے ہیں‘‘۔

’’اب باتوں باتوں میں تم اپنی خواہش نہ بیان کرو‘‘۔ عاطف کے خشمگیں لہجے پر سارہ نے ہنستے ہوئے شاہ رخ کو دیکھا تھا۔

’’آپ کیلئے اور کیک نکالوں؟‘‘ سارہ نے عاطف سے پوچھا تھا۔

’’نہیں شکریہ مگر چائے مزید شیث کے ساتھ پیوں گا بہت اچھی بنی ہے‘‘۔

’’شاہ رخ! تمہیں دوں؟‘‘

’’بس اب چائے کے علاوہ کچھ نہیں‘ سینڈوچ ہیوی ہو گئے ہیں‘‘۔

’’آپ کی کیا مصروفیات ہیں سارہ؟‘‘ عاطف نے اسے مخاطب کیا تھا۔

’’ان کی مصروفیات کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ہمارے گھر میں ہنی اور شیری کے علاوہ کوئی ان سے محفوظ نہیں رہا ہے‘‘۔ شاہ رخ درمیان میں بول اٹھا تھا جبکہ اس کے ہنستے چہرے کو گھورتی وہ گر جانے والے بریسلیٹ کو اٹھا رہی تھی تب ہی تیز ہارن کی آواز پر شاہ رخ اٹھا تھا۔

’’گیٹ کی طرف کوئی نہیں ہے مجھے جانا پڑے گا‘‘۔ بولتے ہوئے تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ گیا تھا۔

’’اس کا لاک شاید لوز ہو گیا ہے خود بخود کھل جاتا ہے‘‘۔ بریسلیٹ کا جائزہ لیتی وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی تھی۔

’’مجھے دکھائیں‘‘۔ عاطف کے کہنے پر اس نے اس کے حوالے کیا تھا۔

’’اس کا لاک تو ٹھیک ہے شاید آپ ٹھیک طرح نہیں لگا رہی ہیں‘‘۔ عاطف نے کہا تھا۔

’’شاید ایسا ہی ہو‘ یہ میرا ہے بھی نہیں‘ آج آپی نے پہنا دیا تھا تو......‘‘ بولتے ہوئے اس کی نظریں کھلے گیٹ کی سمت تھیں۔

’’ہاتھ لائیے‘ میں لاک لگا دیتا ہوں‘‘۔ عاطف کے کہنے پر اس نے بلا سوچے سمجھے ہاتھ اس کی سمت بڑھا دیا تھا۔

گاڑی کے اندر آنے کا انتظار کرتے شاہ رخ نے کچھ چونک کر ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شیث کو دیکھا تھا اور پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں اس جانب دیکھا تھا جہاں عاطف اب سارہ کے ہاتھ میں بریسلیٹ پہنا رہا تھا۔ کسی بھی جانب دیکھے بغیر شیث گھر کے اندر جا چکا تھا جبکہ شمس اسی جانب بڑھ آئے تھے۔

’’آج خوب آرام کیا تم نے‘‘۔ عاطف کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ بولے تھے۔

’’جی ہاں مگر اس کے باوجود آپ زیادہ فریش نظر آ رہے ہیں‘‘۔ عاطف نے مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

’’ہاں بالکل تمہیں دیکھ کر فریش ہو گیا ہوں‘‘۔ شمس نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

’’آپ کیلئے چائے نکالوں؟‘‘ سارہ نے انہیں متوجہ کیا تھا۔

’’سدرہ کہاں ہے؟‘‘ جواباً انہوں نے پوچھا تھا۔

’’میرے ہاتھ سے چائے لیں گے تو ذائقہ چینج نہیں ہو جائے گا‘‘۔ وہ خفت سے بولی تھی۔

’’ویسے ہی پوچھ لیا تھا‘‘۔ شمس کے حیرانگی سے کہنے پر عاطف نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا جو مسکراہٹ چھپائے چائے کپ میں نکال رہی تھی۔

’’تم بتاؤ تمہاری اکیڈمی میں سب کیسا جا رہا ہے؟‘‘ وہ عاطف سے مخاطب تھے۔

’’اللہ کا شکر ہے‘ آپ سب کی دعا ہے ویسے اگر آپ بھی ایک دو گھنٹے کے لیے وہاں قدم رنجہ فرما لیا کریں تو یہ میرے لیے اعزاز ہو گا‘‘۔

’’معاف کرو مجھے‘ فیکٹری کے بکھیڑے سمیٹنے کے بعد میرا سارا وقت میرے گھر کیلئے ہوتا ہے‘ میرے گھر کے بھی دو بندے اگر کافی نہیں پڑ رہے تو شیث سے بات کرو‘ آفس کے بعد وہ جم بھی ریگولر نہیں جاتا ہے‘‘۔ شمس نے کہا تھا۔

’’میں ہرگز بھی آپ کے اس مشورے پر عمل کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا‘ اس کا تو چند منٹ کا دورہ ہی اکیڈمی میں ہلچل مچا دیتا ہے‘ مجھے کچھ دن کیلئے عارضی طور پر Hardware کی کلاس کیلئے ٹیچر کی ضرورت تھی‘ شاہ رخ سے کسی نہ کسی طرح میں نے ایکسٹرا ٹائم نکلوا لیا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اگر ہفتہ بھر بھی شیث اکیڈمی آتا رہا تو وہاں گرلز سمیت بوائز اسٹوڈنٹس نے بھی اپنے کورسز چھوڑ کر Hardware کی کلاس ہی اٹینڈ کرنی ہے‘‘۔ عاطف کے تفصیلی جواب پر سارہ نے حیرت سے ان دونوں کے مسکراتے چہروں کو دیکھا تھا۔



دستک کے بعد شاہ رخ کمرے میں داخل ہوا تھا جہاں وہ جوتوں سمیت بیڈ پر دراز تھا۔

’’آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟‘‘ شاہ رخ کی آواز پر اس نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا تھا۔

’’کیا کہنا ہے؟‘‘ اس کے سنجیدہ لہجے پر شاہ رخ حیران ہوا تھا۔

’’عاطف بھائی کافی دیر سے انتظار کر رہے تھے اس لیے بلانے آیا تھا‘‘۔

’’جاتے ہوئے دروازہ بند کر کے جانا‘‘۔ سرد لہجے میں اس نے ہدایت کی تھی‘ دنگ نظروں سے شاہ رخ نے اسے

دیکھا تھا جو دوبارہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ چکا تھا۔

شاہ رخ کے جانے کے بعد کچھ وقت گزرا تھا جب دروازے پر دستک کے ساتھ عاطف نے اسے پکارا بھی تھا۔

"آجاؤ"۔ بوجھل انداز میں بالوں میں انگلیاں پھیرتا وہ اٹھ بیٹھا تھا۔

"میں تمہارے واپس باہر آنے کا انتظار کرتا رہا تھا مگر پھر مجھے لگا کہ تم تھک گئے ہو گے تو خود یہاں آ گیا"۔ اندر آتے ہوئے عاطف بول رہا تھا مگر اس کے دل و دماغ میں طوفان سے اٹھنے لگے تھے جب عاطف کے پیچھے سارہ کمرے میں داخل ہوئی تھی اور اب کسی بھی جانب دیکھے بغیر چائے اور دیگر لوازمات ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔

"جلدی فریش ہو کر آجاؤ' میں دوبارہ تمہارے ساتھ چائے پیوں گا"۔ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھتے عاطف نے اسے مخاطب کیا تھا جو ایک سرد نگاہ دروازے کی سمت جاتی سارہ پر ڈالتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"سارہ! عاطف کی آواز پر سارہ کے ساتھ وہ بھی واش روم کی سمت جاتے جاتے رکا تھا۔

"اگر زحمت نہ ہو تو شیری کو یہاں پہنچا دیں لیکن اس کا موڈ اچھا ہے تو"۔

"ابھی لاتی ہوں"۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولتی وہ باہر نکل گئی تھی۔

شیری کو گود میں اٹھائے وہ سدرہ کے کمرے سے نکلی تھی جب سامنے سے شان آتا دکھائی دیا تھا۔

"ایسا لگتا ہے مجھے کوئی کام دھندہ نہیں ہے' باہر مجھے فون پر حکم دے رہے ہیں کہ شیری کو لے کر اوپر آؤ"۔ وہ جھلا کر بتا رہا تھا۔

"میں لے کر جا تو رہی تھی' کس نے فون کیا تمہیں؟" وہ حیرت سے بولی تھی۔

"چھوٹے بھائی نے اور کس نے"۔ وہ بگڑے انداز میں شیری کو لیتا واپس پلٹ گیا تھا جبکہ وہ الجھی کھڑی رہ گئی تھی۔



باہر آ کر اس نے ایک نگاہ موموکے پورشن کی جانب ڈالی تھی جہاں وہ برآمدے میں کرسی پر سر نیہواڑے اداس بیٹھی تھی' مسکراہٹ چھپائے وہ شاہ رخ کی سمت بڑھی تھی جو گراؤنڈ کی باؤنڈری پر بیٹھا اپنے سیل فون کو چیک کر رہا تھا۔

"سنو...... مجھے تم سے کچھ کہنا ہے اگر تم مصروف نہیں ہو تو؟" سارہ کے سنجیدگی سے کہنے پر وہ حیران سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

"دیکھیں سارہ جی! آپ بہت دیر کر چکی ہیں لیکن اگر آپ کو احساس ہو ہی چکا ہے تو خدارا کچھ کہنے کی ضرورت نہیں' میں آج بھی آپ کے ایک اشارے پر لیڈی گاگا کو بھی اپنی زندگی سے نکال سکتا ہوں"۔ وہ انتہائی سنجیدگی اور جذباتی انداز میں بولا تھا۔

"ایکسکیوزمی"۔ پیچھے سرکتے ہوئے سارہ نے اسے گھورا تھا۔

"ارے بولو یار! کیا کہنے آئی تھیں"۔ وہ جھلائے انداز میں بولا تھا۔

"ختم کر دو ناراضگی' دیکھو وہ کتنی اداس بیٹھی ہے"۔ سارہ نے اس کی توجہ موموکی سمت دلائی تھی۔

"یہ سارے ڈرامے میرے لیے پرانے ہیں' تم دیکھو"۔ وہ سر جھٹک کر بولا تھا۔

"وہ منگیتر ہے تمہاری"۔ سارہ نے گھرکنے والے انداز میں کہا۔

"جہنم میں گئی منگیتر...... اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھ پر ہیبت طاری ہونے لگتی ہے"۔ وہ جس طرح بولا تھا سارہ کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

"کبھی اپنی اور میری بات کرنے بھی پاس آجایا کرو"۔ وہ یکدم ہی بڑی لگاوٹ سے گویا ہوا تھا۔

"کیا مطلب ہے؟" سارہ نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"مطلب یہ کہ میں برداشت کر لوں گا میرا رقیب اس گھر میں ہی ہے' رقیب بھی وہ جو ہری جھنڈی لہرا رہے ہیں مگر تمہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا' کتنا اچھا لگے گا جب ہم دونوں ساتھ ساتھ باہر گھومنے جائیں گے اور وہ......" اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی جب سارہ دونوں ہاتھوں سے اسے پرے دھکیلتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تمہاری نیت کا فتور کبھی نہیں جائے گا دغاباز"۔ خونخوار انداز میں وہ اس پر برس اٹھی تھی۔

"اب جیسا بھی ہوں قبول کر لو"۔ وہ ڈھٹائی سے بولا تھا۔

"دفع ہو جاؤ"۔ بھنا کر بولتی وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

"بہت دنوں سے عزت افزائی نہیں ہوئی تھی آج سکون مل گیا"۔ بڑے اطمینان سے خود کلامی کرتا وہ اٹھا تھا اور انگڑائی لیتے ہوئے ہاتھ جہاں تھے وہ ساکت ہو گئے تھے' ٹیرس کی باؤنڈری پر بازو ٹکائے شیث بڑی توجہ سے اسے ہی دیکھ رہا تھا جس کی سٹی گم ہو گئی تھی۔

"او پروا لے! انسان خطا کا پتلا ہے بھول چوک ہو ہی جاتی ہے"۔ آسمان پر نظر جمائے شاہ رخ بولا تھا۔

"کیوں بھیا! ہم نے ٹھیک کہا ناں؟" اس بار اس نے شیث کو دیکھا تھا۔

"اوپر آجاؤ' تمہاری آواز نہیں آ رہی"۔ جواب آیا تھا۔

"اتنا پاگل نہیں ہوں"۔ وہ ہنستے ہوئے مزے سے بولا تھا۔

ٹیبل سے پیر ہٹاتے ہوئے مومو نے ایک بیزار نظر شان کے مسکراتے چہرے پر ڈالی تھی جو ٹیبل کے گرد آ بیٹھا تھا۔

"تم تک پہنچتے پہنچتے اس کے پاس عزت نام کی کوئی چیز نہیں رہے گی"۔ اس کا اشارہ شاہ رخ کی سمت تھا۔

"خاموشی سے بیٹھی سب دیکھ رہی ہو تم وہاں گئیں کیوں نہیں؟"

"میں صبر کے ساتھ ان کو دیکھ رہی تھی جو بت شکن ٹائپ کی چیز بنے اوپر سے سین دیکھ رہے تھے جا کر سمجھاؤ انہیں کہ اپنی محبوبہ کو ایک بار غور سے دیکھ لو اگر فرصت ملے تو...... وہ بے چاری سب کو بھائی بھائی کہتے نہیں تھکتی اور بھائی سارے اس کے ہی آسرے پر آنکھیں ٹکائے بیٹھے ہیں"۔ وہ بری طرح جل کر بولی تھی۔

"اب ایسا بھی نہیں ہے"۔ شان نے اسے گھورا تھا۔

"ویسے خیریت ہے آپ بڑی فرصت سے بڑے دن بعد بات کرنے آئے ہیں' انجوائے منٹ کیلئے کوئی اور شاید قبضے میں نہیں آیا تھا"۔ مومو نے خشمگیں مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔

"میرے خلوص پر شک مت کیا کرو تم' میں تو یہ پوچھنے آیا تھا کہ ایسا بھی کیا ہو گیا جو وہ تم سے فرنٹ ہو کر پھر سارہ کے پیچھے بھاگ رہا ہے"۔ شان کچھ ناراضی سے بولا تھا۔

"دو ٹکا سا بن گیا فوراً تو مولود اجو کچھ معلوم نہیں"۔ کرسی پرے کھسکاتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"بھڑ کانے آیا تھا مجھے جانے کس کے نصیب پھوڑے گا' نکل یہاں سے"۔ وہ پہلے ہی بھری بیٹھی تھی' اس کے حملوں سے بچتے ہوئے شان سرعت سے برآمدے سے نکلا تھا۔

"اب دیکھنا بیٹا! یہ آگ جا کر کہیں اور بھڑ کاؤں گا"۔ شان دھمکی دیتا ہوا گیا تھا۔

"تجھے اللہ ہی پوچھے گا' مجھے بھڑ کا بھڑ کا کر امیج تباہ کر دیا' ٹھیک ہی کہتی ہے سدرہ تم بھائیوں کے ہوتے ہوئے کسی ساس نند کی ضرورت نہیں"۔ شان کی ہنسی نے اسے اور بھڑ کا کر جلنے کا موقع دیا تھا۔

''سنو..... تمہارے واصف بھائی انگیجڈ ہیں؟ کب تک ارادہ ہے ان کی شادی کا؟'' باؤنڈری کے گرد بیٹھتے ہوئے اس نے مومو سے پوچھا تھا۔

''انہوں نے تو عہد کر رکھا ہے کہ ان کی اور عاطف بھائی کی شادی ایک ہی وقت میں ایک ساتھ ہی ہوگی مگر ابھی دور دور تک کوئی امکان نہیں کیونکہ عاطف بھائی شادی کے ٹاپک سے الرجک ہیں''۔ مومو نے بتایا تھا۔

''ایسا کیوں؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں''۔ مومو نے شانے اچکائے تھے۔

''ایک بات پوچھوں تم سے ناراض تو نہیں ہوگی؟'' اس کے جھجکتے انداز پر مومو نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''عاطف بظاہر بالکل نارمل نظر آتے ہیں تو پھر انہیں اسٹک کے سہارے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟''

''ہاں تم نے ٹھیک کہا مگر قدم جما کر اور اپنا توازن قائم رکھنے کیلئے اسٹک کی انہیں ضرورت ہوتی ہے وہ بائی برتھ ایسے ہیں''۔ مومو نے سنجیدگی سے بتایا تھا۔

''چھوٹے بھائی ان کی اسٹک کی بہت عزت کرتے ہیں' ان کے سامنے مذاق میں بھی کوئی عاطف بھائی کی اسٹک کو ہاتھ نہیں لگا سکتا''۔

''واقعی؟'' سارہ نے متاثر ہو جانے والے انداز میں پوچھا۔

''تم نے اب تک ان سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی؟'' کچھ دیر بعد مومو نے پوچھا تھا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ میں نے کوشش نہ کی ہو مگر زبان سے لگائے گئے زخم اتنی جلدی مندمل نہیں ہوتے' میں نے جو بویا ہے وہ اب صبر کے ساتھ کاٹنا ہی ہے' اس وقت تک جب تک اس کے دل سے ساری بدگمانی دور نہ ہو جائے''۔ وہ مدھم لہجے میں بولی تھی۔

''وہ تم سے کبھی بدگمان نہیں ہو سکتے''۔ مومو نے اسے تسلی دینی چاہی تھی۔

''مگر میں نے خود اسے بدگمان ہونے پر مجبور کیا ہے' انسان جس سے محبت کرتا ہے وہی جب دل پر وار کر جائے تو کیا باقی رہ جاتا ہے' وہ کبھی مجھ سے ایسی سنگدلی کی امید نہیں کر سکتا تھا' مگر میں اسے یہ نہیں سمجھا سکتی کہ اس وقت میں خود کس کیفیت سے گزر رہی تھی' شاید میں پاگل ہو گئی تھی جو اسے دھتکار بیٹھی''۔ اس کا لہجہ ہی نہیں آنکھیں بھی نم ہونے لگی تھیں۔

''تم فکر مت کرو' کچھ وقت گزرے گا پھر سب ٹھیک ہو جائے گا' وہ سب سے محبت کرنے والے انسان ہیں اور تمہارا تو ان کے ساتھ معاملہ ہی کچھ الگ ہے''۔ مومو نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

''تمہیں وہ ہر سچائی کے ساتھ قبول ہیں؟'' مومو کے اچانک سوال پر وہ چونکی تھی۔

''تم کس سچائی کی بات کر رہی ہو؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''وہی سچائی جس سے تم اچھی طرح واقف ہو''۔ مومو نے بغور اسے دیکھا تھا۔

''اس کا انتخاب اللہ نے میرے لیے کیا ہے یہ سچائی ہر سچ سے اہم ہے اور قبول بھی ہے''۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

''مجھے بہت فخر ہوتا ہے کہ چھوٹے بھائی کی زندگی میں تم جیسی قدر کرنے والی لڑکی موجود ہے''۔ مومو کے تعریفی لہجے پر وہ بس مسکرائی تھی تب ہی گیٹ پر ایک ساتھ کئی ہارن گونجے تھے۔

''یہ جلوس کہاں سے آ گیا؟ سارا سکون غارت ہو گیا ہے''۔ ریڈ سوک کے آگے پیچھے اندر آتیں بائیکس نے

اسے بدمزہ کیا تھا۔

''کیا ہو گیا' اپنے بھائی لوگ ہیں' محنت کر کے لوٹے ہیں گھر''۔ مومو نے اسے گھورا تھا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑے ریڈ سوک کی جانب بڑھ گئی تھی۔

شکر میرے چاکلیٹس لے آئے ورنہ روز بھول کر آ جاتے ہیں''۔ بے تابی کے ساتھ شاپر جھپٹتے ہوئے مومو کی بات ادھوری رہ گئی تھی جب اس کا چھوٹا بھائی شاپر چھینتا وہاں سے بھاگا تھا' جبکہ مومو بھی چیختی چلاتی اس کے پیچھے بھاگی تھی۔

''آپ بھی ان کے پیچھے بھاگیں' ان چاکلیٹس میں آپ کا بھی حصہ ہے''۔ گاڑی لاک کرتے ہوئے عاطف نے کہا تھا۔

''آپ کی اکیڈمی تو شاید دس بجے آف ہو جاتی ہے اور اس وقت تو بارہ بجنے والے ہیں''۔ وہ عاطف سے مخاطب تھی۔

''جی ہاں مگر آج راستے میں ہم سب ایک ریسٹورنٹ میں رک گئے تھے وہیں اتنا وقت ہو گیا''۔ عاطف بتا رہا تھا تب ہی وہ چونک کر پیچھے رکتی بائیک کی طرف متوجہ ہوئی تھی' شان کے ہمراہ ہی وہ کہیں سے واپس آیا تھا۔ عاطف کی پکار پر وہ ہیلمٹ شان کے حوالے کرتا قریب آ رہا تھا' دوسری جانب سارہ کو سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ کس طرف نکل جائے۔

''کہاں تھے تم؟ میں کال کرتا رہا مگر تم نے ریسیو نہیں کی''۔

''ایک کام سے گیا تھا موقع نہیں ملا کال ریسیو کرنے کا''۔

''آپ اپنے حصے کے چاکلیٹس لیں جا کر ورنہ مومو سب ہضم کر لے گی''۔ شیث بول رہا تھا جبکہ یکدم یاد آنے پر عاطف نے سارہ سے کہا تھا۔

''کوئی بات نہیں' ویسے بھی مجھے چاکلیٹس زیادہ پسند نہیں''۔ وہ جھینپ کر بولی تھی۔

''پسند ہیں یا نہیں مگر جا کر لیں مومو سے' میں آپ کے حصے کے بھی لایا ہوں''۔ عاطف کے مزید عجلت میں کہنے پر وہ بے ساختہ مسکراتی وہاں سے گئی تھی جبکہ شیث جواب تک خاموشی سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا خود بھی جانے کیلئے پلٹ گیا تھا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' عاطف نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

''تمہارے پاس مجھ سے بات کرنے کا وقت نہیں ہے جو میں رُکوں تمہارے پاس......؟'' اس کے سرد لہجے پر عاطف دنگ ہی تو رہ گیا تھا جبکہ وہ اب تیز قدموں کے ساتھ اپنے پورشن کی جانب جا رہا تھا۔

☆

بائیک کی مرمت کرتے شاہ رخ کو چائے کا مگ تھما کر وہ آگے بڑھ گئی تھی جہاں عاطف ٹیبل کے گرد موجود گراؤنڈ میں جاری گیم کو دیکھ رہا تھا۔

''مومو کہاں چلی گئی؟'' چائے کا مگ اسے پیش کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں' ابھی تو یہیں تھی''۔ عاطف نے ادھر اُدھر نظر بھی دوڑائی تھی۔

''میں نے تمہیں پریشان کر دیا' مومو کو بھی میری بے وقت چائے کی فرمائش سے چڑ ہے''۔

''نہیں' ایسا بالکل نہیں ہے''۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

''میں اور مومو سوچ رہے تھے کہ ہمیں بھی کچھ کمپیوٹر کورسز کر لینے چاہئیں' سارا وقت فارغ ہوتے ہیں''۔ کچھ جھجکتے

ہوئے اس نے کہا تھا۔

"یہ تو اچھی بات ہے' موموبھی آپ کی وجہ سے کچھ سیکھ لے گی' ایکسپرٹ تو گھر میں ہی موجود ہیں شیث سمیت"۔ عاطف کے سرسری لہجے پر بھی وہ چونکی اور کچھ گڑبڑائی تھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر شان یا شاہی وغیرہ سے ہم سنجیدگی کے ساتھ کچھ نہیں سیکھ پائیں گی' اگر آپ......" وہ کچھ جھجک کررکی تھی۔

"ہاں بالکل...... میں تیار ہوں' دس بجے کے بعد کا وقت ہی رکھ لیتے ہیں اور میں پڑھائی کے معاملے میں کوئی غیر سنجیدگی برداشت نہیں کروں گا"۔ وہ مصنوعی سختی کے ساتھ تاکید کررہا تھا۔

"شکریہ...... اور آپ کو شکایت کا موقع ہم نہیں دیں گے"۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی مگر اگلے ہی پل وہ شیث کی سمت متوجہ ہوئی تھی جو گراؤنڈ سے باہر آرہا تھا۔

"کیا ہوا شیث! گیم ادھورا چھوڑ کر کہاں جارہے ہو؟" عاطف کے سوال پر اس نے ایک سرد نگاہ سارہ پر ڈالی تھی۔

"کبھی کبھی ادھورا چھوڑنا پڑتا ہے"۔ اس کے عجیب سے لہجے پر سارہ خاموشی سے وہاں سے جانے کے لیے اٹھ گئی تھی۔

"آؤ یہاں' بیٹھو کچھ دیر"۔ عاطف نے بغور اس کے تاثرات کا جائزہ لیا تھا۔

"مجھے ایک ای میل بھیجنی ہے تو......"

"یہ کام تم بعد میں بھی کرسکتے ہو' ابھی میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں"۔ عاطف نے کچھ ناراضی سے اس کی بات کاٹی تھی جبکہ وہ نا چاہتے ہوئے بھی اس کے سامنے آبیٹھا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ تمہارے ساتھ رہنے اور بات کرنے کا یہی ایک وقت ہوتا ہے میرے پاس اور اس میں بھی اب تمہیں ہزاروں کام یاد آنے لگے ہیں"۔ عاطف شکایت کررہا تھا۔

"یہ وقت بھی مت نکالا کرو میرے لیے' کیوں اتنی زحمت کرتے ہو"۔ اس کے سرد لہجے پر عاطف نے دنگ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"شیث! یہ تم کس طرح بات کررہے ہو؟ اگر تم کسی بات پر مجھ سے ناراض ہو تو بتاؤ میں نے کیا غلط کیا ہے؟"

"کچھ غلط نہیں کیا ہے تم نے"۔ وہ اتنا ہی بولا تھا۔

"تو پھر ایسا کیا ہوا ہے جو تم مجھ سے دور بھاگ رہے ہو؟ وقت کی بات میں نے اس لیے کی تھی کہ تم صبح سے شام تک آفس میں اور میں رات تک اکیڈمی میں مصروف ہوتا ہوں' اس کے باوجود ہم دن میں تین چار بار تو ضرور فون پر رابطے میں رہتے ہیں مگر اب نہ تم مجھے کال کررہے ہو نہ میری کالز ریسیو کرتے ہو' گھر میں تم سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو تمہارے کام ختم نہیں ہوتے' آخر کیوں تم اتنی سرد مہری کا مظاہرہ کررہے ہو؟" عاطف نے پریشان نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"سب کچھ کہہ چکے ہو یا مزید کہنا باقی ہے؟" وہ سپاٹ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"مجھے اب صرف تم سے یہ سننا ہے کہ تمہیں ہوا کیا ہے؟ تم کیوں میرے ساتھ یہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہو؟"

"مجھے کچھ نہیں کہنا ہے' میں جانا چاہتا ہوں"۔ وہ یکدم ہی اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔

"شیث! پہلے تم میری بات سنو......" عاطف نے اسے روکنا چاہا تھا جو کسی بھی جانب دیکھے بغیر آگے جاچکا تھا۔

"کیا تم مجھے یہ احساس دلانا چاہتے ہو کہ میں تمہیں روکنے کیلئے تمہارے پیچھے دوڑ نہیں سکتا؟" عاطف کی تاسف

بھری بلند آواز پر اردگرد موجود سب ہی ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ شیث کے دل کو دھکا سا لگا تھا جو اس کے قدم یکلخت رکے تھے۔ شاہ رخ سمیت برآمدے میں موجود شمس نے صاف طور پر اس کے چہرے پر لہراتے اضطراب کو دیکھا تھا مگر اگلے ہی پل وہ دل کو سخت کرتا کسی سے بھی نظر ملائے بغیر تیز قدموں کے ساتھ شمس کے برابر سے گزرتا گھر کے اندر جاچکا تھا۔

حیران کھڑے شمس اب عاطف کی طرف متوجہ ہوئے تھے جو خود بھی اپنے پورشن کی سمت جارہا تھا' انہیں مناسب نہیں لگا تھا کہ سب کے سامنے عاطف سے کچھ پوچھیں جبکہ شیث کا انہیں پتا تھا کہ وہ کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دے گا۔ شمس کے علاوہ بھی کسی کی ہمت نہیں تھی کہ ان دونوں کے معاملے میں اس وقت دخل اندازی کرتا۔



ان دونوں کا تو کبھی آپس میں اختلاف تک نہیں ہوا ہے' پھر اچانک یہ کیا ہوا ہے' آپ کو شیث سے پوچھنا چاہیے تھا"۔ سدرہ حیران پریشان ہوکر بولی تھیں۔

"اس کے تیور تمہیں دکھائی نہیں دے رہے کیا؟ وہ میری طرف دیکھنا گوارا نہیں کررہا اور تم اس سے کچھ پوچھنے کی بات کررہی ہو' مجھے منہ کی کھانے کیلئے اس کے پاس بھیجنا چاہتی ہو کیا؟" شمس انتہائی ناگواری سے بولے تھے۔

"شاہی! تم بھی تو باہر تھے' تمہیں کچھ نہیں معلوم ان دونوں کے درمیان کیا بات ہوئی تھی؟" سدرہ پوچھ رہی تھیں۔

"میں باہر تھا مگر ان دونوں کے قریب موجود نہیں تھا' لیکن میں آج کل محسوس کررہا ہوں کہ وہ عاطف بھائی سے کچھ کھنچے کھنچے ضرور ہیں"۔ شاہ رخ نے بتایا تھا۔

"میں بھی وہاں سے اٹھ کر آگئی تھی تاکہ وہ دونوں کھل کر اپنی باتیں کرسکیں"۔ سارہ نے کسی سوال سے پہلے ہی بتا دیا تھا۔

"میں خود جاکر شیث سے بات کرتی ہوں' وہ اگر عاطف سے الجھا ہے تو اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کتنا ڈسٹرب ہے' خود سے تو وہ کبھی کچھ نہیں بتائے گا"۔ سدرہ سب کو ہی مخاطب کرتیں لاؤنج سے نکل گئی تھیں۔

کمپیوٹر اسکرین سے نظر ہٹا کر اس نے سدرہ کو دیکھا تھا جو کمرے میں داخل ہورہی تھیں۔

"مجھے تم سے بالکل امید نہیں تھی کہ تم عاطف جیسے انسان کو بھی ہرٹ کرسکتے ہو' ایک بار بھی تم نے سوچا تھا کہ وہ تم سے کس قدر اٹیچڈ ہے۔ اگر کوئی غلط فہمی درمیان میں ہے تو اسے دور بھی کیا جاسکتا ہے"۔

"نہ میں کسی کو ہرٹ کرنا چاہتا ہوں اور نہ ہی کسی غلط فہمی کا شکار ہوں' میں تو بس خاموشی کے ساتھ سب کچھ دیکھ رہا ہوں"۔ اسکرین پر نظر جمائے وہ تلخ لہجے میں بولا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو تم؟" سدرہ نے الجھ کر اسے دیکھا تھا جو سپاٹ چہرے کے ساتھ کمپیوٹر کی روشن اسکرین کو تک رہا تھا۔

"کچھ نہیں بولو گے نہ پوچھنے پر کچھ بتاؤ گے' اس طرح سب کچھ دل میں چھپا کر کڑھتے رہو گے تو کیا سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا؟" وہ شدید ناراضی سے پوچھ رہی تھیں۔

"تمہاری خاموشی پر کیا باقی سب پرسکون ہیں؟ کیا ہم سب محسوس نہیں کرسکتے کہ تم ڈسٹرب ہو؟ تم کم از کم مجھ سے تو ہر بات کہہ سکتے ہو' مجھ سے کس بات کی ناراضی ہے' اگر ہے تو بتاؤ مجھے"۔

"نہیں...... میں کسی سے ناراض نہیں ہوں"۔ ان کی جانب دیکھے بغیر...... تھا۔

''تمہارے یہ کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا' تمہارا چہرہ' تمہاری خاموشی سب کچھ سمجھا دینے کے لیے کافی ہے''۔ وہ کچھ ڈپٹنے والے انداز میں بولی تھیں۔

''جو کچھ ہوا تھا اس پر اگر کوئی شرمندہ نہیں ہے تو تم یہ رویہ اختیار رکھنے میں حق بجانب ہو' شمس تمہارے سامنے کچھ کہہ نہیں پاتے مگر میں جانتی ہوں کہ وہ کتنے نادم ہیں''۔

''کسی کے نادم یا شرمندہ ہونے سے سب کچھ پہلے جیسا نہیں ہوجائے گا''۔ وہ اسی تلخی سے بولا تھا۔

''پہلے ایسا کیا تھا جو اَب تمہیں بدلا ہوا دکھائی دے رہا ہے؟'' سدرہ نے پوچھا تھا۔

''سب کچھ بدل چکا ہے' یہاں تک کہ وہ انسان بھی جس کی وجہ سے آپ یہاں موجود مجھ سے سوال کررہی ہیں''۔ کرسی سے اٹھتے ہوئے وہ اب ان کے بالمقابل تھا۔

''وہ ہرٹ ہوا ہے' میری وجہ سے اسے تکلیف پہنچی' یہ سب کو نظر آ گیا مگر میں کیا کچھ برداشت کرتا رہا ہوں یہ کسی کو نظر نہیں آیا ہے' سب خوش ہیں مگن ہیں بس ایک میں ہی......'' سرخ چہرے کے ساتھ وہ یکدم ہی خاموش ہوا تھا۔

''سب کو سب کچھ نظر آ رہا ہے' یہاں کون تمہیں بے حس نظر آتا ہے؟ سب کو پرواہ ہے تمہاری' تم شمس کو ایک موقع تو دو کچھ کہنے کا۔ تمہاری یہ خاموشی ان کیلئے کتنی اذیت کا باعث ہے اس کا اندازہ تم بھی لگا سکتے ہو' تمہیں سارہ پر غصہ ہے تو اس غصے کو ایسے انسان پر مت اتارو جس کا کسی معاملے سے کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو اور جہاں تک بات سارہ کی......''

''مجھ سے اس کی کوئی بات نہ کریں براہ کرم...... کیونکہ میں سننا ہی نہیں چاہتا''۔ یکدم ہی وہ ان کی بات کاٹتا ان کے سامنے سے ہٹ گیا تھا اور اگلے ہی پل کمرے سے باہر فق چہرے کے ساتھ سارہ نے اسے دیکھا تھا جو جارحانہ انداز میں سیڑھیاں اترتا باہر کی سمت جا رہا تھا۔

''اس وقت اُس کے پیچھے مت جاؤ''۔ شاہ رخ اس کے پیچھے جانا چاہ رہا تھا جب شمس نے اسے روکا تھا۔



منتشر دل و دماغ کے ساتھ وہ بس سڑک کے کنارے چلتا جا رہا تھا' اس طرح چلتے رہنا شاید اس کے لیے کتھارسس کا ایک ذریعہ تھا' تیز ہارن پر وہ چونک کر قریب رکتی گاڑی کی طرف متوجہ ہوا تھا حالانکہ اس وقت وہ کسی بھی مانوس چہرے کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا مگر اخلاقی اقدار نے اس عمل کی اجازت نہیں دی تھی۔

''بہت اچھا ٹریک چنا ہے واک کے لیے''۔ گاڑی سے اترتے شخص نے نہایت خوش اخلاقی سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔

''تم کہاں ہو آج کل......؟ کافی دن بعد ملاقات ہوئی ہے ہماری''۔ شیث نے کہا تھا۔

''ہم تو ہمیشہ سے ہی تمہارے اردگرد رہے ہیں' تم ہی بے خبر رہے''۔

''تمہاری شکایت بجا ہے رضی! مگر اب انشاءاللہ رابطے میں رہیں گے''۔ شیث نے کہا تھا۔

''مجھے تمہاری اس بات پر بالکل یقین تب ہوگا جب تم میرے گھر چلو گے ابھی''۔

''اس وقت نہیں رضی! تم مجھے ایڈریس بتادو میں ایک دو دن بعد ضرور آؤں گا''۔

''اب تم مجھے ناراض کررہے ہو' یہاں سے بس چند منٹ کی ڈرائیو پر میرا اپارٹمنٹ ہے' تم آدھا گھنٹہ بھی مجھے نہیں دے سکتے''۔ رضی کی ناراضگی پر وہ تذبذب کے باوجود انکار نہیں کرسکا تھا۔ رضی کی فیملی کسی زمانے میں اس کے پڑوس میں ہی تھی' اسکول میں رضی اس کا سینئر بھی تھا اور بس جان پہچان کے علاوہ کچھ کنکشن نہیں تھا' چند سال پہلے رضی کی فیملی بیرون ملک سیٹل ہوگئی تھی' اپنے کزنز سے ہی اسے معلوم ہوا تھا کہ رضی اسی شہر میں ہے' وقتاً فوقتاً اسے رضی کی

مشکوک سرگرمیوں کی اطلاعات بھی ملتی رہی تھیں اور یہ بھی کہ وہ لاک اپ میں بھی چند بار سزا بھگت چکا ہے' رضی کے بارے میں یہ سب جان کر وہ حیران ضرور ہوا تھا کہ رضی کافی ویل آف ایجوکیٹڈ فیملی سے بی لونگ کرتا تھا' چند ماہ پہلے سرِراہ شیث سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور اس کے بعد بھی اتفاقیہ طور پر جیسے کہ آج۔

''مجھے امید ہے تمہیں میرا اپارٹمنٹ پسند آئے گا''۔ شیث کے ہمراہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہوئے وہ خوشدلی سے بولا تھا۔

''تم یہاں تنہا رہتے ہو؟'' اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے شیث نے پوچھا تھا۔

''ظاہر ہے' ویسے دوست یار اکثر محفل جمائے رکھتے ہیں' تم یہ بتاؤ کیا پینا پسند کرو گے؟''

''کوئی تکلف نہ کرو' ویسے بھی میں زیادہ دیر نہیں رک سکوں گا' میں بس تمہارا اپارٹمنٹ دیکھنا چاہتا ہوں' فیوچر میں میرا ارادہ ہے کہ ایک ایسا ہی اپارٹمنٹ حاصل کروں''۔

''بالکل' بلااجازت آزادی سے تم ہر جگہ دیکھ سکتے ہو''۔ رضی بولتا ہوا لیونگ روم سے نکل گیا تھا' جبکہ شیث کچھ چونکتے ہوئے اس کمپیوٹر ٹرالی کی سمت گیا تھا جہاں موجود مخصوص قسم کی سی ڈیز اور میگزینز کے انبار نے رضی کی اس شہرت کی تصدیق کردی تھی جو وہ سنتا رہا تھا' ٹرالی سے دور ہٹتے ہوئے وہ واپس آتے رضی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''تم اب تک یہیں رکے ہو' اتنے فارمل نہ ہو' خود سارا اپارٹمنٹ دیکھو''۔ رضی بول رہا تھا جبکہ شیث دنگ نظروں سے اس چیز کو دیکھ رہا تھا جسے رضی نے ٹیبل پر سجا دیا تھا۔

''رضی! یہ چیز یہاں سے لے جاؤ''۔ ناگواری سے ضبط کیے وہ بولا تھا۔

''جسٹ فار انجوائے منٹ یار! بہت لائٹ ہے''۔

''تمہیں یہ کام کرنا ہے تو میرے جانے کے بعد کرلینا مگر میں اس چیز کی جانب دیکھنا بھی گناہ سمجھتا ہوں جس سے مجھے میرے رب نے میرے پیغمبر نے روکا ہے''۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ بولا تھا۔

''جانے بھی دو' کس دنیا میں رہتے ہو تم؟'' رضی نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا تھا۔

''اس دنیا میں جہاں انسان اور حیوان میں واضح فرق موجود ہوتا ہے''۔

''یعنی تم مجھے یہ بتانا چاہتے ہو کہ میں ایک جانور ہوں''۔ رضی کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''جس غلاظت کو تم تواضع کے لیے اٹھا لائے ہو اسے حلق میں انڈیل کر واقعی انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا''۔ شیث کے سخت لہجے پر رضی کے تاثرات بدلے تھے۔

''رضی! تمہارا تعلق ایک باعزت گھرانے سے ہے' تمہارے یہ شوق تمہیں صرف تاریکی کی سمت لے جاسکتے ہیں' ابھی وقت ہے سنبھل جاؤ' یہ میرا پُرخلوص مشورہ ہے''۔

''میں کیا ہوں' میں اچھی طرح جانتا ہوں' مجھے تمہارے وعظ کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کیا ہو اور تمہاری حقیقت کیا ہے''۔ رضی کے تلخ لہجے پر شیث کے چہرے کے تاثرات تن گئے تھے۔

''بہت شکریہ مجھے اپنے ساتھ یہاں لانے کا' تمہیں پہچاننے کا یہ اچھا موقع ملا مجھے''۔ سرد لہجے میں بول کر شیث نے جانے کیلئے قدم بڑھائے تھے۔

''تم مجھے اس طرح بے عزت نہیں کرسکتے''۔ رضی بھڑک کر اس کے راستے میں آیا تھا۔

''پارسا مت بنو' میں نے تمہاری طرح عیاشی کو جبر کے پردے میں نہیں چھپایا......'' رضی کی آواز بند ہوئی تھی جب شیث کا ہاتھ اس کے جبڑے سے ٹکراتا اسے چت کرگیا تھا۔

"امید ہے کہ آئندہ کسی انسان پر کیچڑ پھینکنے سے پہلے تم آئینے میں اپنا سیاہ چہرہ ضرور دیکھو گے"۔ بھنچے لہجے میں اس نے شعلہ بار نظروں سے رضی کو دیکھا تھا اور اگلے ہی پل تیز قدموں کے ساتھ باہر کا رخ کیا تھا۔

"تمہیں مجھ سے معافی مانگنے کے لیے دوبارہ یہاں آنا ہوگا' میں تمہیں مجبور کردوں گا' تم دیکھو گے میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں"۔ پیچھے رضی اسے سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتا رہ گیا تھا۔



گرم شال میں قید وہ برآمدے میں آئی تھی' رات کی تاریکی میں اسے دیکھ بھی سکتی تھی جو یخ بستہ ہواؤں سے بے پرواہ کرسی پر موجود تھا۔ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی وہ اس کی طرف گئی تھی۔

"اندر چلو شیث! یہاں بہت سردی ہے"۔ وہ بمشکل بول سکی تھی۔

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" اس کا لہجہ سرد ہی تھا۔

"بہت فرق پڑتا ہے' کم از کم مجھے تو......"

"کچھ باور کروانے کی ضرورت نہیں' حقیقت کیا ہے اس کا اندازہ ہے مجھے"۔ وہ سارہ کی بات کاٹ گیا تھا۔

"تم کب تک میرے ساتھ یہ اجنبی رویہ رکھو گے؟ تم میری کوئی بات سننا نہیں چاہتے' اپنے دل کی بات کرتے نہیں ہو' بتاؤ میں کیا کروں؟" وہ نم لہجے میں بولی تھی۔

"کچھ کہنے سننے کی کسر نہیں رہ گئی' لہٰذا کوئی گلٹ نہ رکھو"۔ اس کی جانب دیکھے بغیر وہ بولا تھا۔

"پہلی بار میرا اس گھر میں رہنا مشکل ہو رہا ہے"۔ وہ لرزتی آواز میں بولی تھی۔

"اور میرا اس دنیا میں"۔ وہ تلخ لہجے میں بولا تھا۔

"تم اندر جاؤ' میرے پاس تو کچھ قابل فخر نہیں مگر تم پر کوئی دوبارہ کیچڑ اچھالے یہ برداشت نہیں ہوگا"۔ اس کی بھنچی آواز پر وہ دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھتی واپس پلٹ آئی تھی۔

گہری سانس لے کر وہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا جو برآمدے کے اسٹیپس پر بیٹھی تھی' سرد ہواؤں میں ہوتا اضافہ اس کے نازک وجود کیلئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔

ایک پل کو رک کر اس نے سارہ کے اٹھنے کا انتظار کیا تھا پھر خاموشی کے ساتھ گرلز بند کرنی شروع کر دی تھیں۔ اندر کی طرف جاتے ہوئے وہ رک کر اس کی طرف پلٹا تھا جو گرلز کے پاس ساکت تھی۔

"کیا تم یقین کرو گے......؟ تمہارے لیے مجھے اب کسی کی پرواہ نہیں ہے' شیث! تم جیسا چاہتے ہو میں اب وہی کروں گی"۔ دو قدم اس کی جانب بڑھتے ہوئے وہ بھیگی آواز میں بولی تھی۔

"یہ بے معنی اعتراف بس کوفت میں مبتلا کر سکتے ہیں' البتہ یہ آنسو ان سب کو تکلیف ضرور دیں گے جو تمہیں کچھ زیادہ ہی عزیز رکھتے ہیں' جیسے کہ تمہارے عاشر بھائی"۔ اس کے طنزیہ لہجے پر وہ سن کھڑی اسے دیکھتی رہی تھی جو گلاس ڈور کے پیچھے غائب ہو چکا تھا۔

"محبت میں بس یہی ایک خامی ہے یہ اپنی گہرائیوں میں لے جائے تو سانس لینا ناممکن' سطح پر چھوڑ دے تو اسے عبور کرنا محال ہوتا ہے"۔ بوجھل ہوتے دل کے ساتھ اس نے سوچا تھا۔



اپنے پورشن سے باہر آتے ہوئے اس نے ایک طائرانہ نظر دوڑائی تھی۔ چھٹی کا دن تھا اور موسم صبح سے ہی سرد مگر خوشگوار تھا' اس لیے گھر کے تقریباً سارے مرد حضرات باہر موجود تھے' کچھ باتوں میں مشغول تھے جبکہ زیادہ تر اپنی

سواریوں کی دھلائی چمکائی میں مگن تھے۔ دھیرے دھیرے اپنی اسٹک کے سہارے وہ آہنی گیٹ کی سمت بڑھ رہا تھا جب کچھ چونک کر گیٹ کی نچلی جالیوں کے پاس اس نے رکتے دو پیروں کو دیکھا تھا تب ہی درمیانی گیٹ تھوڑا سا کھلا تھا مگر اگلے ہی پل وہ جو بھی تھی اندر پھیلی رونق پر شاید جھجک کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ عاطف دور سے ہی اس کے تذبذب کو محسوس کر گیا تھا اس لیے اپنی رفتار بڑھا کر جلدی گیٹ تک پہنچنا چاہتا تھا مگر یہ بھول گیا تھا کہ بہت ساری عقابی نظریں اس سے پہلے سنہری پٹیوں میں جکڑے پیروں تک پہنچ چکی ہیں۔ سب سے پہلے شان لپکتا ہوا آگے بڑھا تھا مگر عاطف کی آواز نے اس کے قدم روکے تھے۔

"واپس جاؤ"۔ اس نے خشمگیں نظروں سے شان کو گھورا تھا۔

"فوراً مومو یا کسی اور لڑکی کو بھیجو"۔

"موموکو بھیجنا مناسب نہیں ہوگا میں کسی لڑکی کو بھیجتا ہوں"۔ بری طرح کھسیا کر وہ عاطف کو مسکرانے پر مجبور کرتا وہاں سے گیا تھا۔

سامنے موجود اس شخص کی سنجیدہ سوالیہ نظروں پر وہ بس ہونقوں کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟" بالآخر عاطف کو ہی پہل کرنی پڑی تھی۔

"جی! وہ سارہ......"

"آپ کو سارہ سے ملنا ہے' وہ ہیں آپ اندر آ جائیں"۔ گھبرائی لڑکی کی مشکل آسان کرتا وہ اسے اندر آنے کا راستہ دے گیا تھا اور پلٹ کر شان کی تلاش میں سامنے دیکھا تھا جہاں وہ اپنے کزن کے ساتھ کھڑا اسی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے یقیناً عاطف کی ہدایت پر جان بوجھ کر عمل نہیں کیا تھا۔

"آپ ایسا کریں' سامنے والے گھر کی طرف چلی جائیں' سارہ وہیں ملیں گی"۔ عاطف کی ہدایت پر اس نے مزید گھبرا کر دور نظر آتی سفید عمارت کو دیکھا تھا۔

"میں وہاں تک اکیلی کیسے جاؤں گی' آپ مجھے وہاں تک لے چلیں"۔ سہمی آواز پر عاطف نے حیرت سے اسے دیکھا تھا جس کا چہرہ سیاہ چادر کے گھونگھٹ میں چھپا جا رہا تھا۔

"آیئے"۔ نا چاہتے ہوئے بھی وہ اسے ساتھ لیے آگے بڑھا تھا حالانکہ یہ بہت مشکل تھا جب کئی شرارتی نظریں وہ خود پر محسوس کر رہا تھا۔ قریب کوئی ایسا با اعتبار بندہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا جس پر وہ اس خوفزدہ خاتون کی ذمہ داری ڈالتا۔

"سنیں...... آپ مجھے سارہ کے پاس ہی لے جا رہے ہیں؟" سہمی آواز پر وہ یکدم ہی رک کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"آپ کو کیا لگ رہا ہے محترمہ! میں کہاں لے جا رہا ہوں؟" عاطف کے ناگوار لہجے پر اس کے چہرے کا رنگ مکمل اڑ گیا تھا۔

"آپ کے حکم پر میں آپ کی مدد کر رہا ہوں' اور آپ یہ سوال کر کے میری انسلٹ کر رہی ہیں"۔ اس کے سخت لہجے پر وہ یقیناً آنسو بہانا شروع کر دیتی اگر وہاں سارہ نہ پہنچ جاتی۔

"شکر آپ یہاں ہیں' میری دوست پہلی بار یہاں آئی ہے مگر وقت سے پہلے ہی آ گئی ورنہ میں اسے گیٹ پر ہی ریسیو کرتی"۔ سارہ مسکراتے ہوئے عاطف سے مخاطب تھی۔

(جاری ہے)

انعم خان

قسط نمبر 9 ۔

مکمل ناول

اس دل میں بس ہو تم

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مشارب اس سے ایسا سوال کر سکتا ہے۔ ایسا دونوں کے بیچ پہلی مرتبہ ہوا تھا جب مشارب نے اس سے اس قسم کا سوال کرتے ہوئے شادی کا ذکر کیا تھا۔ مبشرہ کے ہنسنے پر خفیف نظروں سے



اسے دیکھا۔

"ہنس کیوں رہی ہو؟"

"تم کتنی دور کی سوچتے ہو"۔ اس نے بمشکل ہنسی روکی' غیر سنجیدگی سے بولی۔

"سوچنا پڑتا ہے"۔ البتہ وہ سنجیدہ تھا۔

"کیوں؟" دلچسپی سے دیکھ کر پوچھا۔

"دیکھو نہ اب تم نے جاب شروع کر دی ہے' کل کو اسکول اسٹارٹ ہوگا ایسے میں تمہاری ذمے داریاں بڑھیں گی اور اگر اس دوران تمہاری شادی ہوگئی تو کیسے ہینڈل کرو گی سب؟" اس نے نہایت چالاکی و ہوشیاری سے سنبھل کر بات بدلی۔

"ہاں یہ بات تو سوچنے کی ہے"۔

"پھر کیا سوچا؟" آہستگی و رازدارانہ انداز میں پوچھنے لگا۔

"اس کی فکر نہیں"۔ جبھی وہ لاپرواہی سے بولی۔



"کیوں' کیا شادی نہیں کرنی؟" وہ ہنسا۔

"خود سے تو فی الحال کوئی ارادہ نہیں ہے' بلکہ تین چار سال تک تو بالکل بھی نہیں' بس میں اپنا سارا دھیان اسکول کی طرف رکھنا چاہتی ہوں۔" وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔

"مگر اس دوران کوئی قابل رشتہ آ گیا تو پھر کیا کہو گی پھپھو اور پھوپھا جان کو؟" وہ تو جیسے ہر حال میں جاننا چاہتا تھا یا شاید جان کر خود کچھ پلان کرنا چاہتا تھا۔

"اُن کو کچھ کہنے سے پہلے میں تمہیں تھینکس کہوں گی۔" مستبشرہ نے سوال کا جواب الٹ دیا۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ تم نے میرے ذہن میں یہ پوائنٹ ڈالا ورنہ کوئی بھی رشتہ آنے کے بعد میرے لیے اُس وقت فیصلہ کرنا ممکن نہ ہوتا' مگر اب مجھے اپنی خواہش کی تکمیل کی خاطر ابھی سے اماں اور بابا جان کو اس بات کے لیے قائل کرنا ہوگا کہ کم از کم تین چار سال تک میری شادی کا خیال ذہن میں نہ لائیں اور کسی بھی اچھے یا بُرے رشتے پر فی الحال غور نہ کریں' اینڈ آئی ہوپ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کی بات نہیں ٹالیں گے۔" وہ فوراً سے سب ترتیب دیتے ہوئے تفصیل سے بولی' لہجہ پُر وثوق تھا۔ مشارب نے سنجیدگی سے اسے سنا' اس کے ارادے و فیصلے کو جاننے کی بغور کوشش کی جبھی اپنا ذہن بھی فوراً تیار کر لیا۔

"یقیناً"۔ اور آہستگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"باادب...... ہوشیار...... مس فلک شاہ تشریف لا رہی ہیں' استقبال کیا جائے۔" جبھی دونوں ہاتھوں سے ٹرے تھامے فلک نے چھت پر قدم رنجہ فرمائے اور شاہی دربان کے سے انداز میں اپنی آمد سے انہیں مطلع فرمایا' وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"آئیے مادام......! چائے بنانے میں بہت دیر لگا دی آپ نے۔" مستبشرہ اس کے انداز پر ہنسی' فلک نے ٹرے اس کے سامنے کی' اس نے کپ اٹھایا۔

"تھینکس"۔ اور بولی۔

"اجی صرف چائے نہیں بنائی' چائے سے پہلے کچن بھی سمیٹا ہے۔" مصروف سے انداز میں کہتی وہ مشارب کی طرف بڑھی' اسے چائے دی پھر ٹرے سائیڈ پر رکھتی اپنا کپ اٹھا کر دونوں کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"فلک! تم تو واقعی بہت اچھی چائے بناتی ہو۔" مستبشرہ نے چائے کا سپ لیتے ہوئے ستائشی انداز میں اسے داد دی تو وہ کھل اٹھی۔

"تھینک یو"۔

کچھ دیر تک تینوں چائے انجوائے کرتے ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے' چائے کے بعد نیچے گئے' رات کافی ہو گئی تھی۔ سید جمال شاہ نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا' زہرہ پھپھو بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ فلک نے مستبشرہ کو روکنا چاہا مگر وہ صبح اسکول جانے کی وجہ سے معذرت کر گئی البتہ جانے سے قبل دوبارہ آنے کا کہا۔

ان کے جانے کے بعد فلک اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مشارب باہر بیٹھا تھا جب فہمیدہ بیگم کچن سمیٹنے گئیں تو خاصی حیران ہوئیں۔ خیال آیا شاید مستبشرہ نے سب کیا ہو کہ فلک کہاں یہ سب کرنے والی ہے مگر آصفہ بیگم نے انہیں یقین دلایا کہ یہ فلک کا کارنامہ ہے۔ انہوں نے فلک کو دیکھا تھا سب سمیٹتے ہوئے اور خود ہی نہیں روکا جسے سن کر فہمیدہ شاہ کے لبوں پر بے یقینی کو ختم کرنے کے لیے انبساط کی مسکراہٹ پھیلی تھی۔



کوئی نہ جانے بن تڑپے
محبت محض درد کا نام ہے

علی آیان حسن گیلانی ادھر اُدھر دیوانوں کی طرح پھرنے کے بعد سن ہوتے ذہن کو لیے واپس اپنے کمرے میں موجود تھا۔ آنکھیں بے سکونی و بے قراری سے پھٹنے کو تھیں۔ مستبشرہ سے آخری ملاقات کے بعد سے وہ بکھر چکا تھا' الجھ چکا تھا' تھک چکا تھا۔ اللہ سے گلے شکوے' مستبشرہ کے تصور سے شکایت' چند ہی دنوں میں وہ اکتانے لگا۔ اپنی حالت' دل کی کیفیت' ذہنی بیقراری و اذیت' دھوکے و فریب کے بعد اندر اٹھتی کرب کی لہریں' ہر پل بے چینی' سلگتی آگ' ہجر و نارسائی کا احساس' اپنے ارمانوں کا بے وقعت بے مول ہونا' تڑپنا...... وہ درد کی حدود میں قید سا ہو کر رہ گیا تھا۔ آنکھوں کی چمک کھو سی گئی تو آنکھیں بھی گویا چندھیانے لگیں۔ ہر وقت کے مسکراتے چہرے پر اداسی کی جھلک اپنی جڑیں مضبوط کرنے کی تگ و دو میں لگ گئی تھی۔ گزری ہر بات' مستبشرہ کی سنگت پر جھوٹ و فریب کا رنگ محسوس کرتا تو سانس لینا دشوار ہو جاتا' دھڑکن بوجھل ہی لگنے لگتی۔

"کب تک؟"

کب تک وہ یہ سب سہتا' ایک عام انسان تھا آخر' باوجود کوشش کے ضبط ہار گیا تو اپنی مردانگی کی پرواہ کیے بنا رونے لگا بڑی شدت سے' آنکھ سے نکلتا ہر قطرہ تاسف و یاسیت کی گرمائش خود میں سموئے محبت کو دل کی عدالت میں کھینچ لائے تو وہ تمام گلے شکوے سائیڈ پر رکھے محبت کی سرزنش کرنے لگا' محبت کو قصوروار ٹھہرانے لگا۔

"کیوں ہوتی ہے یہ محبت؟ کیا حق بنتا ہے محبت کا کہ وہ دل کو اپنے پُرسحر احساس' محسوس کروانے کے بعد بے دردی سے تڑپائے...... کیوں محبت اپنی شدت سے دل کو جذبات سمیت اپنی مٹھی میں دبوچ کر جذبات کو پاؤں تلے کچل دیتی ہے...... کیوں محبت خواب ریزہ ریزہ کرتی ہے......؟؟؟" علی کا سر چکرانے لگا۔ سوچیں خیالات' دکھ درد اسے پاگل کیے جا رہے تھے۔ بظاہر سانس لینا زندہ ہونے کی علامت ہے مگر دل ٹوٹ جائے تو زندہ لاشہ بننے میں دیر نہیں لگتی۔ دل کی دھڑکن مصنوعی لگتی ہے' کوئی کسی کے لیے بظاہر نہ سہی پر اندر سے ضرور مر جاتا ہے اور علی آیان حسن گیلانی اس وقت اندر سے مر گیا تھا۔ مستبشرہ جمال کے ناٹک نے اسے اندر سے مردہ کر دیا تھا۔ اس نے بڑی حسرت بھری نگاہوں سے دونوں ہاتھوں کو سامنے پھیلا کر گویا لکیروں پر غور کرنا چاہا کہ شاید کوئی امید نظر آئے' زندگی کی نوید نظر آئے مگر بے سود...... مستبشرہ کے کٹھور' سفاک' بے حس' قطعیت بھرے لہجے نے جانے سے قبل تمام روشن دیے فریب کی گرد سے مٹا دیے تھے' بجھا دیے تھے' تب سے ہر ہر لمحہ وہ بے بس تھا۔

"آیان!" وہ کمرے کے وسط میں کھڑا تھا جب عقب سے آواز سنائی دی۔ آہستگی سے پلٹ کر دیکھا تو حسن گیلانی کو سامنے پایا۔

"ڈیڈ آپ......" وہ فوراً سنبھلا' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟" اور اس کے برابر آ کر استفسار کیا۔

"کچھ خاص نہیں بس یہ کچھ چیزیں بکھری پڑی ہیں انہیں ہی سمیٹنے کی سوچ رہا تھا' کمرہ تھوڑا گندہ لگ رہا تھا' سوچا فارغ بیٹھنے سے بہتر ہے انہیں ہٹا لوں ورنہ یہ سب مما کو کرنا پڑتا۔" علی نے فوراً سے بہانہ بنایا بلکہ جھوٹ

بولا۔ آج کل ویسے بھی وہ ماں باپ دونوں سے اپنی کیفیت چھپانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لینے لگا تھا۔ دونوں سے بہت پیار کرتا تھا۔ انہیں خود سے ریلیٹڈ دکھ دینے کا کسی طور تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ بیڈ اور صوفے پر پڑے اپنے کپڑوں' ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے رکھے ناول' کمپیوٹر ٹیبل کے پاس رکھے جوتوں اور یہاں وہاں پڑی جرابوں کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ ساتھ ہی صوفہ خالی کرکے حسن گیلانی کے بیٹھنے کی جگہ بنا کر پھر سے بولا۔

''مما نہیں آئیں آپ کے ساتھ؟''

''وہ بس آرہی ہیں مگر چائے کے ساتھ' ہمارا دل چاہ رہا تھا تم سے بات کرنے کو' سوچا ساتھ میں چائے بھی ہوجائے''۔ وہ بتانے لگے۔

''واؤ گریٹ...... مجھے اس وقت ویسے بھی چائے کی طلب ہورہی تھی''۔ علی نے خود پر چھائی کچھ دیر پہلے والی کیفیت و ذہنی کشمکش سے نکلتے ہوئے خوشگواریت سے مسکراتے ہوئے کہا کہ مبادا وہ قیاس لگانے ہی نہ بیٹھ جائیں۔

''چلو اچھا ہوا تمہاری طلب بھی پوری ہوجائے گی اور ہم چند ضروری باتیں بھی کرلیں گے''۔ وہ کہنے لگے۔

''ضروری باتیں؟'' سوالیہ انہیں دیکھا۔

ہاں بھئی تم بہت فارغ رہ لیے اب تمہیں خود سے قید کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ ویسے ہمارا خیال تھا کہ تم یونیورسٹی آف ہونے کے فوراً بعد خود سے ہمیں کہو گے لیکن کام تو کام تمہیں تو ہمارے پاس بیٹھنے کی فرصت نہیں...... کیا کرتے رہتے ہو آج کل؟'' وہ اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں محبت بھرا گلہ کرتے پوچھنے لگے۔

''کچھ خاص نہیں بلکہ کچھ بھی نہیں۔ عمر کی طرف چلا جاتا ہوں یا پھر بس یونہی ادھر ادھر اینڈ سچ بتاؤں تو ابھی کام کرنے کو دل نہیں کررہا''۔ وہ آہستگی سے بولا۔

''کیوں...... مطلب یونیورسٹی پیریڈ کے دوران تو تمہیں بہت ایکسائٹمنٹ تھی بزنس جوائن کرنے کی پھر اب دل کیوں نہیں کررہا''۔ کھوجتے انداز میں اسے یاد دلاتے وہ نرمی سے استفسار کرنے لگے۔

''بس ڈیڈ! پہلے اسٹڈیز سے سمجھیں تنگ آیا ہوا تھا اسی لیے کہتا پھرتا تھا مگر اب اتنی جلدی بزنس جوائن کرنے سے روٹین ٹف ہوجائے گی' سوچا ہوں کہ پریکٹیکل لائف اسٹارٹ کرنے سے پہلے ریلیکس کروں' اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو......؟'' وہ ایسے برجستہ بولا کہ گویا پہلے سے سب پلان کرچکا ہو۔

حسن گیلانی کا اپنا بزنس تھا اور علی ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ حسن گیلانی کی خواہش اور علی کا خود کا ارادہ تھا کہ وہ اسٹڈیز کمپلیٹ ہونے کے فوراً بعد بزنس جوائن کرے گا مگر جو کچھ اس کے ساتھ ہوا' مبشرہ نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا' محبت میں شکست و نارسائی کی اذیت کو جتنا اس نے خود پر حاوی کرکے اثر لیا ابھی تک اس سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ ذہن و دل انتشار کا شکار تھے' کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا بلکہ درحقیقت وہ ابھی تک مبشرہ سے آخری ملاقات کے خول میں مقید اپنی محبت کی سچائی اور اس کی محبت کے فریب میں الجھا ہوا تھا۔

نہ باپ اور ماں کی خواہش یاد رہی تھی نہ اپنے ارادے سے متعلق تکمیل کا خیال دل میں آیا تھا۔ حسن گیلانی کو اصل بات بتانے کے بجائے بہانہ بناتا اُن سے پوچھنے لگا۔ اُسی وقت ساجدہ گیلانی بھی چائے و دیگر لوازمات کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔ علی نے انہیں بیٹھنے کی جگہ دی۔

''مجھے بھلا کیا اعتراض ہوگا' پھر بھی تم بتاؤ کب تک بزنس جوائن کرنے کا ارادہ ہے؟'' وہ دھیرے سے مسکرائے اور پوچھا' ساتھ ہی بیگم کے ہاتھ سے چائے کا مگ لیا۔

''ابھی تو نہیں ڈیڈ! بٹ ایک دو ماہ بعد انشاء اللہ آپ کے ساتھ جاؤں گا''۔ اسے پتا تو تھا کہ جلد یا بدیر یہ سب اس نے کرنا ہے سو دو ماہ کا عرصہ بتا گیا اس امید کے ساتھ کہ شاید اس دوران سنبھل بھی جائے۔

''چلو ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی''۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ علی نے چائے کا سپ لیتے ہوئے ماں باپ دونوں کے سامنے خود کو مکمل ظاہر کرکے اپنی ظاہری کیفیت میں بدلاؤ لایا۔

''تو پھر علی بیٹا! کیا خیال ہے مبشرہ کے گھر رشتہ بھی دو ماہ بعد ہی لے کر جائیں''۔ جبھی ساجدہ گیلانی نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے یاد آنے پر اس سے پوچھا۔

جبکہ علی آیان غیر متوقع طور پر مبشرہ جمال کا نام سن کر چونکا۔ سرعت سے ماں کی طرف دیکھا' اس کے ذہن سے تو یہ بات نکل ہی چکی تھی کہ اس نے ماں سے اس متعلق بات کرتے ہوئے اپنی اور اس کی محبت کے بارے میں انہیں بتایا تھا۔

''جی مما......؟'' سو غیر ارادی طور پر حیرت کا اظہار کرگیا' چہرے کا رنگ خود بخود فق ہوا تھا۔

''دیکھو بیٹا! میں نہیں چاہتی کہ جب ہم وہاں جائیں تو تمہیں مایوسی ہو۔ یہ تمہاری خوشی اور بہتر زندگی کا سوال ہے۔ تم اپنے پیروں پر کھڑے ہوگے تو سب تمہارا ساتھ دیں گے' اب یوں ابھی سے تو ہم رشتے کی بات نہیں ڈال سکتے''۔ وہ رسان سے بولیں پھر اضافہ کیا۔

''دو ماہ کا عرصہ زیادہ تو نہیں؟'' اس سے پوچھا۔

''نہیں مما! بلکہ اتنی بھی کیا جلدی...... آپ ٹھیک کہتی ہیں ابھی مجھے اپنے پیروں پر کھڑے ہونا ہے اور میں تو کہتا ہوں کہ چار پانچ سال تک تو میری شادی کا سوچیں بھی نہیں' ابھی میں شادی نہیں کرنا چاہتا''۔ علی نے بڑی مشکلوں سے بے تاب ہوتے دل کو سنبھال کر نہایت سنجیدگی سے کہا تھا۔

''لیکن بیٹا! ہم تو اسی سال کے اندر تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں''۔ وہ بولیں۔

''نہیں مما! یہ ممکن نہیں ہے''۔ وہ برجستہ نفی میں بولا۔ لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ ساجدہ گیلانی نے بغور اسے دیکھا۔

''کیوں ممکن نہیں ہے؟'' حسن گیلانی بولے۔

علی سے وہاں بیٹھنا مشکل ہوا۔ کئی پل خاموشی کی نذر ہوئے' خود پر سوالیہ نگاہوں کی تپش محسوس کرتے ہی وہ رخ دوسری جانب کرنے لگا۔ اپنے ساتھ ہوئے قسمت کے سنگین مذاق کو بیان نہیں کرسکتا تھا' نہ فوراً اُسے انہیں صاف اور واضح جواب دینے کی سکت رکھتا تھا کہ اب کچھ بھی اُس کے اختیار میں سہل نہیں تھا۔

''مبشرہ تو تمہاری پسند ہے' پھر......'' توقف کے بعد ساجدہ بیگم نے پھر سے اُسے مخاطب کرکے گویا کریدنا چاہا تھا مگر اُن کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی علی کا سیل فون اپنی مخصوص آواز میں بجنے لگا' علی نے اُسی لمحے شکر کا کلمہ پڑھا کہ جواب دہی سے بچ نکلا تھا۔

''ایکسکیوزمی''۔ فوراً اسے کہتا موبائل کان سے لگا کر فرار اختیار کرتا کمرے سے نکل گیا۔

''دیکھا حسن! آپ نے...... میں نہ کہتی تھی کہ یہ ہم سے کچھ چھپا رہا ہے' اس کے ساتھ ضرور کوئی مسئلہ ہے میرا قیاس غلط نہیں ہوسکتا''۔ بیٹے کے جاتے ہی وہ شوہر کی طرف متوجہ ہوتیں تفکر سے بولیں۔

''ہاں ورنہ یہ ایسا تو بالکل نہ تھا''۔ وہ بھی پریشان تھے۔

''کسی دن کرتے ہیں اس سے تفصیلی بات''۔ انہوں نے پُرسوچ انداز اپنایا۔ علی کو وہ پہلے دن سے نوٹ کر

رہی تھیں مگر اس پر ظاہر نہیں کیا تھا۔
حسن گیلانی نے بیوی کی تائید میں محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆

"تین چار سال......؟" مشارب شاہ نے بیڈ پر لیٹتے ہوئے زیر لب کہا' ساتھ ہی نظریں چھت پر مرکوز کیں۔ اندر کا موسم بے حد خوشگوار تھا۔ ذہن بھی کسی پریشانی و غلط سوچ سے ماورا پُرسکون اور فریش تھا۔
"انتظار......" کہتے ہی پُرسوچ انداز میں لب بھینچے۔
"کوئی بات نہیں تین چار سال تک انتظار کیا جا سکتا ہے اور ویسے بھی ابھی میری عمر تھوڑی نکلی جا رہی ہے"۔ دل ہی دل میں کہتا وہ دلکشی سے مسکرایا۔
"میں انتظار کروں گا ڈیئر...... صرف تمہارے لئے"۔ ساتھ ہی فیصلہ بھی کر لیا۔ محبت و چاہت کا احساس دل کو گلنار کیے دے رہے تھے۔ آئندہ زندگی کا خیال حسین پُرکیف تھا۔
وہ نیند کی وادیوں میں جانے کے لیے انبساط کے رنگوں سے چمکتی آنکھوں کو بند کرنے لگا' وہاں اسے مستقبل کے بہت سے خواب' حقیقت میں ڈھالنے تھے۔ منزل کو پانے کی جستجو میں محبت کے رنگوں سے نکھرنا تھا' چاہت کی پوشاک اوڑھے ہمسفر کے سنگ تا عمر مسافت طے کرنی تھی۔ چاہت کی شدت' جذبوں کی چاشنی سے انتظار کی مٹھاس سے لطف اندوز ہونا تھا۔ مشارب شاہ کچھ ہی پل میں سپنوں بھری نیند کی وادیوں میں اتر چکا تھا۔

☆

سعید صاحب بڑے مطمئن سے لاؤنج میں دونوں بہنوں' بیوی اور بھانجے کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ آج مراد اور مہ روش کی انگیجمنٹ تھی۔ مہ روش اپنی خالہ زاد بہن کے ساتھ پارلر گئی ہوئی تھی جبکہ باقی ساری پریشے' شاہدہ پھپھو کی بیٹیاں عندلیب' روحا' عائزہ اور ریحانہ خالہ کی بیٹیاں شیزاء' مہوش وغیرہ سبھی پریشے کے کمرے میں ڈیرہ جمائے اپنے اپنے چہروں پر طبع آزمائی کرنے میں مصروف تھیں۔
ریحانہ خالہ کے سب سے بڑے بیٹے ارتش نے جب لیپا پوتی کرتی تمام لڑکیوں کو دیکھا تو خاصا محظوظ ہوا' جبھی اُن کے سامنے مقابلے کی شرط رکھی' انہیں چارج کیا کہ جو آج سب سے زیادہ خوبصورت لگے گی اسے اپنی جیب سے کیش پرائز دے گا۔ جس پر تمام لڑکیاں خوشی سے اچھلیں کہ کم ہی ارتش کی جیب سے کچھ نکلنے کی توقع ہوتی ہے البتہ ارتش سے چھوٹی مہوش نے اُسی وقت اعتراض کر دیا۔
"کوئی بھائی کی بات میں نہ آئے' مقابلے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے پتہ ہے ابھی سے کہ بھائی کسے ونر ڈیسائیڈ کر کے اپنے شاہانہ انداز سے نوازنا چاہتے ہیں"۔ البتہ اعتراض میں شرارت کا عنصر واضح تھا۔ سب لڑکیاں جہاں اس کی بات سے متفق تھیں وہیں عندلیب شرم سے لال ہوتی نظریں جھکا گئی کہ اس دوران ارتش محبت پاش مسکراتی نظروں سے اسے دل میں اتار رہا تھا۔
"اچھا تو پھر بتاؤ کون ہے وہ؟" مہوش کی بات پر وہ لطف اندوز ہوا' دلچسپی سے پوچھا۔
"عندلیب"۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔
سب جانتی تھیں دونوں کے دل کی کہانی جو جانے کب سے چلی آ رہی تھی اور بڑے بھی اس بات سے واقف اس متعلق اچھا فیصلہ کر چکے تھے۔ عندلیب نے ارتش سے بچ کر سب کو خونخوار نظروں سے گھورا مگر بے

سود...... وہ فل موڈ میں آ چکی تھیں۔
"ہاں تو وہ ہے ہی تم سب سے زیادہ خوبصورت"۔ جبکہ ارتش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کھلا اعتراف کیا۔ عندلیب سے وہاں بیٹھنا مشکل ہوا۔
"اوہو"۔ باقی سب ہنسیں۔
"خوش فہمی"۔ روحا بولی۔
"غلط فہمی"۔ پریشے بھی چپ نہ رہی۔
"آنکھوں کا دھوکا"۔ شیزاء بھی کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔
"ارے اندھی محبت کہو"۔ عائزہ بھی شرارت سے بولی۔
"دیکھ لو عندلیب! سب تم سے جیلس ہیں"۔ ارتش نے مسکراتے ہوئے شوخی سے اسے مخاطب کیا' ستائشی و پیار بھری نظریں اس پر ٹکائیں۔ عندلیب واقعی خوبصورت تھی وہ جانتا تھا سب اسے تنگ کر رہی ہیں مگر وہ کہاں کم تھا کہ پیچھے ہٹتا' البتہ عندلیب جھینپ گئی تھی۔
"جی نہیں...... ہم نہیں ہوتے کسی سے جیلس۔ ماشاءاللہ ہم خود خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہیں' کیوں لڑکیو"۔ پریشے فوراً بولی' ساتھ ہی تصدیق چاہی۔
"بالکل...... بالکل"۔ سب نے اس کی تائید کی' کورس میں سر ہلا کر کہا۔ وہ ہنسنے لگا۔
"چلو میں اور عندلیب دل پر پتھر رکھ کر مان لیتے ہیں' مگر مقابلہ کرنا ہے کہ نہیں بتاؤ تو سہی......" وہ محظوظ لہجے میں استفسار کرنے لگا۔
"جی بالکل کرنا ہے"۔ روحا نے حامی بھری۔
"مگر ہماری ایک شرط ہے"۔ پریشے نے اعلانیہ کہا۔
"کیسی شرط؟"
"یہی کہ مقابلہ ہم سب کے بیچ ہوگا' عندلیب کو ہم سب ڈس کوالیفائی کرتے ہیں' اگر منظور ہے تو ٹھیک ہے ورنہ آپ جا سکتے ہیں ہمیں ابھی تیار بھی ہونا ہے"۔ پریشے تفصیل سے بولی' سب لڑکیوں نے اسے داد دی۔
"یہ کیسی شرط ہوئی......؟" وہ حیران ہوا' احتجاج کیا۔
"جیسی بھی ہوئی بس ہوئی' منظور ہے تو بتائیں ورنہ ہمیں کوئی اعتراض نہیں کہ آپ یہاں بیٹھ کر اپنی محبت کی پرستش کریں"۔ شیزاء بھی فل اینڈ فائنل بولی۔
"او کے مجھے منظور ہے تم سب کی شرط"۔ وہ پُرسوچ انداز میں حامی بھر گیا۔
"سچ میں"۔ وہ سب ارتش کے اتنی جلدی مان جانے پر حیران ہوئیں۔ عندلیب بھی اپنی جگہ چونکی۔
"ہاں جی سچ میں"۔ تو وہ مسکراتے کھنکتے لہجے میں کہتا کمرے سے باہر نکل گیا۔
اس کے باہر نکلتے ہی عندلیب اپنے جارحانہ انداز میں ان سے ملی۔ انہیں خوب بے نقط سنائیں مگر وہ سب شرط کے بعد ٹینشن فری تھیں' سو ایک بھی اچھی بری نے بغیر مقابلہ حسن کے لیے جی جان سے تیاری پکڑی۔ عندلیب بھی دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔
باہر لاؤنج میں بھی اب محفل گفتگو کا اختتام ہو چکا تھا' چونکہ مراد منصور' کلثوم پھپھو کا اکلوتا بیٹا تھا سو منگنی تو دھوم دھام سے ہونی تھی' خواتین بھی ڈریس اَپ ہونے جا چکی تھیں۔ سعید صاحب بھی کمرے میں چل دیئے۔ وقار

اپنی جگہ بہن کی خوشیوں میں شریک ہونے کی کوشش کرتا کھانے وغیرہ کے بندوبست میں مصروف تھا۔ ارلیش اور شاہدہ پھپھو کا بیٹا معارج مووی وغیرہ کا انتظار کر رہے تھے‘ البتہ یہ ٹوٹلی فیملی فنکشن تھا۔ خاندان کے تمام افراد موجود تھے سوائے ادینہ اور اس کے سسرال کے۔ اتنے عرصے بعد خوشی بھی اتنی بڑی ملی تھی کہ سب بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتے تھے۔ کلثوم بیگم نے مراد کا ڈریس و تمام مطلوبہ چیزیں اس کے کمرے میں رکھیں اور اسے تیار ہونے کے لیے بلانے چل دیں۔ وہ کچن میں پانی پی رہا تھا۔

”مراد بیٹا! جاؤ اب تم بھی ڈریس چینج کر لو‘ کچھ ہی دیر میں فنکشن شروع ہوگا۔ مہ روش بھی پارلر سے آنے والی ہے“۔ انہوں نے کہا۔

”جی امی!“ اس نے پانی کا گلاس ختم کر کے سائیڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔ چہرے پر طمانیت چھلک رہی تھی‘ آنکھوں میں خوشی کے رنگ تھے‘ وہ مسکرائیں‘ بغور بیٹے کو دیکھا جس پر انہیں ہمیشہ سے فخر تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں امی؟“ وہ جز بز ہوا۔

”تمہاری وجہ سے بیٹا آج سب خوش ہیں‘ آج ایک ماں کو اپنے سعادت مند اور قابل بیٹے پر فخر ہے‘ خوشی ہے کہ اس نے سب کے جذبات کا احساس کیا۔ میری دعا ہے بیٹا! تم یونہی خوش رہو‘ تمہیں اور مہ روش کو دنیا کی تمام خوشیاں اور راحتیں ملیں“۔ کلثوم بیگم نے آگے بڑھ کر بیٹے کی کشادہ پیشانی پر لاڈ بھری مہر ثبت کی ساتھ ہی اسے دعا دی۔

”تھینک یو سوچ امی! اینڈ لو یو...... میں نے اپنا بہت بعد میں سوچا‘ یہ سب صرف آپ کے لیے ہے“۔ وہ خوشگواریت و محبت سے بولتا ماں کی ممتا کو انمول کر گیا۔

”جیتے رہو بیٹا......! اللہ تعالیٰ تمہیں ضرور اس کا اجر دے گا“۔ وہ شادسی شفقت بھرا ہاتھ اس کے چہرے پر پھیرتیں بولیں تو مراد نے ان کا ہاتھ تھام کر اپنائیت سے بوسہ لیا۔

”بس امی! آپ دعا کیجیے گا کہ میں نے جس مقصد کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے اس میں کامیاب رہوں“۔ آہستگی سے بولا بلکہ دعا طلب کی‘ لہجے میں بہت کچھ خاص تھا۔

”انشاء اللہ بیٹا! اللہ تمہیں زندگی کے ہر میدان میں کامیاب کرے“۔ انہوں نے دل سے کہا‘ وہ گہرائی سے مسکرایا۔

”اچھا چلو اب جلدی سے تیار ہو جاؤ‘ باقی سب بھی تیار ہو رہے ہیں“۔ انہوں نے بات بدلی‘ اسے کہا۔ وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

”سنو مراد!“ جبھی وہ کچھ یاد آنے پر دوبارہ گویا ہوئیں۔

”جی امی......؟“ سوالیہ نگاہوں سے کلثوم بیگم کو دیکھا۔

”منگنی کے بعد یاد سے ادینہ کو فون کرنا۔ وہ تم سے بات کرنا چاہ رہی تھی‘ بہت خوش ہے وہ“۔ انہوں نے کہا

”جی امی ضرور“۔ اس نے آہستگی سے ماں کو یقین دہانی کروائی اور کمرے کی جانب چل دیا۔ کلثوم بیگم بھی کچن سے نکل گئی تھیں۔

فنکشن سے متعلق تمام انتظامات لڑکوں نے مکمل کر لیے تھے۔ لڑکیوں کی تیاری آخری مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ وقار ابھی تک کھانے وغیرہ کے انتظامات میں زبردستی خود کو مصروف رکھے ہوئے تھا۔ نفیسہ بیگم نے ارلیش اور معارج کو بھیجا کہ مہ روش اور سبین کو لے آئیں وہ دونوں پارلر سے فارغ ہو چکی تھیں‘ سو دونوں انہیں لینے روانہ ہوئے۔

”ماشاء اللہ کتنی پیاری لگ رہی ہوں میں‘ اللہ نظر بد سے بچائے مجھے‘ آمین!“ بالآخر لڑکیوں کی مقابلہ حسن کے لیے تیاری مکمل ہوئی تو سب سے پہلے عائزہ نے آئینے کے سامنے اپنا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے خود ہی اپنی نظر اتاری۔

”مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے محترمہ عائزہ صاحبہ!“ جسے سنتے ہی عندلیب جل بھن کر بولی کہ آج وہ ان سب کی وجہ سے مقابلے سے آؤٹ ہوئی تھی۔

”ہاہاہا......“ جس پر سبھی کا طنزیہ پُر مزاح‘ شریر سا قہقہہ کمرے کی فضا میں بلند ہوا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم سب“۔ وہ غصے سے چلائی۔

”آج ہمارا بالکل موڈ نہیں ہو رہا‘ ہاں البتہ تم جانا چاہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں“۔ شیزاء فرینکلی بولی ساتھ ہی اسے صلاح دے کر خفگی کا چانس مٹایا‘ عندلیب نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا۔

”ایک راز کی بات بتاؤں؟“ اتنے میں پریشے نے سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔

”ہاں بتاؤ؟“ سب نے تجسس ظاہر کیا۔

”تم سب آج بہت اچھی لگ رہی ہو مگر ابھی سے دل تھام لو کیونکہ کیش پرائز میں وِن کرنے والی ہوں“۔ وہ ڈرامائی انداز میں سرگوشیانہ بولی بلکہ خود کو خوبصورت کہا جس پر سب نے منہ بسور کر اسے پچھاڑا تو وہ ہنسنے لگی۔

”فی الحال تو سبھی خوش فہمی کا شکار ہیں مگر اصل فیصلہ تو بعد میں ہوگا‘ سو دیکھتے ہیں بعد میں‘ ابھی چلو باہر مہ روش اور سبین آنے والی ہیں“۔ مہوش نے بات بدلی۔ سب نے اس کی تائید کی اور آگے پیچھے باہر نکلیں جبھی داخلی دروازہ معارج نے بڑی عقیدت سے کھولا۔

مہ روش سعید نے قدم اندر رکھا۔ سب کی توصیفی و پُرشوق نگاہیں اس پر اٹھیں۔ بوتل گرین سوٹ‘ میچنگ سینڈلز اور جیولری بھی اس کی کھلتی رنگت پر جچ رہا تھا۔ عام روٹین میں وہ برائے نام میک اپ کرتی تھی مگر آج ماہرانہ ہاتھوں نے اس کے چہرے کو چاند سے چاندنی چرا کر اس کی خوبصورت میں اضافہ بخشا تھا۔ گھنی مژگان کی جھالر‘ جھکی آنکھیں‘ دلکش شرمیلی مسکراہٹ اور چہرے پر پھیلی شرم و حیا کی لالی مہ روش سعید کو سب میں نمایاں اور خاص ظاہر کر رہی تھی۔

گھر کی تمام خواتین نے آگے بڑھ کر اسے پیار دیا‘ دعا دی۔ سعید صاحب نے بھی اس کے سر پر دستِ شفقت رکھا۔ تمام لڑکیوں کی آنکھوں میں ستائش تھی۔ سبین اسے ساتھ لیے لاؤنج میں سیٹ کیے صوفے تک لے گئی اور بٹھایا‘ سب اس کے اردگرد اکٹھے ہوئے اتنے میں مراد منصور کی آمد ہوئی‘ ہنستا مسکراتا چہرہ‘ آنکھوں میں خوشی کی لہریں‘ وہ بہت جاذب نظر لگ رہا تھا۔ نفیس سے سوٹ میں بال سیٹ کیے اپنی مردانہ وجاہت سے سب کو اپنی طرف متوجہ کرتا آگے بڑھا‘ دونوں سے متعلق رشتے کو لے کر سب آج بہت خوش تھے۔

”ماشاء اللہ!“ کلثوم بیگم نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چومی‘ نظر اتاری اور اس کو مہ روش کے ساتھ لا بٹھایا۔

مراد نے ایک مسکراتی نظر مہ روش پر ڈالی جو سر و آنکھیں جھکائے خوبصورتی و حیا کا پیکر لگ رہی تھی اور اب مراد کے اپنے سنگ بیٹھتے ہی دل کی دھڑکنیں سنبھالنے میں لگی ہوئی تھی۔

”ماشاء اللہ...... دونوں بہت پیارے لگ رہے ہیں“۔ شاہدہ پھپھو نے بھی انہیں پیار کیا۔ دونوں واقعی بیسٹ کپل لگ رہے تھے بالکل چاند سورج کی طرح‘ پھول خوشبو کی طرح ساتھ ساتھ‘ سب کو اپنی طرف کھینچتے محسوس ہو

رہے تھے۔

''اللہ دونوں کے نصیب میں خوشیاں مبارک کرے''۔ ریحانہ خالہ صدق دل سے بولیں۔ نفیسہ بیگم نے آگے بڑھ کر بیٹی اور پھر مراد کو پیار دیا' مستقبل کی خوشیوں کی دعا دی۔

وقار بھی کچھ ہی فاصلے پر آ کھڑا ہوا' بہن کی خوشی اسے بھی عزیز تھی' آگے بڑھ کر اس کے سر پر دستِ شفقت رکھ کر آئندہ زندگی کیلئے دعا تو نہ دے سکا البتہ دل میں کوئی کسر بھی نہ چھوڑی' خلوص دل سے دل میں نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور مراد کو بھی گلے لگا کر تشکر کا اظہار نہ کر سکا کہ اس نے یہاں آنے کے بعد بھی وقار سے فاصلہ رکھتے ہوئے اس سے عجیب سا رویہ رکھا تھا' مگر وقار کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ بھلے وہ اس سے بات نہ کرے مگر اس کی وجہ سے ابو اور پھپھو پھر سے اکٹھے اور خوش ہوئے تھے اور اب جبکہ وہ اس کی لاڈلی بہن کا شریک سفر بننے جا رہا تھا اس نے کوئی غلط سوچ ذہن میں نہیں لائی بلکہ اندر ہی اندر اس کا مشکور تھا۔

''خواتین و حضرات...... برائے مہربانی جمگھٹا ختم کر کے اپنی اپنی نشست سنبھال لیں' کیمرہ ان خوبصورت لمحات کو قید کرنے کیلئے بے چین ہوئے جا رہا ہے' لہٰذا کیمرے کی درخواست ہے کہ باقاعدگی سے رسم کا آغاز کیا جائے''۔ معارج نے کیمرہ سنبھالتے ہوئے خاصی تفصیل سے تفریحی انداز اپنا کر کہا تو سب نے مسکراتے ہوئے اپنی اپنی جگہ سنبھالی۔ پھر باقاعدگی سے رسم کا آغاز ہوا۔

سب کی دعاؤں اور نیک تمناؤں میں مراد منصور نے مہ روش کا کومل سا ہاتھ تھام کر اس کی مخروطی انگلی میں اپنے نام کی انگوٹھی پہنائی۔ اس خوبصورت یادگار لمحے کو پریشے نے موبائل میں کیچر کر لیا۔ ان دونوں کے لب مسکرا رہے تھے' مہ روش کے مراد کے نام ہوتے ہی تمام ینگ پارٹی نے بھرپور آواز لگائی۔ کلثوم بیگم نے اٹھ کر سب کا منہ میٹھا کروایا۔ سعید صاحب کے چہرے پر طمانیت و سکون تھا۔

''اس وقت ادینہ بھی ہوتی تو کتنا انجوائے کرتی...... بہت خوش ہوتی وہ''۔ ریحانہ بیگم نے حسرت بھری آواز میں کہا' جانتی تھیں کہ دونوں بہن بھائی میں بہت پیار ہے۔ اُن کی آواز پر مراد کے کان کھڑے ہوئے تو اس نے نہایت ناگواری کے ساتھ عجب کھولتی نگاہوں سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑے وقار کو دیکھا مگر اگلے ہی پل خود پر ضبط کرتا دوسری جانب توجہ مبذول کر گیا۔

''ہاں وہ تو آ رہی تھی مگر اس کی ساس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے مجبوراً اسے رُکنا پڑا''۔ کلثوم پھپھو نے ریحانہ بیگم کو آہستگی سے جواب دیا۔ پھر آگے پیچھے تمام خواتین' سعید صاحب اور وقار کھانے کیلئے گئے تو لڑکیوں نے کچھ یاد آتے ہی ارلیش کو پکارا۔

''کون زیادہ خوبصورت لگ رہی ہے؟''

''زیادہ سے مطلب...... مجھے تو کوئی خوبصورت بلکہ قابل دید بھی نہیں لگ رہی''۔ جواباً وہ عادتاً شرارت سے بولا۔ مراد اور ماہی کا بے ساختہ و مشترکہ قہقہہ فضا میں گونجا جبکہ تمام لڑکیوں کا منہ دیکھنے لائق تھا سوائے عندلیب کے جو انہیں منہ چڑا کر مزید تپانے لگی۔

''حد ہوتی ہے یار ارلیش! اتنی پیاری پیاری لڑکیوں کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہو تم''۔ مراد نے اسے ٹوکا۔

''پیاری پیاری کہاں؟ انعام کے لالچ میں یہ ڈراؤنی ڈراؤنی لگ رہی ہیں''۔ وہ ہنسا کہ عندلیب کے ڈس کوالیفائیڈ ہونے کے بعد وہ سوچ چکا تھا کہ کسی کو انعام نہیں دے گا' اب بھی ارادہ انہیں چڑانے کا تھا' لڑکیاں مزید چڑیں۔

''جو بھی ہے مگر آپ کو اپنی بات پوری کرنی ہوگی''۔ شیزا نے کہا۔

''ورنہ بہت برا ہوگا''۔ روحا بھی ضدی ہوئی' اسے دھمکایا۔

''ہاں یار! اب بات انعام کی نہیں ان کی عزت نفس کی ہے' جسے میں تمہارے ہاتھوں مجروح نہیں ہونے دوں گا''۔ معارج نے بھی لڑکیوں کا ساتھ دیا۔

''یار برے پھنسے ہو تم''۔ مراد نے صورتحال سے لطف اٹھایا۔

''ہاں ناں اب مجبوراً فیصلہ کرنا پڑے گا''۔ ارلیش کہتے ہی سب کو بغور دیکھنے لگا۔ ویسے تو سب ہی اپنی اپنی جگہ خوبصورت لگ رہی تھیں مگر کیش دینے کی سوچ میں ارلیش کو ایک بھی نہ بھائی۔

''مجھے تو کوئی بھی خوبصورت نہیں لگ رہی''۔ جبھی صاف بولا۔ لڑکیوں کی خونخوار مگر ضبط کرتی نظریں اس پر جمیں۔

''کیونکہ ساری خوبصورتی تو میرے پہلو میں آسمائی ہے''۔ جبکہ مراد نے محبت پاش نظروں سے مہ روش کو دیکھتے ہوئے چاہت سے لبریز انداز میں کہا تو اس نے بے ساختہ مراد کو دیکھا جہاں اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کا منتظر سمندر اس کے جذبات کی عکاسی کر رہا تھا۔

''ہاں یہ تو ہے''۔ سب نے مراد کی تائید کی۔ مہ روش کے لب اپنائیت و محبت کے احساس سے مزید کھل اٹھے تھے۔

''پھر کیش پرائز کی حقدار تو مہ روش ہوئی''۔ وہ بولا۔ مراد کی چالاکی پر اس بار لڑکیوں نے کوئی اعتراض نہ کیا کہ وہ واقعی سب سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔

''بے شک''۔ ارلیش نے بھی کہتے کے ساتھ ہی جیب سے ہزار کا کڑکتا نوٹ نکال کر ماہی کی جانب بڑھایا' اس نے انکار کرنا چاہا تو زبردستی اسے تھمایا۔

''آپ کی خوبصورتی کے آگے یہ بہت کم ہے' کیوں مراد؟'' پھر کہتے ہی مراد سے جواب طلب کیا۔

''کوئی شک؟'' وہ مسکرایا۔

''مگر چونکہ مقابلہ حسن ان ڈراؤنی ڈراؤنی لڑکیوں کے درمیان تھا جنہوں نے میری رانی کو ڈس کوالیفائی کرنے کی شرط رکھ کر میرے جذبات سے مذاق کرنا چاہا' جس کی سزا انہیں اب میں دوں گا۔ ان کی چالاکی میری محبت کو کم نہیں کر سکتی تو جناب! ارلیش سکندر کے کیش پرائز کی ونر کوئی اور نہیں بلکہ اس کے دل کی اپنی ملکہ عندلیب ہے...... تالیاں!'' شرط مانتے وقت کی سوچ کو ارلیش نے بالآخر عملہ جامہ پہنایا' اعلانیہ فیصلہ سنایا اور فوراً سے پہلے جیب سے نوٹ نکال کر عندلیب کو تھمایا اور وہاں سے بھاگنے لگا' دیکھ چکا تھا کہ باقی لڑکیاں اس کی درگت بنانے کے لئے تیار اس کی جانب بڑھ چکی تھیں۔

''یہ فاؤل ہے''۔

''ہم اس فیصلے کو نہیں مانتے''۔ ایسی مختلف آوازیں کافی دیر تک لاؤنج میں گونجتی رہیں' البتہ عندلیب کے چہرے پر خوشی دیدنی تھی۔

''تھینک یو سوچ مہ روش!'' سب کے جانے کے بعد مراد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''فار واٹ؟'' ماہی نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''میری ہونے کے لیے''۔ آہستگی سے بولا' وہ مسکرائی۔

’’آج تم نے میری زندگی میں آ کر میرے جذبات کو معتبر کر دیا ہے‘ محبت کا احساس واقعی بہت خوبصورت ہوتا ہے‘‘۔ وہ چاہت بھرے انداز میں کہنے لگا پھر اضافہ کیا۔

’’یو آر رئیلی سو بیوٹی فل‘‘۔ سچائی سے کہا۔

’’تھینک یو‘‘۔ وہ مدھم لہجے میں بولی‘ آواز میں انبساط کی لہر تھی۔

’’رئیلی...... مجھ سے اپنے ہوش سنبھالے نہیں جا رہے‘ دل چاہتا ہے تم یونہی سامنے بیٹھی رہو اور میں بس صرف تمہیں ہی دیکھتا رہوں‘‘۔ مراد فل موڈ میں تھا‘ آہستگی سے اقرار کرتا اس کی ذات کو معتبر کرنے لگا۔ وہ نظریں جھکائے شرم و حیا کی لالی سمیٹنے لگی۔

’’لو یو سو چ مائے لو‘‘۔ مراد نے عقیدت سے کہا‘ ساتھ ہی اس کے ہاتھ کی ہتھیلی پر نرمی سے مہر محبت ثبت کی۔ ماہی نے حیرانگی سے اسے دیکھا مگر مراد کی آنکھوں میں اتنا کچھ خاص تھا کہ وہ اگلے ہی پل گلنار سی ہوتی ایک مرتبہ پھر نگاہوں کا رخ بدل گئی۔

محبت کا فرشتہ دونوں کے ملن کی پہلی رُت پر سرشار سا ہونے لگا تھا۔

☆

فلک کی بھوک زوروں پر تھی۔ کمرے سے نکل کر سیدھا کچن کا رخ کیا اور بنا کسی کا انتظار کیے کرسی کھینچ کر بیٹھی اور کھانا شروع کیا تو تھوڑا سکون ملا۔ کچھ ہی دیر میں گھر کے باقی افراد بھی کھانے کیلئے آ چکے تھے۔ وہ جو پہلے سے کھانے میں مصروف تھی اُن کا بھی خوب ساتھ دینے لگی۔

’’کتنا کھاتی ہو تم؟‘‘ عثمان نے بالآخر اسے نشانہ بنایا۔

’’ماشاءاللہ کہو‘ نظر لگاؤ گے کیا؟‘‘ وہ چڑ کر بولی۔

’’توبہ استغفار...... میں کیوں لگاؤں گا‘‘۔ فوراً سے نفی کی‘ سبھی مسکرائے۔

’’پھر اپنے کام سے کام رکھو‘ خود بھی کم نہیں ہو‘‘۔

’’ہاں پر تم پر حیرانگی ہوتی ہے‘‘۔ اس نے متعجب انداز اپنایا۔

’’کیوں؟‘‘ فلک نے دیدے پھاڑے۔

’’پھر بھی کتنی سلم سمارٹ ہو‘ جاتا کہاں ہے سب مال؟‘‘ فلک کے نازک سراپے و کھانے کی رفتار میں تضاد تو تھا ہی سو وہ پوچھ بیٹھا‘ مشارب‘ عثمان کی بات پر فلک کو دیکھنے لگا۔

’’تیمور کی توند میں‘‘۔ جواباً وہ برجستہ کھلکھلا کر بولی اور گفتگو میں تیمور کی ذات بلکہ دن بدن پھیلتی توند کو گھسیٹا۔ تیمور گھر بھر میں واحد تھا جو کھانے کا شوقین ہونے کی سزا کاٹنے میں موٹاپے کا شکار ہوا تھا اور اب بہن کی بات پر نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے دونوں کی طرف مڑا۔

’’تم دونوں سے اچھا ہی ہوں‘ کوئی دیکھے تو یہ نہیں کہے گا کہ گھر والے کھانے کو نہیں دیتے...... عثمان تو ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے اور فلک آپی ہوا چلے تو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملیں‘ کیا فائدہ ایسی اسمارٹنس کا‘‘۔ اس نے دونوں کو جلی کٹی سنائی۔ باقی تمام افراد اس کی بات پر مسکرائے سوائے عثمان اور فلک کے۔

’’بکواس بند کرو‘ مار کھاؤ گے مجھ سے‘‘۔ اسے گھورا۔

’’شروع آپ دونوں نے کی تھی‘‘۔ تیمور نے اثر ہی نہ لیا۔

’’اب لڑائی شروع مت کر دینا‘‘۔ اس سے پہلے کہ تینوں میں تکرار بڑھتی تایا جان (قاسم شاہ) نے انہیں ٹوکا۔

’’تایا جان! بات انہوں نے شروع کی ہے آپ کے سامنے‘ اب میں بدلہ بھی نہ اتاروں؟‘‘ تیمور عاجزی سے بولا۔

’’ضرور اتارو مگر کھانے کے دوران ہرگز نہیں‘ جانتے تو ہو کھانے کے دوران فضول بحث منع ہے‘ گناہ ہوتا ہے رزق کا مذاق اڑانا اور عثمان‘ فلک تم دونوں بھی کچھ خیال کرو‘ محفل کے آداب سیکھو‘‘۔ قاسم شاہ نے نرم لب و لہجے میں انہیں سمجھایا۔

تایا جان خوش مزاج انسان تھے۔ کسی حد تک مذاق انہیں بھی پسند تھا‘ خوشگوار طبع کے مالک تھے مگر انہیں کسی نہ کسی وقت باور ضرور کرواتے۔ مشارب نے بھی فلک کو اس بارے میں سمجھانا تھا کہ اب اسے یہ سب باتیں چھوڑنا چاہئیں۔

’’بہتر تایا جان!‘‘ تینوں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ مسکرائے۔

کھانے کے بعد سب نے اپنے اپنے کمروں کا رخ کیا جبکہ فلک ہمیشہ کی طرح چھت پر چلی آئی۔ رات کے وقت اسے چھت پر چہل قدمی کا کریز تھا‘ بہت سکون ملتا تھا اسے اور چھت پر چاند کی دودھیا روشنی میں مناظر فطرت دیکھ کر‘ چاند کی چاندنی سے سانسوں کی مہک اپنے اندر جذب کرنے میں اسے بہت مزہ آتا تھا۔

’’تم یہاں ہو؟‘‘ پیچھے ہی مشارب بھی چلا آیا کہ دونوں موڈ ہوتا نہ ہوتا گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔

’’ہاں اور ہمیشہ کی طرح مجھے یقین تھا تم بھی آؤ گے‘‘۔ آج وہ بالکل پہلے کی طرح ری ایکٹ کر رہی تھی کہ فیصلہ پختہ تھا‘ جب تک وہ اقرار طلب نہیں کرے گا فلک دل کا حال پوشیدہ ہی رکھے گی۔ یہ فلک کی محبت کا اپنا ہی انداز‘ خوبصورت احساس تھا۔

’’ظاہری بات ہے تمہارے بغیر میرا دل کہاں لگتا ہے لٹل فرینڈ‘‘۔ وہ مسکرایا۔

’’لیں......‘‘ وہ اندر تک سرشار ہوئی تھی اس کے سرسری انداز و کئی بار کے کہے جملے کو بہت خاص سمجھ کر۔

’’ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گی؟‘‘ اس نے بات بدلی۔

’’بالکل بھی نہیں...... ضرور کہو بلکہ فوراً کہو‘‘۔ وہ ہنسی۔

’’تم خود کو بدلو اب‘‘۔ وہ بولا۔

’’کس لیے؟‘‘ غیر متوقع بات پر وہ برجستہ پوچھنے لگی۔

’’میرے لیے‘‘۔ ٹکا سا جواب بے ساختہ ملا۔ سنتے ہی وہ حیران ہوئی‘ آنکھیں پھیلائیں‘ دل پُر شوق ہوا۔ مشارب شاہ نے بغور اسے دیکھا۔

’’پاگل! مذاق کر رہا ہوں‘ اس میں حیران کیوں ہوئی‘ لب و لہجہ تو سمجھو‘ سچ سمجھ بیٹھی ہو کیا‘‘۔ اور اگلے ہی لمحے اس کو ہوش دنیا میں واپس لانا چاہا‘ وہ یکدم سنبھلی کچھ شرمندہ بھی ہوئی۔ فوراً دل کو ڈانٹا‘ آنکھوں کو اندر ہی اندر آنکھیں دکھائیں کہ ہر وقت سینے سج کرنے کو بے تاب نہ رہیں پھر ہونٹ بھینچے کہ اپنے فیصلے پر پہلا ہی قدم ڈگمگانے چلا تھا۔

’’نہیں بالکل سچ نہیں سمجھی‘ تم جیسے پاگل کی بات پر یقین تو نہیں ہاں حیرانگی ضرور ہوئی ہے‘‘۔ وہ فوراً بنا کر بولی‘ خود کو کمپوز کیا۔ مشارب اس کی بات پر مسکرایا۔

’’اچھا بتاؤ کیا بات کرنی تھی؟‘‘ وہ اصل بات کی طرف آئی۔

’’یہی کہ خود کو بدلو‘‘۔ اس نے اپنی بات دہراتے ہوئے لفظوں پر زور دیا۔

’’کس لیے؟‘‘

''اپنے لیے''۔ اس بار وہ سنجیدہ ہوا۔

''مطلب؟''

''دیکھو یار فلک! اب تم چھوٹی بچی نہیں ہو' بڑی ہوگئی ہو' سمجھدار ہو' سوچنے کی صلاحیت رکھتی ہو' خود کو سدھارو۔ چچی جان تمہاری وجہ سے کتنی پریشان رہتی ہیں اور فکر تو سب کو ہے تمہاری' گھر کی اکلوتی لڑکی ہو' اپنی ذمے داری کا احساس کرو' کسی حد تک لاپرواہی اور لاابالی پن تو چلو اس عمر میں لڑکیوں میں ہوتا ہے مگر مکمل طور پر خود کو کام سے بری الذمہ ٹھہرانا اور ذمے داریوں سے کترانا تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تم مکمل طور پر نہ سہی پر امی اور چچی جان کے ساتھ کام وغیرہ میں ہاتھ بٹاؤ' ان کی تھوڑی بہت مدد کرو' کچھ نہ کچھ سیکھو کہ بعد میں کوئی مسئلہ نہ ہو' ڈھیروں کام اور اچانک کی ذمے داری سے تمہیں گھبراہٹ نہ ہو...... تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات؟'' ایک دوست ہونے کے ناطے مشارب شاہ اس سے مخاطب تھا۔ جانتا تھا کہ فلک جیسی بے غم روح' گھر بھر کی لاڈلی اتنی آسانی سے کسی اور کی حتیٰ کہ ماں باپ کی بھی بات نہیں سنتی نہ مانتی ہے جتنی کہ مشارب کی مانتی ہے اور پھر فہمیدہ بیگم کی آنکھوں میں فلک کو لے کر فکر مندی اور مستقبل کی سوچ اسے مجبور کر گئی تھی کہ ایک دوست اور کزن ہونے کے ناطے وہ فلک سے اس مسئلے پر بات ضرور کرے گا۔

''ہاں سمجھ رہی ہوں''۔ فلک نے اثبات میں سر ہلایا۔ ظاہر نہ کیا پر دل میں قیاس' دماغ میں سوچ ضرور ابھری کہ مشارب مستقبل میں اسے اپنے ساتھ رکھنے' چلنے کا خواہشمند' ابھی سے بالکل پرفیکٹ بنانا چاہتا ہے۔

''پھر میری بات مانو اور عمل کرو' چچی جان جو سکھائیں سیکھو' جو کہیں وہ مہذب انداز میں مانو۔ لڑکیاں سلجھی ہوئی' سلیقہ شعار' سمجھدار اچھی لگتی ہیں''۔ وہ بولا۔

''تم یہ سب کیوں' کس لیے کہہ رہے ہو؟'' فلک کے خود کے دل میں چور تھا' شریر وشوخی سے معنی خیزی سے استفسار کیا۔

''ایک دوست ہونے کے ناطے تمہاری بہتری کیلئے''۔ وہ سنجیدہ تھا' خلوص دل سے کہنے لگا' وہ مسکرائی۔

''جانتے ہو میں نے اُس دن ہی امی سے کہہ دیا تھا کہ میں اب ہر کام سیکھوں گی مگر اب ایک ماہ بعد''۔ پھر اسے مطلع کیا۔

''ایک ماہ بعد کیوں؟'' وہ حیران ہوا۔

''ایک ماہ بعد انگلش کا پیپر ہے' وہ پڑھ کر دوں گی پھر سب کروں گی''۔

''تم سچ میں پیپر دو گی وہ بھی پڑھ کر''۔ وہ مزید چونکا۔

''ہاں جی''۔ وہ اس کے انداز پر مسکرائی۔

''یہ خیال کیسے آیا؟''

''بس تم نے ایک دن کہا تھا ناں کہ تمہیں پڑھی لکھی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں بس اُسی دن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں پڑھوں گی' جتنا تم کہو گے''۔ وہ روانی میں بتا گئی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے اینڈ آئی ایم سو ہیپی کہ تم نے میری بات یاد رکھی' اس پر عمل کا سوچا لیکن اس کے علاوہ میں تمہیں بتا دوں کہ تم مجھے ویسے بھی بہت اچھی لگتی ہو''۔ سن کر وہ مسکرایا' خوش ہوا پھر اسے بتانے لگا جسے سن کر وہ سرشار ہوئی۔

''کیوں؟''

''دوست ہونے کے ناطے اپنی تمام تر شوخیوں' باتوں' شرارتوں' اداؤں' نخروں کے ساتھ...... تمہارے چہرے کی معصومیت' تمہاری مسکراہٹ مجھے بہت اچھی لگتی ہے''۔ مشارب شاہ کی بات پر فلک کے چہرے کے دہکتے رخسار' چاند کی چاندنی چراتے نکھرنے لگے' ہونٹ کھل اٹھے تھے' آنکھیں فرطِ انبساط سے الوہی چمک لیے گنگنا اٹھی تھیں۔ یہ محبت کا خوبصورت پُرسحر اثر تھا جو وہ خود ساختہ فیصلے کے باوجود اپنے جذبات واحساسات سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ مشارب کی باتیں اور الفاظ غیر واضح ہونے کے باوجود اس کے اندر بسی دنیا کو' پیار' محبت کی شدت کو ہوا کے خوشگوار جھونکے کی طرح مہکانے لگے۔

واقعی محبت میں اختیار ہوتا ہی نہیں ہے۔ بے اختیاری ابتدا ہی سے محبت کے مسافر کو بڑی چاہت سے اپنے حصار میں قید کیے اپنا آپ منوا لیتی ہے اور فلک نے تو اول دن سے ہی خود کو' اپنے دل اور روح کو محبت کے سپرد کر دیا تھا' پھر اب اختیار کیسے رکھتی خود پر۔

''سنو مشارب شاہ!'' جبھی اسے پکارا۔

''کہو میری پگلی دوست......!'' وہ متوجہ ہوا۔

''تمہیں کیسی لڑکی پسند ہے؟'' فلک نے آرام وتحمل سے پوچھا۔ وہ حیران ہوا۔

''یہ کیسا سوال ہے؟''

''سوال کی قسم نہیں ہوتی پاگل! سوال صرف سوال ہوتا ہے' اچھا بتاؤ ناں؟'' وہ ہنسی پھر سنجیدگی سے استفسار کرنے لگی۔

''کس لیے پوچھ رہی ہو؟'' اس نے الٹا سوال کیا۔

''ایسے ہی لیکن اگر تم بتا دو تو تائی جان کو تمہارے لئے لڑکی ڈھونڈنے میں آسانی رہے گی''۔ کندھے اچکا کر اس نے سرعت سے بات بنائی۔

''تم جیسی!'' وہ دوٹوک بولا پھر اگلے ہی لمحے اضافہ کیا۔

''مطلب تم جیسی تو ہرگز بھی نہیں''۔ پھر اپنی بات مکمل کر کے زور سے ہنسا کہ فلک خونخوار نظروں سے اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔

''سوری ویری سوری''۔ اس نے ہنسی روکی۔

''سیریسلی بتاؤ مشارب شاہ!''

''اوکے''۔ وہ سیدھا ہوا۔

''تم اپنی لائف پارٹنر کو کیسا دیکھنا چاہتے ہو؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''شکل وصورت سے؟'' اس نے بتانے سے پہلے سرسری پوچھا۔

''ہر لحاظ سے''۔ فلک نے کہتے ہوئے سوالیہ اسے دیکھا۔

''اوکے''۔ اس نے لمحے بھر کو سوچا پھر توقف کے بعد بولا۔

''شکل وصورت کی خاص ڈیمانڈ نہیں البتہ پرکشش ہو' خوب سیرت ہو' سلیقہ مند' سلجھی ہوئی' رکھ رکھاؤ کی قائل ہو' مجھ سے جڑے تمام رشتوں سے پیار کرنے والی' بات ماننے والی' حالات کو سمجھنے والی' سب کو ساتھ لے کر چلنے والی' گھریلو امور میں ماہر' اور جو اچھا کھانا بنانا جانتی ہو''۔ وہ سوچ سوچ کر تفصیل سے بتا رہا تھا اور فلک بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں خوبصورت ہوں اور پرکشش بھی، سیرت کو تم جانتے ہو، سلیقہ مند فی الحال نہیں پر ایک دن ہو جاؤں گی، تمہارا پیار مجھے سلجھا بھی لے گا، اور تم سے جڑے سب رشتوں کو تم سے بڑھ کر چاہتی ہوں، تمہاری بات بھی مانتی ہوں، حالات وقت سمجھا دے گا، تمہارے ساتھ چلوں گی زیست کے ہر سفر میں...... تمہارے لیے تمہارے پیار میں ہر کام سیکھوں گی، اچھے اچھے کھانے بھی بناؤں گی ...... سچی!'' فلک نے ہر ہر بات کو بمعہ جواب اپنے انداز میں اندر ہی اندر دہرایا کہ سوال کا مقصد ہی مشارب کی سوچ جان کر اس کے خیالات پر پورا اتر کر اس کے دل میں جگہ بنانی تھی۔

''اچھا اور......؟'' وہ مشارب کی طرف دیکھ کر بولی، وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''سب سے بڑھ کر مجھ سے محبت کرے''۔ مشارب تصوراتی دنیا میں اپنی ہمسفر کے سنگ تھا۔

''مجھ سے بڑھ کر تمہیں کون محبت کر سکتا ہے''۔ اور فلک اپنی دنیا میں گم جھوم کر جواب دے رہی تھی۔

''میرا خیال رکھے، میرا ہر کام ذمے داری سمجھ کر نہیں بلکہ دل سے کرے، جو مجھ سے صرف اپنی باتیں کرے، مجھے دیکھے مجھے چاہے، میں آفس سے آؤں تو اپنے خوشگوار مسکراتے چہرے سے میرا استقبال کرے اور پھر اپنے ہاتھ کی بنی چائے پلا کر میری ساری تھکن اتار دے''۔ وہ آہستگی سے کہے جا رہا تھا۔

''یہ سب تو میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے مشارب شاہ! میں تمہارا خیال رکھوں گی خود سے بڑھ کر، دل سے تمہارا ہر کام کروں گی بھلے قسم لے لو...... اپنی تمہاری باتوں میں صرف تمہیں دیکھوں گی، چاہوں گی، تمہارا اپر تپاک استقبال کر کے تمہاری ساری تھکن اتاروں گی، ویسے میرے ہاتھ کی چائے تو ابھی سے تمہیں بہت پسند ہے اور دیکھنا پیپر کے فوراً بعد تمہاری پسند میں ڈھل جاؤں گی''۔ فلک اپنی ہی دھن میں مگن تھی۔

''ہاں البتہ باتیں تیز نہ کرتی ہو''۔ آخر میں وہ گویا شرط رکھ گیا اور یہیں سے فلک ہوش و حواس میں لوٹی۔

''مجھے زیادہ اور تیز باتیں کرنے والی لڑکیاں زیادہ اچھی نہیں لگتیں''۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''اوہ نو......'' فلک نے سنتے ہی سر تھاما۔

''کیا ہوا؟''

''پھر تو تم مجھے بالکل بھی پسند نہیں کرتے ہو گے''۔ اسے اپنی فکر پڑی۔

''کیوں؟''

''میں تو بہت تیز اور سب کے خیال میں زیادہ تر فضول باتیں کرتی ہوں''۔ معصومیت سے اس کے گوش گزارا جبھی مشارب شاہ کا جاندار قہقہہ فضا میں گونجا، فلک نے ہونقوں کی طرح اسے دیکھا۔

''تم واقعی پاگل ہو فلک! میں یہاں تمہاری بات تھوڑی کر رہا ہوں، تم میری دوست ہو، بے فکر ہو جاؤ، مجھے تم سب سے پیاری ہو یار!'' مشارب اس کی معصومیت و نادانی پر مسکرا کر رہ گیا۔

''اچھا بس ہنسو تو نہیں ناں اب''۔ وہ خائف ہوئی، اسے دل میں ٹوکا، اور اپنے دل میں اندر ہی اندر الگ مخاطب ہوئی۔

''میں تو صرف اپنی بات کر رہی ہوں، تم تو میرے دل میں رچ بس گئے ہو، پر خیر میں ہم دونوں کے اقرار سے پہلے تمہیں تمہارے معیار پر پورا اتر کر دکھاؤں گی، یہ میرا وعدہ ہے ڈیئر مشارب شاہ!'' پھر بظاہر نارمل انداز و تاثرات سے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''پھر پڑھائی کب سے اسٹارٹ کرو گی؟'' جبکہ مشارب شاہ نے بات بدل لی تھی۔ فلک بھی سر جھٹک کر اس کی طرف نئے سرے سے متوجہ ہوئی۔

☆

عمر مضطرب سا اس کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ دوست کی دن بدن غیر ہوتی حالت وصدمے میں ڈوبی کیفیات اسے چکرا کر رکھ گئی تھی، لب بھینچے رک کر اسے دیکھنے لگا۔

''تم اپنے ساتھ اچھا نہیں کر رہے ہو؟'' اسے باور کروانے لگا۔

''اچھا برا...... اب میرے اختیار میں نہیں ہے''۔ جبکہ اسے پرواہ ہی نہیں تھی، عجب کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

''نہیں...... تم خود بے اختیار ہونا چاہ رہے ہو''۔ عمر نے اسے ٹوکا۔

''تمہیں میری کیفیت کا اندازہ نہیں ہے اسی لیے ایسی بات کر رہے ہو''۔ علی آیان نے گویا اس کی بات پر افسوس کا اظہار کیا۔

''اندازہ ہے مجھے، پر کیا اب ساری عمر ماتم کرنا ضروری ہے''۔ وہ تلخ ہوا۔

''میں یہاں تمہارے پاس اس لیے نہیں آتا کہ تم ایسی باتوں سے مجھے مزید ٹینس کرو''۔ علی از حد سنجیدہ ہوا۔

''میں تمہیں ٹینس کر رہا ہوں؟ کمال ہے یار! اپنی فکر تو تمہیں ہے نہیں اور اگر کوئی تمہاری بھلائی چاہے تو تم اسے اپنے لیے ٹینشن سمجھ رہے ہو، مگر وہ سب کیا ہے جو تم خود پر سوار کیے ہوئے ہو، روگ لگا کر بیٹھ گئے ہو، ناکامی کے خول میں قید، صرف کرب میں رہے ہو، یہ ٹینشن نہیں ہے کیا؟'' عمر اس کی بات پر ناراض سا طنزیہ بولا۔

''تمہارے خیال میں اس سب میں میری خوشی شامل ہے''۔ علی نے الٹا اس سے سوال کیا۔

''وہ دو ٹکے کی لڑکی تمہیں پاگل کر گئی ہے''۔ جس پر اسے بے تحاشہ غصہ آیا تو بھنا کر بولا۔

''عمر پلیز......! میں اس کے بارے میں کچھ غلط نہیں سننا چاہتا''۔ علی کو عمر کا اور مستبشرہ کو ''دو ٹکے کی لڑکی'' کہنا سخت ناگوار گزرا۔

''آئی ایم شاکڈ علی! تم اب بھی اس کے حق میں ہو، اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود بھی؟'' عمر واقعی حد درجہ متعجب سا اسے استفہامیہ دیکھنے لگا، اسے وہ کیا سمجھتا۔

علی کی دیوانگی...... یا پھر علی کی بے وقوفی......!

کیا ہوتی ہے محبت...... وہ سوچنے پر مجبور ہوا۔

واقعی محبت دیمک کی طرح دماغ کو کھوکھلا کر دیتی ہے، پھر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے نہ سنبھلنے کی راہ نظر آتی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے عشق دماغ کا خلل ہے۔ جسے چاہا جائے اسے من کا دیوتا مان لیتی ہے۔ اس سے برائی، فریب اور دھوکا کھانے کے باوجود بھی لاکھ شکوے کرے، گلے بے حساب کرے، مگر اس کے خلاف ایک لفظ غلط سننے کی روادار نہیں ہوتی۔

ایسا ہی کچھ حال محبت کی اس نہج پر پہنچ کر علی آیان حسن گیلانی کا ہوا تھا جس کا مظاہرہ ابھی اس نے صاف کیا تھا۔ نفرت کا بیج اس کے دل میں جگہ نہیں بنا سکا۔ مستبشرہ جمال کے عمل پر شکوہ کناں ہونے کے باوجود اس کی شان میں گستاخی وہ برداشت نہیں کر سکا۔ شروع میں رب سے بھی اپنے نصیب میں لکھے اس فریب اور ہجر کی سلگتی آگ میں تڑپنے پر گلے کرتا رہا، مستبشرہ جمال کی ذات سے متنفر ہونا چاہا مگر اس کی نس نس میں محبت خون بن کر سرائیت کر چکی تھی۔

(جاری ہے)

☆

سلمیٰ غزل

افسانہ

انساں کو دولت کے ترازو میں نہ تولو



ڈھلتی شام کی اداس فضاؤں میں سورج کی الوداعی کرنیں نیلے آسمان کا منہ چوم رہی تھیں اور افق پر پھیلی سرخی شہیدوں کے خون کی طرح آگ لگا رہی تھی' اندھیرا چاروں طرف پھیلی ہوئی روشنی کو نگل رہا تھا' وہ بلا مقصد ہی کھڑکی سے جھانکتی ہوئی جانے کیا خلا میں تلاش کر رہی تھی تب ہی اسے اپنی پیچھے آہٹ کا گمان ہوا' کاشف شام کے دھندلکوں میں ایک ہیولے کی طرح نظر آ رہا تھا' وہ مضطرب ہو کر بے ساختہ سوئچ بورڈ کی طرف بڑھی اور دودھیا چاندنی ٹیوب لائٹ کی ہر سو پھیل گئی۔

''بھیا! آپ بڑے پریشان لگ رہے ہیں''۔ اس نے اپنی تاثرات چھپاتے ہوئے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ اس نے جواب دیئے بغیر خود کو تھکے ہوئے انداز میں مسہری پر گرا لیا' اس کی پیشانی پر فکر و تردد کا جال سا پھیلا ہوا تھا' آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور ایک ٹانگ اضطرابی طور پر ہل رہی تھی۔

''کاشف بھائی! کچھ تو بولیں آپ کی خاموشی میرے لئے سوہان روح ہے''۔ اریبہ نے بے ساختہ کمرے کی سرد فضا کو توڑا۔

''اب کوئی بات ہو تو بتاؤں......؟'' انہوں نے چونکتے ہوئے انداز میں سر اٹھایا۔

''پھر بھی آپ کچھ کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیں''۔

''کیا بتاؤں امی سے کہنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا ڈر لگ رہا ہے وہ کبھی نہیں مانیں گی''۔ کاشف کے انداز میں بے بسی اور لاچاری تھی۔

''کاش آپ نے عشق کرنے سے پہلے میرے نہ سہی ماں باپ کے جذبات کا ہی احساس کر لیا ہوتا''۔ وہ زیر لب بڑبڑائی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟'' کاشف کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

''میرا مطلب تھا آپ پھپھو کی عادت سے واقف ہیں کم از کم ان سے پوچھ تو لیتے''۔ اس نے بہت کچھ کہنے سے اپنی زبان روک لی۔

''بے وقوف لڑکی! کیا عشق پوچھ کر کیا جاتا ہے''۔ اریبہ کی بات پر اس کا موڈ بحال ہو گیا۔

''تم تو جانتی ہو عروبہ میرے باس کی بیٹی ہے' بے حد خوبصورت' پڑھی لکھی اور رکھ رکھاؤ والی اس نے باہر سے ایم بی اے کیا ہے اور اب باپ کے ساتھ اپنی کمپنی چلا رہی ہے' میں خود اس کی طرف مائل نہیں ہوا بلکہ وہ خود مجھے پسند کرنے لگی اور چونکہ جس سرکل سے اس کا تعلق ہے وہاں لڑکیوں کے پہل کرنے کو برا نہیں سمجھا جاتا اس لئے پیش قدمی خود اس کی طرف سے ہوئی اور ملازمت کی مجبوری کی وجہ سے میں اسے کوئی واضح جواب نہیں دے سکا' مگر رفتہ رفتہ میں اس کی والہانہ چاہت کا عادی ہو گیا' اب تو لگتا ہے میں اس کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا''۔ یہ دیکھے بغیر کہ اریبہ پر اس کے الفاظ برچھی کی طرح دل چیر رہے ہیں وہ بولتا ہی چلا گیا' اریبہ نے حلق میں پھندا لگاتے ہوئے آنسوؤں کو بروقت پیتے ہوئے اپنی نگاہیں آسمان کی وسعتوں کی پنہاں گہرائیوں پر مرکوز کر دیں۔

''اف کاشف بھائی کس طرح آپ ہر مرتبہ اپنے الفاظ کے نشتر سے میرا کلیجہ چھلنی کر دیتے ہیں ہر مرتبہ ایک تازہ زخم دے جاتے ہیں' آپ تو اپنا دل چیر کر مجھے دکھا دیتے ہیں اور میں دل پر جبر کر کے ہر مرتبہ ان زخموں پر اپنے الفاظ کے پھائے رکھ کر آپکے دل کا بوجھ ہلکا کر دیتی ہوں مگر اپنا دل چیر کر کس کو دکھاؤں جہاں ہر طرف آپ ہی کی تصویر براجمان ہے' جس کو دیکھ دیکھ کر میں جیتی ہوں' سانس لیتی ہوں' مگر آپ نے اس تصویر کا چہرہ اپنے الفاظ سے زخمی کر دیا ہے' ہر بار ان زخموں پر نمک چھڑکنے آ جاتے ہیں اور میرا پور پور دکھنے لگتا ہے'

ان دیکھی آگ میں سلگنے لگتا ہے اور چپ کی بکل مار کر میں آپ کی روداد صبر سے سنتی رہتی ہوں''۔ ضبط کرتے کرتے اسے لگنے لگا کہ اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی اس لئے اس نے کمرہ چھوڑنا بہتر سمجھا۔

''کاشف بھیا! میں آپ کے لئے چائے لاتی ہوں''۔ اس نے بمشکل اپنی آواز کو متوازن کرتے ہوئے کہا اور چھپاکے سے کمرے سے نکل آئی' اس کو آکسیجن کی کمی محسوس ہو رہی تھی' دم گھٹ رہا تھا' کچن میں آ کر اس کو خود پر قابو نہیں رہا' اپنی چیخوں کو دوپٹہ منہ میں ٹھونس کر اس نے باہر آنے سے باز رکھا' پورا جسم صدمے اور دکھ سے کپکپا رہا تھا' نل کھول کر اس نے چہرہ اس کے نیچے لگا دیا اور پانی کے ساتھ ساتھ آنسوؤں کا ریلہ بھی بہتا چلا گیا۔



اریبہ دو سال کی تھی جب ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ماں باپ اسے تنہا کر گئے' قریبی رشتہ داروں میں صرف ایک اکلوتی پھپھو تھیں' انہوں نے یوں بے قرار ہو کر اسے سینے سے لگایا کہ اس کو محسوس ہی نہیں ہوا کہ اس کا کتنا بڑا نقصان ہو چکا ہے' پھوپھا نے بھی اپنے اکلوتے بیٹے کاشف سے بڑھ کر اسے چاہا' یوں دونوں نے اسے اتنا پیار دیا کہ اسے زندگی میں کبھی اپنے ماں باپ کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ بچپن سے ہی بے حد زود رنج اور حساس تھی' چھوٹی چھوٹی باتیں اسے گھنٹوں رلاتی' ذرا ذرا سی بات پر آنسو نکل پڑتے' ہچکیاں بندھ جاتیں' ایسے میں پھوپھا اور پھوپھی دونوں پریشان ہو جاتے اور ان کا سارا نزلہ کاشف پر گرتا کہ ضرور اس نے کوئی شرارت کی ہوگی اور اکثر بلاوجہ ہی اسکوڈانٹ پڑ جاتی اور پھر وہ تنہائی میں اریبہ کو خوب ہی ستاتا' اس سے ناراض ہو جاتا' بات چیت بند کر دیتا جو اریبہ کے لئے سوہان روح تھا' وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح پورے گھر میں بولائی بولائی پھرتی' کھانا پینا چھوٹ جاتا اور جب تک کاشف اس سے صلح نہ کر لیتا اس کو چین نہ پڑتا۔



وہ ایسا ہی ایک دن تھا جب وہ لان میں ریکٹ لینے کے لئے اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی' او لیول میں آنے کے بعد بھی اس کا بچپنا نہیں گیا تھا' کاشف بی بی اے کر رہا تھا لیکن اریبہ کو ستانے میں اسے بھی مزہ آتا تھا آخر تنگ آ کر وہ منہ بسورتی ہوئی پھوپھا پھوپھی کے پاس آ گئی۔

''پھپھو! دیکھیں کاشف بھائی میرا ریکٹ مجھے نہیں دے رہے''۔ اس نے منہ بسورتے ہوئے شکایت لگائی۔

''اریبہ بیٹا! اب تم بڑی ہو گئی ہو یوں کاشف کی ساتھ کدکڑے لگاتی اچھی نہیں لگتیں' ذرا دوپٹہ ڈھنگ سے اوڑھا کرو''۔ انہوں نے اس کے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے نرمی سے کہا' اریبہ نے بے ساختہ خود پر نظر ڈالی۔

دوپٹہ کمر پر کسنے سے خدوخال اور نمایاں ہو گئے تھے' اس نے گھبرا کر کاشف کی طرف دیکھا جو شرارت سے اسے گھور رہا تھا' اس نے گھبرا کر دوپٹہ کھول کے شانوں پر پھیلایا' اس کے کانوں میں پھپھو کی کہی ہوئی باتیں گونجنے لگیں جو وہ بچپن سے سنتی آئی تھی مگر کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔

''میری اریبہ' کاشف کی دلہن بنے گی' کاشف! تم اس کو تنگ مت کیا کرو کیونکہ اس سے میرا دوہرا رشتہ ہے بہو اور بھتیجی دونوں کا''۔ اس کا چہرہ پہلی مرتبہ شرم سے گلاب بن گیا' دل کی دھڑکنیں ایک انوکھا راگ الاپنے لگیں' کانوں کی لوئیں تمتما اٹھیں' اس کی پلکیں شرم سے بوجھل ہو کر خود بخود جھک گئیں اور اس نے بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی۔ کاشف کی پرشوق اور وارفتہ نظروں نے اس کا دور تک تعاقب کیا۔

کچی عمر کے خوابوں نے زندگی کو رنگین بنا دیا تھا' آنکھوں میں انجانے جذبے انگڑائیاں لینے لگے تھے' دل کی دنیا کاشف کے تصور سے آباد ہوگئی تھی نوخیز اوراَن چھوئے جذبات اس کے دل کی دھڑکنوں کو ارتعاش بخش رہے تھے' کاشف کہیں چلا جاتا تو اسے سارا گھر بھائیں بھائیں کرتا محسوس ہوتا' اس کو لگتا زندگی کی تمام رونقیں' رعنائیاں اور خوشیاں صرف کاشف کے دم سے ہیں' گرمیوں کی طویل دوپہر میں' سردیوں کی لمبی لمبی راتیں اب صرف کاشف کو سوچتے ہوئے گزر جاتیں' زندگی کس قدر حسین ہوگئی تھی یہ کوئی اریبہ سے پوچھتا' اب تو پڑھنا بھی اس کو مشکل لگنے لگا تھا' اس لئے اے لیول کی جگہ اس نے انٹر کے لئے کالج میں داخلہ لے لیا تھا' پھپھو کا ارادہ تھا جیسے ہی وہ گریجویشن کرے گی وہ اس کی شادی کردیں گی' کاشف سی اے کرنے کے بعد اپنی ملازمت میں بے حد مصروف ہوگیا تھا اور اکثر اسے شہر سے باہر بھی جانا پڑتا' کبھی پنڈی' کبھی لاہور تو کبھی اسلام آباد اور ان دو چار دنوں میں ہی اس کی بے قراری حد سے سوا ہو جاتی' پھپھو اور پھوپھا اسے چھیڑنے سے باز نہیں آتے' وہ اس کے بہترین دوست تھے' اس کی رگ رگ سے واقف۔ وہ سارے گھر میں بولائی بولائی پھرتی کسی پل قرار نہ آتا' اس کی بے قراری پر پھپھو اسے خوب چھیڑتیں اور وہ شرم سے سرخ پڑ جاتی' ان کی چھیڑ خانی اس کو اچھی لگتی' اس کا دل کرتا ہر دم پھپھو' کاشف کی باتیں کرتی رہیں' کاشف ٹور سے واپس آئے تو لگتا گھر کا گوشہ گوشہ جگمگا اٹھا ہو' گو کالج سے آنے کے بعد اس کو سونے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہوتا تھا' لیکن کاشف کی آمد پر وہ خصوصیت سے اس کی پسند کی کٹلٹس' پاستا اور شاہی ٹکڑے بناتی' پھپھو اور پھوپھا کاشف سے اس کی والہانہ محبت کو خوب انجوائے کرتے' پھوپھا کی تو اس میں جان تھی کبھی تو اس کو ایسا لگتا پھوپھا کاشف سے بھی زیادہ اس کو پیار کرتے ہیں' اس کا یقین تھا اگر اس کے والدین بھی زندہ ہوتے تو شاید ان دونوں سے زیادہ اس سے محبت نہ کرتے' کاشف اپنی واپسی پر والدین کے علاوہ اریبہ کے لئے بھی ڈھیروں ڈھیر تحائف لاتا۔



اس مرتبہ کاشف اسلام آباد سے لوٹ کر آیا تو جیسے ساری شوخیاں وشرارتیں کہیں بھول آیا ہو' اس کا شوق وچنچل پن کہیں کھو گیا تھا' اس کے چہرے پر مسرت کے بجائے بے زاری تھی وہ کچھ الجھا الجھا بے چین تھا' پیشانی پر پڑنے والے بل دیکھ کر اریبہ کا دل ڈوبنے لگا اس کو اندازہ نہیں تھا کہ دھیرے دھیرے چمن میں خزاں کا تسلط ہوا جارہا ہے' اس کی آنکھیں ہمہ وقت سوچ میں ڈوبی رہتیں' پھپھو کچھ محسوس نہ کرتیں ان کے لئے یہی کافی تھا کہ اریبہ ان کے بیٹے کی دیوانی ہے وہ یہ سوچ سوچ کر کہ نہال ہوتی رہتیں کہ اریبہ کے بی اے کرنے میں اب چند ہی دن رہ گئے ہیں اور وہ اریبہ کو اپنی بیٹی سے بہو بنالیں گی' آخر ایک دن تنگ آ کر اریبہ نے پوچھ ہی لیا۔

''کاشف بھائی! آخر آپ کو کیا ہوا ہے بہت چپ چپ ہیں''۔ اسے چائے کی پیالی پکڑاتے ہوئے اس نے بے تابی سے پوچھا مگر وہاں ایک گہری اور جامد خاموشی تھی۔

''اریبہ! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں''۔ وہ جھجکتے ہوئے گویا ہوئے۔

''ہاں تو کہئے میں تو کب سے منتظر تھی کہ آپ اپنا مسئلہ مجھ سے ضرور شیئر کریں گے''۔ اریبہ خوش ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''اریبہ......'' وہ ہچکچا کر بولے۔

''میں شادی کرنا چاہتا ہوں''۔

''اف......'' اریبہ کی آنکھیں شرم سے بوجھل ہو گئیں اس کے لئے سر اٹھانا مشکل ہوگیا وہ اٹھ کر بھاگنا چاہتی تھی مگر قدم جیسے پتھر کے ہوگئے ہوں' اس کی دل کی دھڑکنیں لگتا تھا کان پھاڑ دیں گی وہ آگے کچھ سننے کی منتظر تھی۔

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے''۔ انہوں نے التجا کی اور اریبہ کو دل ہی دل میں ہنسی آنے لگی۔

''کس قدر معصوم ہیں کاشف بھائی جو بات پھپھو سے کرنا چاہئے وہ مجھ سے کررہے ہیں''۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو کاشف کی نظریں غیر مرئی نکتے پر مرکوز تھیں۔

''وہ میرے باس کی اکلوتی بیٹی ہے جس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں''۔ اریبہ نے بے ساختہ سر اٹھایا وہ سکتے اور بے یقینی کے عالم میں کاشف کو گھورنے لگی اس کے کانوں نے شاید غلط سن لیا تھا۔

''جواب دو میرا ساتھ دوگی نا......؟'' وہ جھنجھلا کر بولے اریبہ نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا اور دل کی دھڑکنوں کو قابو کیا اس کی آواز کا کھوکھلا پن نمایاں تھا۔

''میں کیا کروں......؟'' اس کو اپنی ہی آواز اجنبی لگی۔

''بھئی امی کو راضی کرو وہ ہرگز نہیں مانیں گی جبکہ یہ میرے مستقبل کا سوال ہے' عروبہ کمپنی کے مالک کی اکلوتی بیٹی ہے اور ساری جائیداد کی تنہا وارث' اس کے والد نے خود مجھے داماد بنانے کی آفر کی ہے مگر میں ابو امی کی وجہ سے اب تک کوئی پوزیٹو جواب نہیں دے سکا' مجھے معلوم ہے امی ابو مجھ سے بھی زیادہ تم سے محبت کرتے ہیں تمہاری سنتے ہیں' تمہیں مانتے ہیں وہ تمہاری بات ٹال ہی نہیں سکتے' تم کہو گی تو وہ یقیناً مان جائیں گے''۔ اس نے اریبہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر التجا کی۔

''ضرور مانیں گے آپ بے فکر رہیں''۔ اس نے سہولت سے اپنے ہاتھ چھڑائے اور پھیکی ہنسی چہرے پر لاتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئی۔ اس کو اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا' قدم ڈگمگانے لگے اس کو لگتا تھا وہ چکرا کر کہیں گر جائیں گی' غنیمت تھا کہ پھوپھا پھپھو کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے اور گھر میں بوا کے سوا کوئی نہ تھا وہ لرزتی کانپتی اپنے کمرے میں آئی اور کمرہ بند کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کیا ان کو میرے جذبات کا کوئی احساس نہیں......؟ کوئی قدر نہیں......؟ ان کا وہ والہانہ پن وہ چاہت وہ محبت...... کیا پانی کا بلبلہ تھی' جو دولت کی چمک نے یکلخت صفحہ ہستی سے مٹا دی......؟ بچپن سے جو کچھ میں سنتی رہی جو کچھ محسوس کرتی رہی کیا وہ غلط تھا......؟'' وہ گھٹنوں میں سر دے کر بری طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

اس کے لبوں پر مسکراہٹ کے چشمے خشک ہوگئے' ہونٹوں پر خاموشی کے قفل لگ گئے' اس کی روح ضبط کی تاب نہ لا کر چیخ اٹھی' رات کی تنہائیوں میں اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا' آنکھیں سوج جاتیں اور دل اتنا بھاری کہ بوجھ سنبھالتے ڈوبنے لگتا' پھپھو اس کی اتری ہوئی شکل دیکھ کر پریشان ہو جاتیں' پھوپھا ہیرا پھیری سے اس کی خاموشی کا سبب پوچھتے' پھپھو کو اس کی روتی بسورتی شکل دیکھ کر واہمے ستانے لگتے' چہچہاتی بلبل کے نغمے سراب کے عذاب میں گم ہوگئے تھے' ایک ایک کر کے سارے امید کے ستارے بجھ گئے' چاند ڈوب گیا' کچھ ایسے درد جاگے جن کی ٹیسیں ناقابل برداشت ہوگئیں اور پھر کاشف نے دھماکا کردیا' گھر میں بھونچال سا آ گیا' پھوپھا پھپھو کے لئے کاشف کی بات ماننا ناممکن تھا' ان کے لئے کاشف کی خواہش چاند کو ہتھیلی پر سجانے کے مترادف تھی' کاشف نے ان کا

مان توڑا تھا اور اریبہ کے سامنے انہیں شرمندہ کردیا تھا' لمحے میں ان کی آرزوؤں' ارمانوں اور تمناؤں کا خون کردیا تھا۔

انہوں نے بچپن سے اریبہ کو اپنی بہو کے روپ میں دیکھا تھا اور اریبہ کی نس نس میں کاشف کی محبت خون کی طرح دوڑ رہی تھی اور کاشف نے اس کے خوابوں پر اپنی خواہشات اور لالچ کے مینار سجا کر انہیں بھیانک تعبیر دی تھی' دونوں نے بری طرح کاشف کو لتاڑا مگر پھوپھا کا دھاڑنا اور پھپھو کا رونا' چلانا کچھ بھی کاشف کو اس کے ارادے سے باز نہ رکھ سکا لیکن اریبہ نے دل پر پتھر رکھ کر اور اپنی جان کی قسم دے کر دونوں کو منا ہی لیا' یوں بھی وہ کاشف کی ماں تھیں اس کا رونا' گڑگڑانا اور التجائیں کرنا ماں کو موم کر گیا' ممتا بھتیجی کی محبت پر غالب آگئی اور پھر وہ پہلے کاشف کی ماں تھیں' اس کی خوشی انہیں عزیز تھی' کاشف کے اصرار اور اریبہ کے مجبور کرنے پر وہ کاشف کا رشتہ مانگنے اسلام آباد چلی گئیں لیکن پھوپھا نے جانے سے صاف انکار کردیا بلکہ کاشف کے لئے انہوں نے گھر کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کردیئے پھپھو نے منانے کی کوشش کی تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا' وہ چاہیں تو خود بھی کاشف کے ساتھ چلی جائیں ہمیشہ کے لئے' وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ساری عمر گزار دیں گے لیکن اس نانہجار اور ناخلف کا منہ نہیں دیکھیں گے؟ اریبہ بری طرح بکھر گئی اور پھوپھا کی شفقت بھری گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆

حالات سے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے پھوپھا' پھپھو کے منع کرنے کے باوجود اس نے ایک نزدیکی اسکول جوائن کرلیا' یہ ڈیفنس کا بڑا مشہور انگلش میڈیم اسکول تھا اسی دوران اسے معلوم ہوا وہ ستمگر اپنی بیوی کے ساتھ ہنی مون منانے یورپ گیا ہے' زندگی بظاہر پرسکون ہوگئی اس نے حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا' پھوپھا پھپھو کے اصرار کے باوجود آنے والے رشتوں کے لئے اس کی ناں ہاں میں نہیں بدل سکی' اس کی تنخواہ کا بیشتر حصہ فلاحی کاموں پر اٹھ جاتا تھا' دیکھتے ہی دیکھتے پانچ سال گزر گئے اور اپنی بہترین کارکردگی اور قابلیت کی وجہ سے اسے اسکول کی پرنسپل کا شرف حاصل ہوگیا' زندگی کچھ اور مصروف ہوگئی' پھوپھا پھپھو کے ساتھ 3 کمروں کے فلیٹ میں وہ اکیلی رہ گئی تھی' دونوں کافی بوڑھے ہوگئے تھے' وہ ان کا بے حد خیال رکھتی ان سے باتیں کرتی سردیوں کی لمبی اور سرد راتوں میں ان کے لئے گرم گرم کافی بناتی اور صبح صبح چائے بنا کر پلاتی اور اسکول سے آکر انہیں اخبار پڑھ کر سناتی دونوں اسے دعائیں دیتے نہ تھکتے' یقیناً کاشف کو یاد کرتے ہوں گے جو ان کی اکلوتی اولاد تھا مگر انہوں نے کبھی اریبہ کے سامنے کاشف کا نام نہیں لیا۔

☆

اس دن وہ اپنے آفس میں مصروف تھی جب ایک ٹیچر نے آکر بتایا کہ بسمہ KG-II کی بچی سیڑھیوں سے سلپ ہوگئی ہے' بچی کو دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی چوٹ تو معمولی تھی لیکن بچی سہم گئی تھی' اریبہ کی عادت تھی ہر کلاس ٹیچر سے فرداً فرداً بچوں کی رپورٹس لیتی رہتی تھی اور یہ بچی ہر سال فرسٹ آنے اور غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے بے حد ہر دلعزیز تھی' اس بچی کی ایک اور خاصیت اس میں بچپن کا نہ ہونا تھا نہ شوخی' نہ شرارت' سارا وقت کلاس میں خاموش گم صم بیٹھی رہتی تھی' ہاف ٹائم میں بھی اس کا بیشتر وقت کلاس میں ہی گزرتا تھا' اس میں بچوں والی کوئی بات نہ تھی' اریبہ نے پیار سے اس کو اپنے پاس بٹھالیا اور ابتدائی ٹریٹمنٹ دینے کے بعد بہتر سمجھا کہ اس کی امی کو بلائے' گھر سے جب کسی نے فون نہیں اٹھایا تو

اس نے سیل فون پر نمبر ملانے کی کوشش کی پھر میسج چھوڑا تب ایک گھنٹے بعد اس کے والد تشریف لائے باوقار سوبر سے' ان کی شکل دیکھ کر اریبہ کو غصہ آگیا۔

''صبح سے میں نمبر ملانے کی کوشش کررہی ہوں آپ لوگوں کو احساس ہی نہیں ہے اب تشریف لائے ہیں''۔

''سوری مس''۔ وہ اپنی بچی کو بری طرح پیار کرتے ہوئے معذرت کرتے ہوئے بولے۔

''ایکچولی میں میٹنگ میں تھا اور موبائل سائلنٹ پر اس لئے بروقت نہ آسکا''۔

''تو آپ اس کی امی کو بھیج دیتے''۔ اریبہ ان کے معذرت خواہانہ انداز پر ڈھیلی پڑگئی۔

''اس کی امی نہیں ہیں''۔ جواب بڑا مختصر تھا لیکن اریبہ کا دل دکھوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا' وہ خود بھی ماں باپ کی محبت سے محروم رہی تھی گو پھوپھا پھپھو نے کبھی ماں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی مگر کبھی کبھی اس کو دل کا ایک گوشہ خالی خالی اور ویران سا لگتا تھا۔ جب سے اریبہ کو بسمہ کے بارے میں معلوم ہوا تھا وہ اس کی خصوصی توجہ کا مرکز ہوگئی تھی پھر اس کے والد نے بھی خاص طور پر اس کا خیال رکھنے کی درخواست کی تھی۔

☆

جب سے اریبہ کو بسمہ کی ماں سے محرومی کا معلوم ہوا تھا وہ اس کا بے حد خیال رکھنے لگی تھی' اس کی خواہش تھی کہ وہ عام بچوں کی طرح ہنسے' بولے' شرارتیں اور ضدیں کرے اور کھیل کود میں بھرپور حصہ لے' اس کے لئے اکثر جب تک اس کی وین نہ آجاتی وہ اسے اپنے پاس آفس میں بٹھا کر اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہتی تھی' تمام اسٹاف کی وہ منظور نظر تھی اور سب کو معلوم تھا کہ وہ بن ماں کی بچی ہے' اریبہ کی کوششوں سے بسمہ نے ایک نارمل بچی کی طرح بی ہیو کرنا شروع کردیا تھا جس پر اس کے والد اکثر فون پر شکریہ ادا کرتے رہتے تھے۔

وہ ایک ایسا ہی خوشگوار دن تھا جب اس کی کلاس ٹیچر نے بتایا کہ بسمہ چار دن سے نہیں آرہی اور اس کے بارے میں کوئی اطلاع بھی نہیں ہے' اریبہ پریشان ہوگئی کیونکہ یہ اسکول ڈسپلن کے خلاف تھا اس نے موبائل پر فون کیا تو پتہ چلا بسمہ کو ٹائی فائیڈ ہوگیا ہے' اتنے دن اس کا خیال رکھتے رکھتے اریبہ کو اس بچی سے ایک لگاؤ اور انسیت سی ہوگئی تھی۔

''مس! بسمہ آپ سے اس قدر اٹیچ ہوگئی ہے کہ آپ یقین کریں تین دن سے بخار میں بھی اسکول جانے کی ضد کررہی ہے صرف آپ کی وجہ سے''۔ اس کے والد نے نہایت سنجیدگی سے جب فون پر انکشاف کیا تو اریبہ اپنی جگہ پر ہل کر رہ گئی۔

''آریان صاحب! مجھے بے حد افسوس ہے میرا مقصد اس کو زندگی کی خوشیوں کی طرف واپس لانا تھا نہ کہ خود سے اٹیچ کرنا' میں کسی دن وقت نکال کر بسمہ کو دیکھنے آؤں گی''۔ جب انہوں نے ایڈریس بتایا تو وہ خوش ہوگئی وہ تو ان کے گھر سے بہت قریب اپارٹمنٹ تھا۔

شام کو جب اس نے پھپھو سے ساتھ چلنے کو کہا تو وہ معذرت کرتے ہوئے بولیں۔

''بیٹا! تم جانتی ہو گھٹنوں کی تکلیف نے مجھے آنے جانے سے معذور کردیا ہے اور پھر یہ موئے فلیٹ تو آسمان کی بلندیوں پر جاتے ہیں لفٹ سے مجھے ڈر لگتا ہے اور سیڑھیاں میں چڑھ نہیں سکتی' تم اپنی شاگرد کو دیکھ آؤ اور ساتھ اپنے پھوپھا کو لے جاؤ''۔ پھوپھا اپنے دوست کے گھر گئے ہوئے تھے اس نے تنہا جانے کا ہی فیصلہ کرلیا' کونسی وہ کم عمر یا چھیل چھبیلی تھی عمر کے 31 سال گزار چکی تھی' یہ اپارٹمنٹ مین روڈ پر ہی تھا اور بسمہ فرسٹ فلور پر رہتی تھی اس لئے اس نے لفٹ کی جگہ سیڑھیوں کو ترجیح دی' اس کو خوشگوار سی خوشی ہوئی' بسمہ کے ابو

سیڑھیوں سے اوپر جاتے ہوئے مل گئے' وہ اسے دیکھ کر خوش دلی سے اپنے اپارٹمنٹ میں اندر لے آئے' بسمہ آیا سے ضدیں کر رہی تھی اریبہ کو دیکھ کر اس نے ایک زوردار چیخ ماری اور اریبہ کی بانہوں میں سما گئی۔

''میڈم! میں آپ کو بہت یاد کر رہی تھی روز ڈیڈی سے کہتی تھی مجھے اسکول جانے دیں یا میری میڈم کو بلالیں''۔

''دیکھیں آپ نے یاد کیا اور میں آ گئی اب جلدی سے تندرست ہوجائیے سارا اسکول آپ کو یاد کر رہا ہے''۔ جتنی دیر اریبہ بیٹھی رہی بسمہ اس کے ساتھ لگی رہی' بمشکل دوسرے دن بھی آنے کے وعدہ پر وہ اسے چھوڑنے پر تیار ہوئی۔

بسمہ کے ابو آریان صاحب ایک دن جب خود اس کو بسمہ سے ملوانے اس کے گھر لے کر آئے تو پھوپھا بھی ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے' پروقار اور سنجیدہ' وقت اور حالات نے انہیں وقت سے پہلے بردبار بنا دیا تھا' بیوی کی موت نے انہیں بالکل تنہا کر دیا تھا' بسمہ ان کا جینے کا آسرا تھی' بسمہ میں ان کی جان تھی۔ وہ تمام گھر والوں سے کافی بے تکلف اور مانوس ہوگئے تھے اور اکثر جب رات کو انہیں کہیں جانا ہوتا تو وہ بسمہ کو اریبہ کے گھر ہی چھوڑ جاتے تھے' بسمہ کا اب اپنے گھر سے زیادہ اریبہ کے گھر دل لگنے لگا تھا۔ ایک دن جب اس نے پھوپھا اور پھپھو کو دادو اور دادا کہہ کر مخاطب کیا تو خوشی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''یہ کیا بات ہوئی' وہ میرے امی ابو ہیں اس لحاظ سے تمہیں نانا اور نانو کہنا چاہئے''۔ وہ بگڑ کر بسمہ سے بولی جس میں اس کے لئے بے تحاشہ پیار اور محبت تھی۔

''واہ واہ! میڈم آپ خود بھی تو انہیں ابو امی نہیں کہتیں اس لئے ابو نے کہا تھا تم دادو اور دادا کہا کرو کیونکہ وہ میرے امی ابو ہیں''۔ اریبہ سناٹے میں آ گئی پھوپھا پھوپھی کا چہرہ فق ہو گیا تھا' پورا وجود دکھوں اور تنہائیوں کی آماجگاہ لگ رہا تھا دس سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا اور ماں باپ کے لئے تو اولاد کتنی بھی نالائق ہو محبت کا محور ہی رہتی ہے اور اس کی آمد کے لئے دل کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور سینہ اس کی یادوں سے ہمیشہ آباد رہتا ہے' کاشف بے شک اپنی رنگین دنیا میں مصروف ہو گیا لیکن ماں باپ کی دنیا تو ویران تھی' شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپا لینے سے طوفان رک تو نہیں جاتے...... آہوں اور آنسوؤں کا طوفان ہمہ وقت ان کو اپنے حصار میں رکھتا تھا' کبھی کبھی اریبہ بھی اپنی جگہ چور بن جاتی تھی اس کی وجہ سے انہوں نے یہ جدائی کا غم سہا تھا لیکن قصوروار تو وہ بھی نہیں تھی۔

☆

آج کل اریبہ عجیب طرح کی یاسیت کا شکار تھی اس کے چاروں طرف اسٹاف زیادہ تر میرڈ تھا اور جو غیر شادہ شدہ تھیں اکثر کسی نہ کسی کا شادی کا دعوت نامہ آ ہی جاتا تھا پھر شادی کے بعد وہ ٹیچر جب جوائن کرتی تھی تو اس کی چھب' اس کی خوشیاں اور شرارتیں اور لبوں سے پھوٹتی مسکراہٹ اور انگ انگ سے چھلکتی مستی' ان کو کسی اور دنیا کی مخلوق بنا دیتی تھیں' اریبہ دیکھتی تو اس کو اپنی ویران زندگی کا احساس زیادہ ہونے لگا' ان خوشیوں پر اس کا بھی حق تھا' چاہے جانے کی وہ بھی مستحق تھی' بننا' سجنا اور سنورنا اس کا بھی حق بنتا تھا' اس کا بھی دل چاہتا تھا زندگی سے ہر لمحے اپنے لئے خوشیاں اور مسکراہٹیں کشید کرے' مگر ایک شخص کے نہ ہونے سے ساری دنیا ویران ہو گئی تھی' تتلی کے سارے رنگ اڑ گئے تھے' زندگی بے آب گیاہ صحرا کی طرح ہو گئی تھی' وہ کیا کرتی اچھے اچھے رشتے ٹھکرا کر اس نے خود پر خوشیوں اور مسرتوں کے دروازے بند کردیئے

تھے' مگر بسمہ کی آمد اس کے لئے ایک تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی تھی اس کا دل چاہتا تھا کہ کہے۔

''بسمہ مجھے دے دو''۔ مگر کیسے کہتی بسمہ میں تو ان کی جان تھی' اسی کشمکش اور ذہنی دباؤ نے اس کو بیمار کر دیا' جونہی بسمہ کے ذریعے آریان کو پتہ چلا وہ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گئے' پھوپھا پھپھو پڑوس میں کسی کی عیادت کے لئے گئے ہوئے تھے' بسمہ تو فوراً کارٹون دیکھنے بیٹھ گئی اور آریان نے اریبہ کی کلاس لے لی۔

''اریبہ! میں آپ سے بہت ناراض ہوں بالکل اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتیں کسی اور کے لئے نہ صحیح بسمہ کی خاطر ہی خود کی فکر کر لیا کریں''۔ آج آریان کا لہجہ اور انداز دونوں ہی بدلے ہوئے تھے۔

''بہت دن سے ایک بات آپ سے کرنے کی سوچ رہا تھا مگر ہمت نہیں پڑ رہی تھی اگر اجازت ہو تو کہہ دوں''۔ وہ جھجکتے ہوئے گویا ہوئے۔

''آریان صاحب! آپ بسمہ کے ابو ہونے کے علاوہ میرے لئے بھی قابل احترام ہیں ایسی کیا خاص بات ہے جس کے لئے آپ کو میری اجازت کی ضرورت پڑ گئی......؟'' اریبہ نے حیرت سے کہا۔

''آپ جانتی ہیں بسمہ کی امی میری بیوی ہی نہیں اولین چاہت بھی تھیں اور اپنے بعد میں نے تاعمر تنہا رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا' مگر اس فیصلے کی دیوار میں دراڑیں پڑ گئی ہیں' میں اپنے فیصلے میں ثابت قدم رہنے میں مشکل محسوس کر رہا ہوں' آپ کی محبت' رکھ رکھاؤ اور اپنائیت نے میرے دل و دماغ کی دنیا کو بدل دیا ہے' بسمہ الگ ہر روز ضد کرتی ہے کہ یا تو آپ اریبہ میڈم کے گھر چل کر رہیں یا پھر انہیں اپنے گھر بلالیں' مجھے اس کی دوسری بات صحیح لگتی ہے اگر آپ اجازت دیں تو مگر یہ ذہن میں ضرور رکھئے گا میں یہ سب خلوص نیت اور اپنی تمام چاہتوں اور محبت کی حدتوں سے مجبور ہو کر کہہ رہا ہوں' آپ کو فیصلہ کرنے کا پورا پورا حق ہے کیونکہ بہرحال میں ایک بچی کا باپ تو ہوں اور آپ کنواری...... اور آپ کا جو بھی فیصلہ ہوگا ہمارے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آئے گا' میں پہلے بھی آپ کا احترام کرتا تھا پھر بھی کرتا رہوں گا اور آپ کے گھرانے سے تعلقات اسی طرح استوار رہیں گے جیسے پہلے تھے''۔ اریبہ سناٹے میں آ گئی عمر کے اس حصے میں کوئی اس کا طلب گار تھا' جب آرزوئیں تمنائیں اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر اسے کھوکھلا کر چکی تھیں کمرے میں خاموشی کا راج تھا' دونوں اپنی اپنی جگہ سوچوں کی عمیق گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے تھے جب اچانک بسمہ کی آمد نے اس سکوت کو توڑا۔

''میڈم روز تو میں آپ کے گھر آتی ہوں آج آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا بلکہ میرے بیڈ روم میں سونا ہوگا''۔

''تمہارا کون سا بیڈ روم ہے بھئی وہ تو میرا کمرہ ہے''۔ آریان نے شرارت سے کہا۔

''جی نہیں وہ میرا کمرہ ہے اور میرا بیڈ اتنا بڑا ہے کہ ہم تینوں اس پر آرام سے سو سکتے ہیں' ایک طرف آپ' ایک طرف میڈم' بیچ میں میں''۔ اس نے خوشی سے اچھلتے ہوئے جب نقشہ کھینچا تو آریان تو ہنسنے لگے مگر اریبہ کو بے تحاشہ شرم آئی۔

''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ کے پھوپھا پھپھو سے بات کروں......؟'' اریبہ نے کچھ نہ کہتے ہوئے چادر میں مسکرا کر منہ چھپا لیا۔

☆

آج کل اریبہ بہت خوش رہنے لگی تھی ہنسی تو جیسے اس کے ہونٹوں سے پھوٹی پڑتی تھی' چہرے پر ایک عجیب نکھار سا آ گیا تھا' سب سے پہلے یہ تبدیلی پھوپھا نے محسوس کی اور ایک دن اس کو جا لیا۔

''بیٹا! آج کل تم بہت خوش نظر آ رہی ہو کوئی خاص بات ہے......؟'' انہوں نے گہری نظر سے اس

کا جائزہ لیتے ہوئے پیار سے پوچھا اریبہ کو شرم اور صدمے نے یکدم گھیر لیا۔ کاش اس کی کوئی بہن ہوتی جس سے وہ یہ خوشی شیئر کر سکتی اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''بیٹا! میں تمہارا ہم عمر نہیں مگر باپ جیسا دوست تو ہوں' اس خوشی کا نام کہیں ''آریان'' تو نہیں''۔ انہوں نے شرارت سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر کہا' ان کے اندازے کی درستگی پر اریبہ حیران ہو گئی اور اس نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

''مجھے خوشی ہے میری بیٹی تم نے سوچ سمجھ کر صحیح فیصلہ کر لیا' ہم دونوں میاں بیوی یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتے رہتے تھے کہ ہمارے بعد تمہارا کیا ہو گا؟ یہ پہاڑ جیسی زندگی تنہا کیسے گزارو گی' قربانی اس کے لئے دی جاتی ہے جس کو قربانی دینے والے کی قدر ہو احساس ہو اس کی فکر ہو' یہاں تو یہ حال ہے کہ اس نالائق کو ماں باپ کی بھی فکر نہیں' تمہارے بارے میں جب نہیں سوچا تو اب کیا سوچے گا''۔ وہ ذرا دیر کو خاموش ہوئے پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے بولے۔

''آریان میاں نے میرے اور تمہاری پھپھو کے سامنے رشتے کی بات کی تھی ہم نے سوچنے کے لئے وقت مانگا تھا کہ تم سے پوچھنا بھی ضروری تھا اب ہمیں جواب مل گیا ہے ہم انہیں ہاں کہہ دیں گے' ہمیں خوشی ہے کہ تم نے صحیح فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی' تم آریان کے ساتھ ہمیشہ خوش رہو گی''۔ آریان ایک ہفتے کے لئے ضروری کام سے اسلام آباد گئے ہوئے تھے اور بسمہ آج کل اریبہ کے پاس تھی اور اس کے ساتھ اسکول آتی جاتی تھی' آریان کی پھوپھا پھپھو سے کیا بات ہوئی یہ تو اسے معلوم نہ تھا مگر ان کی باتوں سے لگتا تھا کہ انہوں نے آریان کو ہاں کر دی ہے وہ بہت خوش تھی اور بسمہ سے اس کی چاہت اور محبت میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا اس دن بھی جب وہ ہنستی مسکراتی بسمہ کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو گھر میں غیر معمولی شور تھا ورنہ عموماً یہاں سناٹوں کا راج رہتا تھا مگر آج پھپھو اور پھوپھا کی زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں باہر تک آ رہی تھیں' وہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو جیسے زمین نے قدموں کو جکڑ لیا ہو' اس کے لئے آگے بڑھنا مشکل ہو گیا' کاشف اپنی تمام تر وجاہتوں کے ساتھ موجود تھا' لگتا تھا دس سال کا عرصہ اسے چھو کر بھی نہ گزرا ہو وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت اور اسمارٹ ہو گیا تھا۔

''کیسی ہو اریبہ......؟'' اس نے خود خاموشی کو توڑا۔

''ٹھیک ہوں آپ سنایئے کیسے رہے اور ہماری بھابی کہاں ہیں......؟'' اس نے نارمل طریقے سے پوچھا۔

''ارے اس سے کیا پوچھتی ہو مجھ سے پوچھو''۔ پھپھو چہک کر بولیں۔

''دس سال میں اس کلموہی نے اپنے رنگ دکھا دیئے وہ سمجھتی تھی دولت کے بل بوتے پر میرے بیٹے کو خرید لے گی' وہ آزاد ماحول کی پروردہ' کب تک کاشف اس کی بے حیائی برداشت کرتا' اس کو تو بچے بھی پسند نہیں تھے' میرا بچہ اولاد کے لئے ترستا رہا مگر وہ نہ بدلی کیا کرتا طلاق دے آیا اسے''۔ اریبہ کو شدید جھٹکا لگا' پھپھو اولاد کی محبت میں سب کچھ بھلا بیٹھی تھیں' کاشف کی بے اعتنائی' اس کی خود غرضی' لالچ اور اس کی مطلب پرستی' اس نے پھوپھا کی طرف دیکھا ان کے چہرے پر عجیب بے بسی اور پشیمانی تھی' دو چار دن میں ہی اریبہ کو اپنے ہی گھر کا ماحول اجنبی

لگنے لگا' آج کل پھپھو کا زیادہ تر وقت کاشف کی تعریفوں میں گزرتا تھا۔

''کاشف نے بہت بڑا بنگلہ خرید لیا ہے اس نے اپنی کمپنی کھول لی ہے''۔ ایک دن تو حد ہو گئی جب انہوں نے اریبہ سے کہا۔

بیٹی! اب تم یہ نوکری چھوڑ دو' ماشاء اللہ کاشف کے ہوتے ہوئے اب تمہیں نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے اور نہ بسوں میں سفر کرنے کی' کاشف کل ہی کہہ رہا تھا وہ تمہارے لئے ایک علیحدہ گاڑی لے دے گا ڈرائیور کے ساتھ جایا کرنا' بڑی تکلیفیں اٹھا لیں میری بچی نے' اب عیش کے دن آئے ہیں جلد ہی ہم نئے بنگلے میں شفٹ ہو جائیں گے''۔ وہ جوش میں اس تیزی سے بول رہی تھیں کہ انہیں اریبہ کے چہرے کے بگڑتے ہوئے زاویے اور پھوپھا کی خشونت بھری نگاہیں بھی نظر نہ آئیں۔

''اب تم اپنی بکواس کر چکی ہو تو کان کھول کر سن لو' تم جانا چاہو تو ضرور جاؤ مگر میں اور میری بیٹی کہیں نہیں جائیں گے' تم بھول سکتی ہو مگر میں نہیں اور نہ اس کی دولت سے میری آنکھیں چندھیا سکتی ہیں کہ کس طرح وہ ہماری اور ہماری بیٹی کے ارمانوں کو روندتا ہوا اپنی خواہشات اور آرزوؤں کا محل دولت کے بل بوتے پر تعمیر کرنے چلا گیا تھا' اب جب وہاں سے دھتکارا گیا تو دم ہلاتا ہوا واپس اس در پر آ گیا ہے میں نے تمہاری خاطر اسے گھر میں برداشت کر لیا اسی کو غنیمت سمجھو''۔ پھوپھا کے لہجے میں ایسی گھن گرج تھی کہ پھپھو کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا اور اریبہ کی روح اندر تک پرسکون ہو گئی۔

☆

آریان جب بھی آتے بڑی گرمجوشی سے کاشف سے ملتے تھے لیکن انہیں دیکھتے ہی اس کا منہ بن جاتا تھا۔

''آخر یہ کس حیثیت سے اس گھر میں آتا ہے مجھے بالکل پسند نہیں اس کا اس سے بے تکلفی سے آنا جانا اور اریبہ سے بے تکلف ہونا''۔ آخر ایک دن وہ غصے سے پھٹ پڑا' اریبہ اپنے اسکول گئی ہوئی تھی۔

''بیٹا! وہ اریبہ کا طلب گار ہے''۔ پھپھو جھجکتے ہوئے بولیں۔

''کیا ہو گیا ہے امی! آپ کو؟ وہ ٹٹ پونجیا ایک بچی کا باپ......کیا دے سکتا ہے اریبہ کو......؟ آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے' اب تو میں آ گیا ہوں میں اپنی غلطیوں کا ازالہ کروں گا اریبہ کو ہر وہ خوشی دوں گا جس سے اسے میں نے محروم کیا تھا' میں بعد میں بہت پچھتایا' مجھے دولت تو ملی لیکن دل کا سکون نہ مل سکا' ہر قدم پر میں نے اریبہ کو یاد کیا' سچ پوچھیں تو آج بھی میں اپنی زندگی میں اریبہ کی کمی محسوس کرتا ہوں امی''۔ آخر میں اس کا لہجہ التجائیہ ہو گیا۔

''مجھے لگتا ہے اریبہ مجھ سے اب تک ناراض ہے وہ مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی' پلیز اس کو منانے میں میری مدد کریں اور اس آریان کی آمد و رفت بند کریں' اس کو اریبہ کے ساتھ دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے کسی دن میں کچھ کر بیٹھوں گا''۔

''دیکھو بیٹا! وہ کوئی اب بچی نہیں ہے کہ میں جدھر چاہوں موڑ لوں' میں سمجھانے کی کوشش کروں گی لیکن یہ جنگ تمہیں خود جیتنی ہو گی کیسے اور کس طرح تم جانو' ویسے میں اس کا دل تمہاری طرف سے صاف کرنے کی کوشش ضرور کروں گی' کیونکہ تمہاری خوشی مجھے آج بھی عزیز ہے''۔

☆

اریبہ آج کل بہت پریشان تھی کاشف کا التفات دن بدن بڑھتا ہی جا رہا تھا وہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی کہ کیسے اس بڑھتے ہوئے طوفان کو

روکے......؟ وہ شام کو کاپیاں چیک کر رہی تھی جب پھپھو اس کے بیڈروم میں داخل ہوئیں۔

''بیٹا! میں آج تم سے کچھ مانگنے آئی ہوں مجھے امید ہے تم مایوس نہیں کرو گی، تم جانتی ہو میں تمہیں کس قدر چاہتی ہوں اس لئے سارا وقت تمہارا خیال رہتا تھا کہ کب ہم دونوں میاں بیوی کا چل چلاؤ ہو جائے اور تم تنہا رہ جاؤ، کاشف آگیا ہے پشیماں بھی ہے......صبح کا بھولا اگر شام کو گھر لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے، تم اسے معاف کر دو وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے اور تمہیں ہر خوشی اور آسائش دینا چاہتا ہے''۔ پھر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں بولیں۔

''کاشف سے شادی کر کے تم اسی گھر میں رہو گی میری آنکھوں کے سامنے، ویسے بھی کاشف اور آریان کا کوئی مقابلہ بھی نہیں ہے۔ تین کمروں کے فلیٹ میں رہنے والا معمولی بزنس مین جبکہ کاشف نے ہزار گز کا بنگلہ خرید لیا ہے جو وہ تمہارے نام کر دے گا، آریان تمہیں کیا دے سکتا ہے ایک سوتیلی بیٹی کے اور یہ اس کی دوسری شادی ہو گی''۔

''تو کیا کاشف کی یہ پہلی شادی ہے......؟'' اریبہ کا ضبط جواب دے گیا تو سپاٹ لہجے میں بولی۔

''ہاں تو کیا ہوا وہ کونسا صاحب اولاد ہے کم از کم تمہیں سوتیلی ماں تو نہیں بنا رہا، میرا بیٹا آج بھی تمہیں چاہتا ہے''۔

''آج بھی سے کیا مطلب ہے پھپھو......؟ یہ جو کاشف بھائی نے عروبہ سے شادی کی کیا وہ میری محبت میں کی تھی......؟'' اریبہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور پھپھو کھسیانی ہو گئیں۔

''میرا مطلب ہے عروبہ سے شادی کے بعد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے''۔

''اور اس احساس کو محسوس کرنے میں انہوں نے دس سال لگا دیئے''۔ رانیہ کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

''پھپھو! آپ پلیز اس معاملے میں نہ پڑیں یہ میرا اور کاشف بھائی کا معاملہ ہے ہم خود نمٹا لیں گے''۔

''بالکل بالکل میرا مطلب بھی یہی ہے کہ تم سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا اور فیصلہ کاشف کے حق میں ہونا چاہئے آخر ہماری محبتوں کا کچھ تو صلہ دو''۔

''اف پھپھو! اولاد کی محبت نے آپ کو خود غرض بھی بنا دیا ہے''۔ اریبہ ان کے جانے کے بعد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں، وہ اپنے آپ کو بے بسی کی انتہائی بلندیوں پر محسوس کر رہی تھی کیا کرے کس سے کہے کہ اب اسے کاشف کی نہ دولت چاہئے نہ رفاقت صرف عزت سے سر اٹھا کر جینے کا حق چاہئے، آخر اس کی بھی کچھ انا ہے، خودداری ہے کیا وہ اتنی بے مول ہے کہ جب جس کا دل چاہے سر پر بٹھا لے اور جب دل چاہے جوتی کی طرح اٹھا کر پھینک دے، آریان بھی اس تمام قصے سے لاعلم نہیں تھے اور انہوں نے بھی فیصلے کا حق اریبہ کو دے دیا تھا۔

''اریبہ! یہ سچ ہے کہ نہ میں کاشف کی طرح دولت مند ہوں نہ ہی کنوارہ، ایک بچی کا باپ ہوں مجھے ہر حال میں آپ کی خوشی مقصود ہے، میری بچی یقیناً آپ کو بہت مس کرے گی لیکن ایک نہ ایک دن اس کو بھی صبر آجائے گا اور حقیقت خود ہی اپنے آپ کو منوا لے گی، بس آپ دل پر کسی قسم کا بوجھ لئے بغیر اپنی خوشی کو مقدم رکھیں اور اپنے دل کی آواز سنیں''۔

اس دن تو کاشف نے حد کر دی، آریان اپنی گاڑی میں اریبہ کو ڈراپ کر کے گئے تھے وہ دندناتا ہوا اس کے کمرے میں گیا اور غصے سے بولا۔

''اریبہ! میں نے پہلے بھی تمہیں منع کیا تھا مجھے آریان کا یہاں آنا اور تم سے ملنا بالکل پسند نہیں ہے''۔

''آپ ہوتے کون ہیں مجھے منع کرنے والے......؟'' اریبہ چیخ کر بولی۔

''یہ مت بھولو کہ یہ میرا گھر ہے یہاں میرا ہی حکم چلے گا پھر میں تم سے شادی بھی کرنے والا ہوں''۔

''یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں آپ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوں''۔ اریبہ نے تڑخ کر سوال کیا۔

''تو کیا تم اس دو ٹکے کے آدمی سے شادی کرو گی جس کے پاس سوائے ایک بچی کے تمہیں دینے کے لئے اور کچھ نہیں''۔ کاشف طنزاً بولا پھر خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

''دیکھو اریبہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں اسی لئے عروبہ کو چھوڑ کر واپس آگیا ہوں''۔

''یہ کیوں نہیں کہتے کہ جب آپ کو وہاں سے دھتکار دیا گیا تو آپ یہاں آگئے، آپ کی دولت کی ہوس پوری ہو گئی تو آپ کو اریبہ یاد آگئی، دس سال یہ محبت کیا دولت کی چادر اوڑھے سو رہی تھی''۔ اریبہ کے لہجے میں حقارت تھی۔

''کس لہجے میں مجھ سے بات کر رہی ہو......؟'' کاشف بگڑ کر بولا۔

''تم بھول جاؤ کہ میں تمہیں آریان سے شادی کرنے دوں گا، یہ میرا گھر ہے یہاں ہر فیصلہ میری مرضی سے ہو گا''۔

''بہت سن لی میں نے تمہاری بکواس''۔ پھوپھا دھاڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

''کس نے کہہ دیا کہ یہ گھر تمہارا ہے میں نے تمہارے جاتے ہی یہ گھر اریبہ کے نام کر دیا تھا، تم آج اس کے گھر میں کھڑے ہو کر یہ بڑے بڑے بول بول رہے ہو، صاحبزادے! ہم نے جو اریبہ کے ماں باپ سے وعدہ کیا تھا اسے مرتے دم تک نبھانا تھا، تم تو اسے بیچ منجدھار میں چھوڑ کر چلے گئے تھے ہم بھی گزر جاتے تو وہ کس کے سہارے زندگی گزارتی......؟ تم لالچی اور خود غرض تھے مگر ہم نہیں، ہم بے غرض اور اپنے الفاظ کا پاس رکھنے والے لوگ ہیں، کان کھول کر سن لو، آئندہ اگر تم نے یا تمہاری ماں نے اریبہ کو تنگ کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا، کیونکہ پرسوں میں اریبہ کا نکاح آریان سے کر رہا ہوں تمہیں شریک ہونا ہو تو آجانا ورنہ اپنی ماں کو لے کر اس بنگلے میں چلے جانا جہاں تمہاری خواہشات، طمع اور لالچ دفن ہے''۔ کاشف کو ہکا بکا چھوڑ کر اریبہ کو شفقت سے بانہوں میں سمیٹے وہ کمرے سے باہر نکل آئے اور اریبہ ان کی محبت پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی آج اس کی کشتی کو کنارہ مل گیا تھا۔



سباس گل

قسط نمبر 9 _

سلسلے وار ناول

اعتبارِ عشق

''کون ہے؟'' عینی نے پوچھا تو وہ سنجیدگی سے گویا ہوئے۔
''شوکت خان ہے اس کی بیوی زبیدہ اور بیٹی ہے بارہ تیرہ برس کی آمنہ۔ یہی وہ فیملی ہے جو ہمارے ہاں کام



کرے گی منیجر کے بقول بہت شریف اور ایماندار لوگ ہیں۔ تم بھی چل کر مل لو پھر فیصلہ کر لیتے ہیں“۔

”مجھے کہاں تجربہ ہے ان معاملات کا“۔

”تو اب ہو جائے گا تجربہ‘ آؤ شاباش“۔ نفیس اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ باہر لے آئے‘ وہ تینوں لان میں کھڑے ان کے منتظر تھے۔

”السلام وعلیکم!“ عینی نے ان کے قریب پہنچتے ہی سلام کر کے انہیں اور نفیس کو حیران کر دیا۔ نفیس نے بہت عقیدت سے اسے دیکھا وہ سب کا احترام کرنا جانتی تھی۔

”السلام وعلیکم بی بی......!“ زبیدہ مسکرا کر بولی اسے عینی بہت اچھی لگی تھی اور آمنہ تو حیران نظروں سے عینی کو دیکھے جا رہی تھی‘ اس کے حسن و جمال اور پروقار سراپے سے اس کی نظریں نہیں ہٹ رہی تھیں۔

”وعلیکم السلام...... بیٹھیے آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں؟“ عینی نے مسکرا کر کہا۔

”ہم ٹھیک ہیں بیٹی! نفیس صاحب نے کام کیلئے بلایا تھا ہمیں سب کام آتے ہیں بس عزت کی روٹی اور سر پر چھت مل جائے تو ہم اس گھر کی چاکری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے‘ اس گھر کی عزت کیلئے جان بھی دے دیں گے“۔ شوکت جو چالیس یا اکتالیس سال کا لگتا تھا ایمانداری سے بولا۔

”ویری گڈ ہمیں ایسے ہی وفادار ملازم کی ضرورت ہے‘ تم ایمانداری سے کام کرو گے تو انشاء اللہ تمہیں یہاں کوئی پریشانی یا تکلیف نہیں ہوگی‘ تمہارے یہاں رہنے کے لئے کوارٹر ہے‘ تنخواہ بھی معقول ہے“۔ نفیس نے مطمئن ہو کر کہا۔

”کیوں عینی! کیا خیال ہے فائنل کر دیں انہیں“۔ نفیس نے عینی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جیسے آپ مناسب سمجھیں‘ مجھے تو یہ لوگ ایماندار معلوم ہوتے ہیں“۔ عینی نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے شوکت اینڈ فیملی آپ لوگ پرسوں اپنا سامان لے کر یہاں آ جائیں‘ کل بڑی بیگم صاحبہ اور بچے آ رہے ہیں لندن سے۔ آپ لوگ پرسوں سے کام پر آئیں‘ ہم نے تو آپ تینوں کو ”اوکے“ کر دیا ہے اب آپ نے اپنے کام سے بڑی بیگم صاحبہ کو مطمئن کرنا ہے جبھی یہاں نوکری پکی ہو سکے گی“۔ نفیس نے شوکت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”سر! بڑی بیگم صاحبہ کیا بہت سخت مزاج کی ہیں‘ آپ کی کون ہیں؟“ زبیدہ نے ہمت کر کے پوچھا تو وہ ہنس کر بولے۔

”وہ میری بیوی ہیں کنول نام ہے ان کا اور یہ عینی ہیں میری دوسری بیوی“۔

”سر کیا پہلی بیوی اچھی نہیں تھی جو دوسری بیوی...... “ زبیدہ کہتے کہتے ڈر کر چپ ہو گئی۔

”دوسری بیوی لانے سے یہ مطلب کہاں سے نکلتا ہے کہ پہلی بیوی اچھی نہیں تھی۔ میری پہلی بیوی بہت اچھی ہے اور دوسری اس سے بھی زیادہ اچھی ہے۔ اب تم لوگ جاؤ‘ پہلی دوسری کے چکر میں مت پڑو‘ دونوں اس گھر کی مالکن ہیں تمہیں دونوں کا کام کرنا ہوگا“۔ نفیس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”جی سر جی“۔ زبیدہ نے ہنسی اور شرمندہ صورت بنا کر کہا‘ شوکت نے اسے گھورا تھا کہ اسے اُن سے اس قسم کا سوال پوچھنے کی کیا ضرورت تھی‘ اگر وہ نوکری دینے سے انکار کر دیں تو پھر کہاں مارے مارے پھریں گے۔

”سر! آپ اس کی بات کا برا نہ منانا‘ یہ تو بس ایسے ہی بولتی رہتی ہے‘ انشاء اللہ آپ کو اور بیگم صاحبان کو ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی‘ ہم چلتے ہیں پرسوں حاضر ہو جائیں گے“۔ شوکت نے فوراً بات سنبھالتے ہوئے کہا۔

اور انہیں خدا حافظ کہہ کر زبیدہ اور آمنہ کو لے کر گیٹ سے باہر نکل گیا۔

☆

عینی اپنا سامان پیک کر کے نفیس کے ساتھ میکے چلی آئی۔ نفیس اسے ”عظیم ہاؤس“ چھوڑ کر آفس چلے گئے تھے۔ شام کو وہ گھر جانے کی بجائے سیدھے ”عظیم ہاؤس“ چلے گئے۔ رات کا کھانا بھی وہیں کھایا‘ سب کے ساتھ گپ شپ لگانے میں انہیں وقت گزرنے کا خیال ہی نہیں رہا۔ وہ تو عینی نے انہیں یاد دلایا۔

”کیوں سرتاج! آج گھر نہیں جانا کیا؟ رات کے سوا گیارہ بج رہے ہیں“۔

”میرے موڈ کے تو تم نے بارہ بجا دیئے نا‘ گھر جا کر کیا کروں گا“۔ وہ اس کے میکے رہنے کے خیال سے بولے تو اس نے مسکرا کر کہا۔

”سو جایئے گا“۔

”نیند کہاں آئے گی تمہارے بغیر“۔ نفیس نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس کے چہرے پر حیا کے دھنک رنگ بکھر گئے۔ ہونٹوں پر مسکان کے پھول کھل گئے۔

”آ جائے گی اور ایک شب کی تو بات ہے‘ کل تو وہ سب آ ہی جائیں گے‘ پھر آپ کو یاد بھی نہیں رہے گا کہ کوئی عینی تھی آپ کی کسی شب کی ساتھی‘ کسی صبح کی ہمدم یہ سب وقتی باتیں ہوتی ہیں“۔ عینی نے انہیں ستانے کی غرض سے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

”عینی! میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا‘ اتنی ظالمانہ باتیں مت کرو مجھ سے۔ میری وفا اور محبت پر اگر تمہیں ذرا سا بھی شک ہے تو مجھ سے دور ہو کر آزما لو مجھے‘ تمہیں یہ خبر ضرور سننے کو مل جائے گی کہ نفیس احمد کا دل اپنی مضبوطی کھو چکا ہے‘ اس کے دل کی زمین میں دراڑیں پڑ چکی ہیں“۔ وہ دکھی ہو کر بہت جذباتی لہجے میں بولے۔

”پلیز نفیس! آئی ایم سوری میں نے تو مذاق کیا تھا“۔ وہ تڑپ کر ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”اتنا جان لیوا مذاق کس نے سکھایا ہے تمہیں؟“ وہ اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی اور ندامت کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہوئے پوچھ رہے تھے تو اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”آپ نے...... بھول گئے مری میں آپ نے میرے ساتھ کیا کیا تھا؟ اس سے زیادہ جان لیوا مذاق تو نہیں تھا یہ بلکہ اس کے مقابلے میں تو یہ کچھ بھی نہیں“۔

”تو کچھ اور کر ڈالو...... بدلہ لیا ہے تم نے مجھ سے“۔ وہ بے قراری سے بولے۔

”جی نہیں...... مجھے تو خیال بھی نہیں تھا اس واقعے کا‘ وہ تو اب یاد آیا ہے‘ پلیز مجھے معاف کر دیجئے“۔ عینی نے ملتجی لہجے میں کہا تو وہ انہیں بہت پیاری لگی‘ ان کا دل چاہا کہ اسے اپنے دل میں بند کر لیں مگر اس کا تصور‘ اس کا پیار ہی ان کے دل میں بہت زیادہ موجود تھا۔ وہ سنجیدگی سے چند لمحے اس کے چہرے کو دیکھتے رہے پھر جانے کیلئے کھڑے ہو گئے‘ عینی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”آپ آج یہیں رک جائیں“۔

”رک جاتا مگر اب نہیں“۔ وہ اس کا ہاتھ تھپک کر نرمی سے بولے‘ وہ اپنی بات پر جی بھر کے نادم ہو رہی تھی‘ وہ اس سے ناراض ہو کر جا رہے تھے‘ ایسا تو اس نے نہیں چاہا تھا۔

”پھپھو جان......! میں جا رہا ہوں“۔ نفیس نے اس کے کمرے سے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو وہ جائے نماز تہہ لگاتے ہوئے بولیں۔

”بیٹا! آج تو یہاں رک جاؤ“۔

”رک تو جاتا پھپھو! مگر آپ کی بیٹی نے کہا ہے کہ گھر نہیں جانا کیا...... بیگم صاحبہ نے کہہ دیا ہے اب تو جانا ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

پڑے گا''۔ نفیس نے شرارتی نظروں سے عینی کو دیکھتے ہوئے کہا جو دروازے میں کھڑی تھی'ان کی اس بات پر خفگی اور حیرانگی سے انہیں دیکھا۔

''ہیں یہ کیا کہا عینی تم نے۔ نفیس کوئی غیر ہے جو یہاں نہیں رہ سکتے' یہ تو پہلے بھی یہاں بہت دن رہے ہیں''۔ سمیرہ بیگم نے عینی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کاش.....نہ رہے ہوتے''۔ عینی نے معنی خیز لہجے میں کہا تو نفیس اپنی مسکراہٹ چھپانے کیلئے رخ پھیر گئے' اس کی بات کا مطلب اُن سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا' پھر وہ رُکے نہیں اور اسے خدا حافظ بھی نہیں کہا اور سمیرہ بیگم اور نعیم بھائی سے مل کر ''نفیس ولا'' چلے گئے۔ عینی کو ان کے ایکدم سے خفا ہو جانے پر بہت رونا آیا مگر ردا کے سامنے وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ رات بھر بے قراری اور بے چینی کے عالم میں بستر پر کروٹیں بدلتی رہی اور ردا اسے چھیڑنے سے باز نہ آئی۔

''توبہ ہے کیسی محبت ہے ایک رات شوہر کے بغیر بسر نہیں ہوتی تم سے' اگر زیادہ دن اُن سے دور رہنا پڑ گیا تو تب کیا کرو گی؟''

''تمہارا سر پھاڑ دوں گی''۔ عینی نے نہایت سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ ہنس پڑی۔

''کوئی فائدہ نہیں ہوگا' اپنا سر پھاڑنا اس بہانے شوہر تیمارداری کو بے قراری سے دوڑے چلے آئیں گے بلکہ ساتھ لے جائیں گے اور پھر تم بہت سکون کی نیند سو سکو گی ان کی بانہوں میں''۔

''بہت بے شرم ہو تم''۔ عینی نے اسے گھورتے ہوئے کہا تو وہ ہنس کر بولی۔

''خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے' جمال اور ان کے گھر والوں سے تو میں خاصی شرم کرتی ہوں' اتنی کے ان کے سامنے شرم سے پانی پانی ہوئی جاتی ہوں''۔

''میں نے ناحق امی جان سے تمہاری سفارش کی' اب کہوں گی کہ اس کی رخصتی بھی نکاح کے بعد ہی کر دیں' کوئی ضرورت نہیں ہے سال بھر گھر بٹھائے رکھنے کی' یہ نالائق پڑھے گی نہیں جمال جمال کا ورد کرے گی اور میرا بھیجہ کھاتی رہے گی''۔ عینی نے بھی اس کے مذاق سے تنگ آ کر دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

''تمہارا بھیجہ کھانے والی تو اب آ رہی ہیں''۔ اس نے ہنس کر کہا۔

''کون؟'' اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا اشارہ کس کی طرف ہے۔

''کنول اور کون''

''اوہ.....'' عینی کے ہونٹوں سے نکلا' اس کے دل میں نفیس کی ناراضگی کی پریشانی میں کنول کی سازشی اسکیم اور متوقع نازیبا سلوک کے خیال نے مزید پریشانی اور توڑ پھوڑ کا احساس بڑھا دیا۔ وہ بہت بے سکون ہو کر رہ گئی حالانکہ کتنا سمجھایا تھا اس نے خود کو مگر وقتی طور پر وہ خود کو پریشان اور بے سکون ہونے سے نہ بچا سکی۔ اسے اندازہ تھا کہ کنول اور سلمیٰ بیگم اسے بہت چالاکی سے نفیس کے دل سے ان کے گھر سے اور ان کی زندگی سے نکالنے کی منصوبہ بندی تیار کر چکی ہوں گی اور کنول کی واپسی پر اس کی آزمائش اور مصیبت کا دور شروع ہو جائے گا' اس پر نفیس بھی خفا ہو کر چلے گئے تھے' یہ بات اس کیلئے کنول کی واپسی پر بہت تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔ ان کی محبت اور اپنائیت ہی تو اسے حوصلہ اور ہمت دیتی تھی' اگر وہ بھی بدل گئے تو.....؟ اس سے آگے وہ سوچ بھی نہیں سکی۔

☆

وہ فجر کی اذان سنتے ہی نماز کے لیے اٹھ گئی تھی' اسے نماز ادا کرتے ہوئے محسوس ہوا کہ..... سکون صرف سجدے میں ملتا ہے۔

صبح اسے نفیس کا بہت شدت سے انتظار تھا' انہوں نے صبح و شام آنے کا وعدہ جو کیا تھا اس سے۔ سب ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے' نعیم بھائی بھی آفس چلے گئے' بچے اسکول اور ردا کالج چلی گئی۔ سمیرہ بیگم اور توبیہ بھابی ناشتے کے برتن سمیٹ رہی تھیں وہ اپنے کمرے میں آ گئی' اس نے بالوں میں کنگھی تک نہیں کی تھی' سر بھاری ہو رہا تھا' آنکھیں بھی نیند سے بھری تھیں مگر اسے نفیس کا انتظار تھا۔ وہ کمرے کی کھڑکی کھول کر لان میں دیکھنے لگی' سرد ہوا کا جھونکا اس کے جسم میں کپکپی دوڑا گیا۔ اس نے جرسی یا سوئیٹر بھی نہیں پہن رکھا تھا' اسے ہوش ہی کہاں تھا گرم شال یا جرسی سوئیٹر پہننے کا۔

''بند کرو کھڑکی' ٹھنڈ لگ جائے گی''۔ نفیس کی آواز پر وہ سٹپٹا کر مڑی' وہ سچ مچ اس کے قریب کھڑے تھے' انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر کھڑکی بند کر دی۔ ان دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے کو رات بھر کے دکھ بھرے رت جگے کا حال سنا اور دکھا رہی تھیں نفیس اس کی حالت دیکھ کر بہت بے قرار ہوئے' عینی نے حیرانگی سے انہیں دیکھا۔

''آپ آ گئے.....''

''مجھے تو آنا ہی تھا تم سے وعدہ جو کیا تھا''۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''تو کیا آپ صرف وعدہ نبھانے آئے ہیں؟''

''نہیں تمہیں منانے بھی آیا ہوں''۔ انہوں نے اس کے قریب آ کر اس کے شانوں کو تھام لیا۔

''لیکن خفا تو آپ تھے''۔ اس کی آنکھوں میں رات بھر کے رُکے ہوئے آنسو امڈنے لگے۔

''دکھ تو میں نے تمہیں دیا تھا' ذرا سی بات پر میں بہت سنجیدہ ہو گیا تھا' میں نے مذاق کا جواب مذاق سے دیا تھا مگر مجھے یہاں سے جاتے ہی احساس ہوا کہ میں نے بہت برا کیا ہے تمہارے ساتھ' میں تم سے خفا نہیں تھا نہ کبھی ہو سکتا ہوں' یقین جانو میں رات بھر جاگتا رہا ہوں' ایک منٹ کو بھی نہیں سو سکا''۔

''آپ بہت برے ہیں' بہت برے''۔ وہ ان کے سینے پر مکے مارتے ہوئے رو پڑی۔

''عینی! آئی ایم سوری مجھے معلوم ہے تم بھی رات بھر جاگتی' تڑپتی رہی ہو۔ آئندہ ہم کبھی ایسا مذاق تو کیا ایسی بات بھی نہیں کریں گے''۔ نفیس نے اسے اپنے سینے سے لگا کر محبت سے کہا۔

''میں نے.....ایسی بات تو نہیں کہی جو آپ نے.....'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''میں مانتا ہوں جانو! سچ کہوں تمہارا پریشان چہرہ دیکھ کر میرا دل چاہا کہ تمہیں تنگ کروں' اب جانے بھی دو جان''۔

''جائیں میں نے کب روکا ہے آپ کو''۔ عینی ان سے علیحدہ ہوتے ہوئے روتے ہوئے بولی۔

''تو روک لونا.....'' وہ ہنس کر اس کے بازوؤں کو تھام کر پیار سے بولے۔

''میں سمجھی تھی آپ آئیں گے ہی نہیں' میں رات بھر سو بھی نہیں سکی' اتنا ڈرایا پریشان کیا آپ نے مجھے''۔ وہ بچوں کی طرح اپنے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے بولی تو انہوں نے کہا۔

''میں بھی ساری رات جاگا ہوں' پریشان رہا ہوں''۔

''اچھا ہوا..... جیسی کرنی ویسی بھرنی''۔ عینی نے خفگی اور سادگی سے کہا تو انہیں بے ساختہ ہنسی آ گئی' پھر سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

''کیا حالت بنائی ہے تم نے اپنی اور جس حالت سے تم آج کل گزر رہی ہو اس میں تمہیں مکمل ریسٹ' سکون اور خوشی کی ضرورت ہے اور تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے''۔

”آپ نے بنائی ہے میری یہ حالت“۔

”ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہی ہو‘ تمہاری یہ حالت بنائی تو میں نے ہی ہے“۔ نفیس نے بے حد شریر اور ذومعنی لہجے میں کہا تو ایک لمحے کو تو اس نے ان کے چہرے کو غور سے دیکھا‘ ان کے جملے پر غور کیا تو ان کی بات کا مطلب اس کی سمجھ میں آ گیا‘ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”بے شرم“۔ اس نے شرگیں لہجے میں دبی دبی آواز میں کہا۔

”کیا کہا؟“ وہ اس پر جھکے۔

”کچھ نہیں“۔ وہ ہنستے ہوئے پیچھے ہٹی۔

”میں سب سمجھتا ہوں‘ جو دل چاہے کہہ لو مگر اب جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو کر آؤ‘ میں اتنی دیر میں پھپھو جان کے پاس بیٹھ کر ناشتہ کر لوں“۔

”جی بہتر“۔ وہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

”تم نے ناشتہ کر لیا کیا؟“ انہوں نے جاتے جاتے پوچھا۔

”تو اور نہ کرتی‘ اتنی بری حالت ہو رہی تھی میری بھوک کے مارے“۔

”اچھا کیا تمہیں کم از کم اس معاملے میں تو اسی طرح عقل سے کام لینا چاہیے‘ تمہاری صحت کیلئے بھوک ہڑتال قطعاً مناسب نہیں ہے۔ چلو اب تیار ہو جاؤ میں تو ناشتہ کروں جا کر‘ تم نے تو مزیدار ناشتے کرا کرا کے میری عادتیں ہی بگاڑ دی ہیں“۔ نفیس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

”تھینکس گاڈ!“ نفیس نے اس کی ہنسی پر دونوں ہاتھ پھیلا کر پرسکون ہو کر کہا تو وہ مسکراتے ہوئے سوٹ کیس سے اپنے کپڑے نکالنے لگی۔ وہ ناشتے کیلئے سمیرہ بیگم کے پاس چلے آئے۔ سمیرہ بیگم نے ناشتے پر ہی ان سے ردا کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ جمال کے بارے میں وہ انہیں پہلے ہی تفصیل سے بتا چکی تھیں۔

”پھپھو جان! رشتہ تو مناسب ہے آپ بسم اللہ کیجیے“۔ نفیس نے نوالہ چباتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! چاہتی تو میں بھی یہی ہوں لیکن جمال ذرا بڑے گھر کا ہے اس حساب سے تیاری بھی تو کرنا ہو گی ناں‘ اور نعیم تو پہلے ہی ندا کی شادی پر اپنی ساری جمع پونجی خرچ کر چکا ہے۔ عینی کیلئے زیادہ خرچ نہیں کرنا پڑا‘ اللہ تمہیں سلامت رکھے تم نے تو مجھ بیوہ کو بہت سہارا دیا ہے“۔

”پھپھو پلیز......! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ میں آپ کا بیٹا ہوں اور جوان بیٹے ماؤں کا سہارا ہی بنتے ہیں‘ ان پر بوجھ نہیں بنتے‘ آپ یہ بات کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔ ماشاء اللہ آپ کی ساری بیٹیاں بہت پیاری‘ تعلیم یافتہ اور سگھڑ ہیں‘ انہیں تو بغیر جہیز کے ہی قبول کرنے والے اچھے رشتے ملنے چاہئیں اور جب میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے اور میں اپنے شب و روز کی محنت سے کمائی بھی کر رہا ہوں‘ گھر کے‘ بیوی بچوں کے اخراجات افورڈ کر سکتا ہوں تو کیوں لوں میں جہیز یا کوئی چیک وغیرہ‘ یہ تو انتہائی گھٹیا سوچ ہوئی کہ مرد جہیز کی خاطر کسی لڑکی کو بیاہ کر لے جائے۔ یہ تو دولت سے چیزوں سے محبت ہوئی ناں اور مجھے تو عینی سے محبت ہے پھپھو اور آپ سے مجھے صرف دعائیں چاہئیں‘ آپ کا پیار اور اعتبار چاہیے۔ یقین رکھیے آپ کی بیٹی کو میری ذات سے انشاء اللہ کبھی کوئی تکلیف یا اذیت نہیں پہنچے گی“۔ نفیس نے ان کا ہاتھ تھام کر دل سے کہا۔

”جیتے رہو‘ میری عینی کی آخری سانس تک اس کے سنگ رہو‘ خوش رہو“۔ سمیرہ بیگم نے ان کی پیشانی چوم کر محبت سے انہیں دعا دی‘ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

”پھپھو جان! میں آپ کا بیٹا بھی ہوں اور داماد بھی اور ردا کو میں نے ہمیشہ اپنی بہن سمجھا ہے‘ آپ بے شک ردا کی رخصتی بھی نکاح کے فوراً بعد کر دیں۔ انتظامات کی بالکل فکر نہ کریں‘ میں ہوں ناں ردا کا بھائی۔ صبا اور ندا بہن کی شادی میں نعیم نے اپنا بھائی ہونے کا حق ادا کیا ہے‘ اب میری باری ہے‘ ردا کی شادی کے سارے انتظامات میں کروں گا‘ سارے اخراجات میں کروں گا۔ آپ اگر مجھے دل سے اپنا بیٹا سمجھتی ہیں تو مجھے یہ نیک فریضہ ادا کرنے سے روکیے گا نہیں“۔

”جیتے رہو بیٹا! تم میری امیدوں سے کہیں زیادہ بڑے آدمی ہو‘ لیکن چندا! نعیم کو شاید اچھا نہ لگے۔ لوگ باتیں بنائیں گے کہ داماد کی دولت پر بیٹی بیاہ دی۔ لوگ تو پہلے ہی کہتے ہیں کہ میں نے دولت کے لالچ میں عینی کی شادی تم سے کر دی“۔ سمیرہ بیگم نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دھیمے پن سے کہا۔

”محبت سے بڑھ کر کوئی دولت ہو سکتی ہے پھپھو! کوئی نہیں‘ میں نے آپ کی اور آپ کی عینی کی محبت کے لالچ میں آپ کی عینی سے شادی کی ہے اور میں تو جانتا ہوں کہ یہ شادی آپ لوگوں نے کسی لالچ کے تحت نہیں کی بلکہ میری محبت کے جذبے کو قبول کرتے ہوئے کی ہے۔ پھپھو جانی! لوگ تو کسی بھی حالت میں ہمیں خوش نہیں دیکھ سکتے اور جن لوگوں کے ساتھ ہمیں جینا ہی نہیں ہم اُن کی پرواہ کیوں کریں۔ ہمارا رشتہ اور تعلق تو ایک دوسرے سے ہے‘ آپس میں ہے تو ہمیں ایک دوسرے کی پرواہ کرنی چاہیے۔ غیروں کی فکر میں اپنوں کی فکر چھوڑ دینا کون سی عقلمندی ہے۔ بس پھپھو! میں نے کہہ دیا ہے ردا کی شادی میں کروں گا‘ وہ میری بہن بھی ہے اور بیٹی جیسی بھی ہے‘ آپ مطمئن رہیں نعیم کو بھی میں سمجھا لوں گا“۔ نفیس نے ان کے ہاتھوں کو تھام کر رسانیت سے دل سے کہا تو خوشی سے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ انہوں نے نفیس کے ہاتھ چوم لئے اور بھیگتے لہجے میں دعائیں دینے لگیں۔

”جیتے رہو میرے چاند! خدا تمہاری عمر دراز کرے‘ تمہاری اولاد کو بھی تم جیسا سعادت مند‘ نیک‘ مخلص اور فرمانبردار بنائے“۔

”آمین“۔ نفیس کی آواز میں عینی کی آواز بھی شامل ہو گئی تھی‘ انہوں نے گردن گھما کر دیکھا وہ میرون اور سفید کمبی نیشن کے شلوار قمیض دوپٹے میں ملبوس بالوں کو سلیقے سے بنائے‘ ہلکا پھلکا میک اپ کیے اپنے کمرے کے دروازے سے باہر کھڑی تھی اور نفیس کی اور سمیرہ بیگم کی ساری باتیں سن چکی تھی۔ نفیس کی محبت اس کے دل میں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ واقعی ایک مخلص اور عظیم انسان تھے۔ وہ بہت خوش تھی خدا کی شکر گزار تھی کہ یہ پیار اور ہمدرد شخص اس کی زندگی کا ساتھی ہے‘ اس کے ہر قدم کے ساتھ ہمقدم ہے۔ نفیس نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا‘ نفیس ناشتہ ختم کر کے کمرے میں چلے آئے‘ عینی بھی ان کے ساتھ تھی۔

”ارے آفس نہیں جانا کیا؟“ عینی نے شرماتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں ان کا عکس دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تم مجھے ہر وقت آفس بھیجنے پر کیوں تلی رہتی ہو‘ تمہارا دل نہیں چاہتا کہ میں تمہارے پاس رہوں“۔ وہ خفگی سے اس سے الگ ہو کر اس کے سامنے آ کر بولے۔

”میرا دل تو چاہتا ہے کہ آپ میرے پاس رہیں‘ صرف میرے پاس“۔ عینی نے ان کے سینے پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر بہت محبت سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں سب کے ساتھ ہو کر بھی تمہارے ساتھ رہتا ہوں‘ اُف کیا غضبناک ہیں یہ تمہاری آنکھیں نیند سے بھری‘ آنسوؤں سے سوجی سوجی‘ یہ تم ہر روپ میں اتنی اچھی کیوں لگتی ہو مجھے“۔ نفیس نے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر محبت سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ شرما کر ہنس کر بولی۔

”اچھی ہوں اس لیے ہر روپ میں اچھی لگتی ہوں اور کچھ کمال آپ کی محبت بھری آنکھوں کا بھی ہے“۔

”اچھا ایک کام کرو' اپنی آنکھیں بند کرو“۔ وہ ہنس کر بولے۔

”لیجیے“۔ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

”اف یہ منظر بھی حسین ہے کتنا!
دل یہ چاہتا ہے کہ دل میں سجا لیں تم کو“

نفیس نے بہت جذب سے یہ شعر پڑھا۔

”تو ابھی تک میں آپ کے دل میں نہیں پہنچی“۔ اس نے آنکھیں کھول کر اُن کا چہرہ دیکھا۔

”ارے دل میں تو تم پیدا ہوتے ہی پہنچ گئی تھیں' اب تو روح میں رگِ جاں میں سما گئی ہو۔ اب آنکھیں بند کرو“۔ انہوں نے اس کے رخسار کو چھوتے ہوئے کہا تو اس نے خوش ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور نفیس نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے سونے کی چین نکالی جس میں انگلش میں سفید ہیرے کے نگوں سے Love لکھا لاکٹ جڑا تھا۔ انہوں نے وہ لاکٹ اس کی گردن میں پہنا دیا۔ ان کا چہرہ اس کے چہرے سے مس ہوا تو انہوں نے جھک کر اسے چوم لیا۔ عینی نے بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں۔

”کیا کرتے ہیں آپ؟“ وہ شرم و حیا سے گلنار ہوتے ہوئے بولی۔ وہ شوخی سے مسکرائے تو اس نے شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے سر جھکا لیا اور جونہی اس کی نظر لاکٹ کے دمکتے Love پر پڑی تو اس کے چہرے کے رنگوں میں مزید روشنی آ گئی' اس نے ہاتھ سے لاکٹ پکڑ کر دیکھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”پیار ہے“۔ نفیس نے اس کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ بناتے ہوئے اسے قریب کرتے ہوئے کہا تو اس کا رواں رواں دل بن کر دھڑکنے لگا۔ خوشی اس کے اَنگ اَنگ سے پھوٹنے لگی' اس کی روح کو جو سکون' راحت اور مسرت ملی تھی وہ بیان سے باہر تھی۔ وہ خوشی اور تشکر سے بس ان کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی۔

”اتنا زیادہ پیار گر کبھی نہ ملا تو...... کیا کروں گی میں؟“ وہ پُرنم لہجے میں بولی۔

”ان لمحوں کو یاد کرو گی اور حوصلہ پاؤ گی اور خدانخواستہ ایسا کبھی ہو گا ہی کیوں؟ چلو اب ہنسو' یہ تمہاری شادی کی رونمائی کا تحفہ ہے جو میں نے آج کے دن کیلئے ہی سنبھال رکھا تھا کیونکہ تب تو تم خفا خفا سی تھیں“۔

”اب تو خفا نہیں ہوں میں“۔ وہ بہت دلار سے ان سے لپٹ کر بولی' ان کی روح خوشی سے رقص کرنے لگی' سارے حواس اس کے لمس کی حدت' خوشبودار قربت کو محسوس کر کے تر و تازہ ہو گئے اور وہ مسکراتے ہوئے اس کے کان کے قریب شرارت بھرے لہجے میں بولے۔

”سنو...... مجھے آفس جانا ہے اور تم مجھے روکنے کیلئے ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہو“۔

”کیا...... ہتھکنڈے؟“ وہ خفا ہو کر ایکدم سے ان سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔

”بہت گندے ہیں آپ“۔

”تمہارا ابھی جواب نہیں“۔ نفیس نے بے تحاشا ہنستے ہوئے کہا تو اسے بھی ہنسی آ گئی۔

شام کو بھی وہ حسبِ وعدہ اس سے ملنے کیلئے آئے۔ اس نے انہیں چائے کے ساتھ گرم گرم پکوڑے اور کیک کھانے کیلئے پیش کیے جو انہوں نے بہت رغبت سے مزے لے کر کھائے۔



نفیس ایئرپورٹ کے بین الاقوامی آمد کے پورشن میں کھڑے اپنی فیملی کا انتظار کر رہے تھے۔ جہاز آ چکا تھا اور مسافر اپنا سامان اٹھائے چیک کرائے باہر آ رہے تھے۔ نفیس کی نظریں بے تابی سے کنول' شایان اور روشان کے چہروں کو تلاش کر رہی تھیں۔ لندن جانے سے پہلے کنول نے جو رویہ اور لہجہ ان کے ساتھ اپنایا تھا وہ خود بخود انہیں یاد آنے لگا تو انہوں نے سر جھٹک دیا۔ وہ اس وقت ان تکلیف دہ لمحوں کو یاد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کنول سے انہیں محبت تھی اس لیے وہ ان سے ناراض نہیں تھے۔

”پاپا...... پاپا...... ہم آ گئے“۔ شایان اور روشان کی چہکتی آوازیں ان کے کانوں میں پڑیں تو انہوں نے چونک کر آوازوں کی سمت دیکھا' وہ دونوں ان کی جانب دوڑے چلے آ رہے تھے' نفیس کے چہرے پر خوشی کے رنگ بکھر گئے۔

”میرے بچے' میرے جگر گوشے“۔ نفیس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ان کی طرف اپنی بانہیں پھیلا دیں اور وہ دونوں اُن کی بانہوں میں آ سمائے۔ نفیس نے ان کا چہرہ بے اختیار اور بار بار چوما۔ روشی اور شان نے بھی ان کے چہرے پر کئی بار پیار سے بوسے دیئے۔

”یار بہت انتظار کرایا' اتنے دن لگا دیئے نانو کے پاس' پاپا کو بھول ہی گئے تھے وہاں جا کر“۔ نفیس نے شان کو دیکھتے ہوئے محبت بھرا شکوہ کیا۔

”نہیں پاپا! ہم آپ کو ایک منٹ اور سیکنڈ کیلئے بھی نہیں بھولے تھے' ہمارا تو وہاں دل بھی نہیں لگا' وہ تو ممی کی وجہ سے وہاں رہنا پڑا“۔ شان نے ان کا گال چوم کر ایمانداری سے بتایا تو ان کی نظریں بے اختیار سامنے اٹھ گئیں جہاں کنول پنک کلر کی ساڑھی میں ملبوس اپنے نین نقش کو میک سے اجاگر کیے کندھوں پر سیاہ اونی شال پھیلائے بڑی شان سے کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ انہیں نفیس کے ایئرپورٹ آنے پر حیرت بھی تھی کیونکہ وہ تو انہیں اطلاع دیئے بغیر آئی تھیں۔

”السلام وعلیکم!“ کنول نے مسکراتے ہوئے سلام کیا تو وہ روشی کو گود میں اٹھا کر کھڑے ہو گئے اور ان کے نکھرے نکھرے چہرے کو دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولے۔

”وعلیکم اسلام! بہت دیر کی میری جان آتے آتے“۔

”کیسے ہیں آپ؟“ کنول نے ان کے پہلے جملے پر خوشی سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ویسا نہیں ہوں جیسا تم مجھے چھوڑ کر گئی تھیں“۔ نفیس کا جواب معنی خیز تھا' کنول نے چونک کر انہیں دیکھا' انہیں عینی کا خیال آ رہا تھا' کچھ اپنے رویئے کی بدصورتی ڈرا رہی تھی۔

”آپ ناراض ہیں مجھ سے؟“

”ناراض ہوتا تو ہر دوسرے تیسرے دن لندن فون کیوں کرتا تم سے بات کرنے کیلئے“۔

”مجھے معلوم ہے' بہت ہی نرم اور رحمدل ہیں آپ“۔ وہ خوش ہو کر بولیں۔

”اسی لئے اس دل کو سختی اور بے رحمی سے چھوڑ کر چلی گئی تھیں“۔ نفیس نے کہا تو وہ شرمندہ ہو گئیں۔ نفیس بچوں کا سامان ٹرالی سے اٹھانے لگے۔

”آپ کو کیسے پتا چلا کہ ہم آج کی فلائٹ سے آ رہے ہیں؟“

”مجھے......“ نفیس نے شان کی طرف دیکھا تو اس نے ان کا ہاتھ دباتے ہوئے انہیں سچ بتانے سے باز رہنے کا اشارہ دیا' وہ سمجھ گئے تھے فوراً بہانہ بھی بنا لیا اور مسکراتے ہوئے بولے۔

”میں نے لندن فون کیا تھا تم لوگوں سے بات کرنے کیلئے' وہاں سے پتا چلا کہ تم لوگ اس فلائٹ سے آ رہے ہو

فلائٹ کے آنے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا سو میں جلدی سے تیار ہوا اور سیدھا یہاں چلا آیا''۔

''ہم تو آپ کو سرپرائز دینا چاہتے تھے''۔ کنول نے گاڑی کے قریب پہنچ کر کہا۔

''اور سرپرائز ہم نے آپ کو دے دیا''۔ نفیس ہنس کر بولے تو وہ بھی ہنس دیں۔ سب گاڑی میں بیٹھ گئے' سامان رکھ دیا گیا تو نفیس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''کیا خیال ہے بچو! کھانا ریسٹورنٹ میں کھا لیا جائے کیونکہ گھر میں تو سوائے انڈے ڈبل روٹی کے فریج میں کوئی سالن نہیں رکھا ہوا''۔ انہوں نے گاڑی سڑک پر رواں کرتے ہوئے پوچھا۔

''پاپا! ہم برگر کھائیں گے''۔ شان نے کہا تو روشی فوراً بولی۔

''اور سوپ بھی پئیں گے''۔

''او کے جو کہو گے ملے گا''۔ نفیس نے خوشگوار لہجے میں کہا اور گاڑی قریبی چائنیز ریسٹورنٹ کے پاس روک دی۔ ہارن بجا کر ملازم کو بلایا اور ویٹر کو بلوا کر برگر اور سوپ کا آرڈر دیا۔ روشی اور شان لندن کی باتیں' ان کو مس کرنے کے قصے بڑھ چڑھ کر سنا رہے تھے کہ اتنے میں برگر اور سوپ آ گیا۔ وہ دونوں برگر کھانے لگے اور نفیس اور کنول سوپ پینے لگے۔ کنول بہت بے چینی سے ان کی صورت دیکھ رہی تھیں' انہیں عینی کے بارے میں جاننے کی بے چینی تھی اور نفیس کی صورت انہیں پہلے سے حسین اور تروتازہ دکھائی دے رہی تھی۔

''اتنی بے چین تھیں میری صورت دیکھنے کیلئے کہ اب میرے چہرے سے تمہاری نظریں ہی نہیں ہٹ رہیں''۔ نفیس کو ان کی نظروں کا یہ عمل محسوس ہو رہا تھا سو مسکراتے لہجے میں بولے تو وہ مسکراتی ہوئی بولیں۔

''بے چین تو بہت تھی''۔

''تو اب چین آ گیا مجھے دیکھ کر''۔ نفیس نے شرارت سے ان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آ گیا''۔ وہ شرما کر ہنس پڑیں۔

''ویسے تم خاصی نکھر گئی ہو مجھ سے دور جا کر' میرا خیال تھا کہ میری جدائی میں دبلی ہو جاؤ گی مگر تم تو اور بھی اسمارٹ ہو گئی ہو' بہت اچھا اثر ڈالا ہے اس ڈیڑھ ماہ کی دوری نے تمہارے خدوخال پر''۔ نفیس نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ہنس کر بولیں۔

''دوری کیسی نفیس! آپ تو میرے دل میں رہتے تھے اور تقریباً ہر روز فون پر بات بھی تو ہو جاتی تھی۔ آپ کی باتیں آپ کی محبتیں مجھے دیارِ غیر میں بھی آپ سے دور ہونے کا احساس نہیں دلاتی تھیں''۔

''رئیلی''۔ وہ مسکرائے۔

''یس''۔ وہ ہنس دیں۔

گھر پہنچتے ہی کنول نے عینی کے کمرے کی جانب دیکھا تھا۔ نفیس بچوں کو لے کر ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئے تو کنول نے عینی کے کمرے کا رخ کیا۔ نفیس ان کی اس حرکت پر مسکرا دیئے اور بچوں کو چینج کرنے کا کہہ کر خود بھی چینج کرنے چلے گئے۔

''اس کا مطلب ہے کہ عینی جب سے اپنے میکے میں ہی بیٹھی ہے تھینکس گاڈ! میکے سے آئے گی بھی تو بالآخر میکے ہی لوٹ جائے گی''۔ کنول نے عینی کے کمرے سے باہر آتے ہوئے خوش ہو کر دل میں کہا۔ نفیس چینج کر کے شان اور روشی کے کمرے میں چلے آئے' انہیں بہت پیار کیا' کہانی سنائی اور سلانے کے بعد اپنے اور کنول کے بیڈ روم میں آ گئے۔ کنول ڈریسنگ روم میں تھیں۔ وہ بیڈ پر دراز ہو گئے۔ ان کی نگاہوں میں عینی کا چہرہ آ سمایا۔ اس کے لمس اور خوشبو نے انہیں گزرے لمحوں کے فسوں میں گم کر دیا۔ وہ آنکھیں بند کرتے تو عینی ان کے سینے پر سر رکھے سو رہی ہوتی' آنکھیں کھولتے تو وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈالے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہوتی' چند منٹ میں ہی انہیں اس کی یاد نے بے قرار کر دیا تھا۔

''لڑکی! تم باز نہیں آؤ گی مجھے تنگ کرنے سے''۔ نفیس نے عینی کو مخاطب کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے با آواز کہا تھا کہ اسی وقت کنول کمرے میں داخل ہوئیں' انہوں نے بلیک کلر کی نائٹی پہن رکھی تھی' چہرہ دھلا ہوا تھا۔

''ہاں یار! اب بس بھی کرو مجھے بہت نیند آ رہی ہے' رات کے ساڑھے بارہ بج رہے ہیں' مجھے صبح آفس بھی جانا ہے''۔

''تو آپ سو جایئے' نیند تو مجھے بھی بہت آ رہی ہے''۔ کنول چہرے پر نائٹ کریم کا مساج کرتے ہوئے بولیں تو انہوں نے کمبل گردن تک کھینچ لیا۔

''نفیس! عینی نظر نہیں آئی''۔ کنول نے کن اکھیوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو نظر آ رہی ہے''۔ انہوں نے بند آنکھوں میں اسے دیکھتے اور محسوس کرتے ہوئے دل میں کہا' پھر بولے۔

''وہ گھر میں ہو گی تو نظر آئے گی''۔

''تو کہاں ہے عینی؟'' کنول نے ان کی جانب حیرانگی سے دیکھا۔

''اپنے میکے میں اور کہاں ہو گی''۔

''ہوں''۔ کنول خوش ہو گئیں اور اپنے سامان میں سے ایک پرفیوم کی شیشی نکال کر ان کے پاس آ کر بولیں۔

''نفیس! یہ پرفیوم میں آپ کیلئے لائی ہوں''۔

''تھینک یو سوئٹ ہارٹ''۔ نفیس نے پرفیوم کی شیشی ان کے ہاتھ سے لے کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کیلئے میں نے اور بھی گفٹس خریدے ہیں وہ صبح دکھاؤں گی''۔

''ضرور لیکن میرے لئے تمہارا خیریت سے آ جانا ہی گفٹ جیسا ہے' ان کی کیا ضرورت تھی''۔ وہ ان کا ہاتھ تھام کر محبت سے بولے تو وہ خوشی سے نہال ہو گئیں۔

''میرا دل چاہا کہ میں آپ کیلئے کچھ لے کر جاؤں سو لے آئی''۔

''تھینکس! اب سو جاؤ' تھکن دور ہو گی تو مزے سے خوب باتیں کریں گے''۔ نفیس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی لائٹ آف کر کے سونے کیلئے لیٹ گئیں۔



''آپ نے کیوں بنایا ناشتہ' مجھے جگا دیا ہوتا''۔ کنول نے قدرے خجالت سے کہا۔

''اتنے دن بعد تم لوگ آئے ہو تو میں نے سوچا کہ میں اپنے پیاروں کو اپنے ہاتھ سے ناشتہ بنا کر کھلاؤں' کھاؤ اور مزے کرو اور ہاں آج ملازم فیملی بھی آ جائے گی تم اسے کام سمجھا دینا' اچھے لوگ ہیں میں نے ان سے بات کر لی ہے''۔ نفیس نے آملیٹ ڈبل روٹی میں رکھ کر سینڈوچ بناتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو ویری مچ نفیس! آپ بہت کیئرنگ ہیں' میں یہی سوچ رہی تھی کہ ملازم کا بندوبست نہ ہوا تو مشکل ہو گی اور اس ناشتے کا بہت شکریہ''۔ کنول نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔

''یو آر ویلکم''۔ وہ مسکرا دیئے اور پھر بچوں سے مخاطب ہوئے۔

''روشی' شان بیٹا! آپ لوگوں کی پڑھائی کیسی رہی' وہاں کتابیں بھی کھولی تھیں یا کھیلنے میں وقت گزار دیا''۔

''پاپا! ہم نے سارا سبق یاد کیا تھا' ممی ہمیں روز نیا Lesson دیتی تھیں''۔ شان نے بتایا تو نفیس نے مطمئن ہو کر کنول سے کہا۔

''تھینکس گاڈ! یہ کام تو تم نے اچھا کیا' ان کی تعلیم بہت ضروری ہے''۔

''مجھے معلوم ہے جناب! اور یہ میرے بچے ہیں' میں انہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کامیاب انسان بنتا دیکھنا چاہتی ہوں پھر بھلا ان کی تعلیم کی طرف سے غفلت کیسے برت سکتی ہوں۔ اب آپ ان کی اسکول پرنسپل سے بات کر لیجیے گا' ان کی تیاری مکمل ہے' پرنسپل صاحبہ ان کی غیر حاضری کو کسی طرح بیلنس کر دیں اور ان کیلئے آپ کسی ٹیوٹر کا بھی انتظام کریں' ویسے بچوں کو پڑھانا بہت مغز ماری کا کام ہے''۔ کنول نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''اور مغز تمہارے پاس بچا نہیں اب' ہے ناں''۔ نفیس مذاق سے بولے۔

''جی کیا ارشاد فرمایا؟'' انہوں نے آنکھیں دکھائیں۔

''کچھ نہیں' ٹیوٹر کا بندوبست بھی کر لیں گے تب تک تم ہی انہیں پڑھا لیا کرو' ویسے بائی دی وے اگر سارے کام ملازم کریں گے تو تم کیا کرو گی؟''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' کنول نے ناراض لہجے میں پوچھا۔

''ناراض مت ہو' میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ تم فارغ ہو کر بور ہو جاؤ گی اسی لئے بچوں کو تو تم خود پڑھا لیا کرو' آخر تمہاری تعلیم بھی تو کسی جگہ کام آنی چاہیے' انہیں کون سا زیادہ ٹیوشن کی ضرورت ہوگی۔ میڈم خدیجہ کا اسکول پڑھائی کے معاملے میں بہت عمدہ ہے''۔ انہوں نے نرمی سے سمجھایا۔

''میڈم خدیجہ کی بہت تعریف کر رہے ہیں' خیر ہے کیسی خاتون ہیں محترمہ؟'' کنول نے انہیں شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''شکی بیوی مت بنو' میڈم خدیجہ مجھے بیٹا کہتی ہیں''۔ نفیس نے مسکرا کر کہا۔

''کس رشتے سے؟'' کنول میں سلمیٰ بیگم کا لہجہ بول رہا تھا' نفیس نے قدرے حیرت سے انہیں دیکھا' ان کی آنکھیں ان کے سوال کے جواب میں عینی کا چہرہ آ سمایا' اس سے پہلے کہ وہ انہیں کوئی جواب دیتے ڈور بیل بج اٹھی۔

''میرا خیال ہے شوکت' زبیدہ اور آمنہ آ گئے ہیں سامان لے کر''۔ نفیس اپنی چائے ختم کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ گیٹ کھولا تو ان کا اندازہ درست نکلا' شوکت اپنی بیوی' بیٹی اور سامان سمیت موجود تھا۔ وہ انہیں اندر لے آئے' کنول سے ان کا تعارف کرایا اور خود تیار ہونے چلے گئے۔

''پہلے کہاں کام کرتے تھے تم؟'' کنول نے شوکت سے پوچھا۔

''آرمی اسکول تھا بیگم صاحبہ! اس کا گیٹ کیپر تھا میں''۔ شوکت نے بتایا۔

''تو وہ نوکری کیوں چھوڑ دی؟'' کنول پورا انٹرویو کر رہی تھیں ان کا۔

''بیگم صاحبہ! میں اپنے بھائی کے گھر میں رہتا تھا' بھائی کی بیوی اور بھائی نے طعنے دے دے کر جینا حرام کر دیا تھا اور نوکری کی تنخواہ میں پورا نہیں پڑتا تھا۔ زبیدہ بھی سلائی کڑھائی کر کے کچھ پیسے کما لیتی ہے' مگر ہمیں رہنے کیلئے گھر کی چھت میسر نہیں رہی تو مجبوراً ایسی نوکری تلاش کرنی شروع کی جس میں رہنے کا ٹھکانہ بھی مل جائے۔ منیجر صاحب نے نفیس صاحب کا بتایا تو میں نے ان سے بات کر لی' یہاں ملازمت پکی ہو جائے گی تو وہ اسکول کی نوکری چھوڑ دوں گا' ابھی تو چند دن کی چھٹی لی ہے میں نے''۔

''پڑھے لکھے بھی ہو''۔ کنول نے پوچھا۔

''جی بیگم صاحبہ! میں نے میٹرک کیا تھا اب اپنی بیٹی کو پڑھا رہا ہوں''۔

''ہوں ٹھیک ہے چلو میں تم لوگوں کو تمہارا کوارٹر دکھا دوں اور کام سمجھا دوں لیکن یاد رہے میں بہت صفائی پسند ہوں' مجھے بار بار ایک بات کیلئے کہنا نہ پڑے''۔ کنول نے بہت بارعب انداز میں بات کرتے ہوئے کہا' آمنہ کو کنول کا انداز پسند نہیں آیا تھا' ایسے تو عینی یاد آ رہی تھی' وہ بہت دھیمے اور نرم لہجے میں بات کرتی تھی' مالکانہ رعب اس کے انداز سے ظاہر نہیں ہوا تھا۔ آمنہ اور زبیدہ کی نظریں اسے ہی ڈھونڈ رہی تھیں مگر وہ گھر میں ہوتی تو انہیں نظر بھی آتی۔

''انشاء اللہ بیگم صاحبہ! آپ کو ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی''۔ زبیدہ نے یقین دلایا تو وہ انہیں کام سمجھانے کوارٹر دکھانے لے کر چل پڑیں۔

☆

نفیس تیار ہو کر سیدھے ''عظیم ہاؤس'' آ گئے۔ ثوبیہ بھابی اور سمیرہ بیگم دوپہر کے کھانے کا انتظام کرنے کیلئے کچن میں مصروف تھیں۔ وہ ان سے سلام دعا کرنے' حال احوال پوچھنے کے بعد عینی کے کمرے میں آئے تو اسے محو خواب پایا۔ انہوں نے کلائی پر بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھا دن کے گیارہ بج رہے تھے۔

''یہ کون سا وقت ہے سونے کا؟'' نفیس نے اس کے سرہانے کھڑے ہو کر کہا تو اس نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

''عینی! کوئی ناراضگی ہے کیا؟'' وہ اسکے بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ گئے۔

''صبح ہو گئی آپ کی''۔ اس نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔

''یہی سوال میں تم سے کرنا چاہ رہا تھا صبح ہو گئی تمہاری''۔ انہوں نے ہنس کر کہا۔

''جی اب ہو گئی ہے''۔ عینی نے ان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے معنی خیز بات کہی۔

''میری صبح...... میری جان! طبیعت ٹھیک ہے''۔ انہوں نے بہت نرمی سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے پوچھا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی ٹھیک ہے''۔

''تو اس وقت بستر میں کیوں گھسی ہوئی ہو؟''

''سردی لگ رہی تھی' سو بھی نہیں سکی رات ٹھیک سے' ردا کی شادی کے موضوع پر رات دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور ردا تو بہت تیز ہے' بہت تنگ کرتی ہے وہ مجھے آپ کے حوالے سے''۔ اس نے مسکراتے ہوئے بتایا تو وہ ہنس پڑے۔

''تمہیں میرا حوالہ تنگ کرتا ہے کیا؟''

''نہیں مجھے بہت اچھا لگتا ہے''۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔

''مجھے بھی بہت اچھا لگتا ہے تمہارا چہرہ' تمہارا نام' تمہارا حوالہ''۔ وہ محبت سے بولے۔

''کنول آپا اور بچے پہنچ گئے خیریت سے؟'' اس نے چند لمحے بعد مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں الحمدللہ پہنچ گئے ہیں اور شوکت اینڈ فیملی بھی پہنچ گئی تھی''۔

''نفیس!'' عینی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''آپ مجھے......''

''چپ کیوں ہو گئیں' کہو نا کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' نفیس نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''کچھ نہیں''۔ عینی نے مسکرا کر ان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”عینی! کیا ہو جاتا ہے تمہیں یہ اچانک‘ تمہاری آنکھوں میں خوف‘ بے بسی اور حسرت کی نمی کیوں تیرنے لگتی ہے؟“ نفیس نے متفکر ہو کر محبت سے پوچھا۔

”میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے شاید وقت کے پاس ہو“۔

”عینی جانی! تمہیں پریشانی کی نہیں خوشی کی ضرورت ہے‘ مت سوچا کرو اتنا“۔

”آج آفس جانے کا موڈ نہیں ہے کیا؟“ وہ ریلیکس ہو کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”تھوڑی دیر تک جاؤں گا‘ مگر تم مجھے ہر وقت آفس بھیجنے کے درپے کیوں رہتی ہو‘ کبھی مجھے اپنے پاس بھی رہنے دیا کرو“۔ وہ اس کا ہاتھ دباتے ہوئے نرمی سے بولے۔

”میرے پاس تو آپ ہر وقت رہتے ہیں میں بھلا آپ کو کہیں جانے دوں گی“۔ وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بہت محبت سے بولی‘ وہ محبت سے ہنس پڑے۔

”تم تو مجھے رات بھی بے قرار کرتی رہیں حالانکہ کنول میرے پاس موجود تھی اور میں تمہارے لئے بے چین ہو رہا تھا‘ کیسا سحر ہے تمہاری معصومیت اور محبت میں‘ چاہت اور قربت میں کہ مجھے ہجوم میں بھی اپنی طرف کھینچے جاتا ہے۔ لڑکی! کچھ رحم کرو میرے حال پر‘ دو چار دن تم سے دور رہنا پڑ گیا تو میں...... غریب تو جاؤں گا اپنی جان سے“۔ نفیس نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اللہ نہ کرے“۔ عینی نے تڑپ کر کہا تو وہ اس کی بے قراری اور تڑپ پر خوشی سے اسے اپنی پناہوں میں لے کر جھوم اٹھے اور ان کی رات بھر کی بے قراری کو قرار آ گیا۔ ان کا انگ انگ اس کی محبت کی خوشبو میں نہا گیا۔

☆

اگلے دن نفیس بچوں کو اسکول ڈراپ کر کے اپنے آفس چلے گئے۔ کنول نے زبیدہ کو کام پر لگایا اور اچھی طرح تیار ہو کر باہر آ گئیں۔ عینی کی گاڑی کی چابی عینی کے پاس تھی اور کنول سمجھی تھیں کہ یہ گاڑی نفیس نے ان کیلئے خریدی ہو گی اور ابھی بتانا نہیں چاہ رہے ہوں گے۔ وہ اتنی خوبصورت اور نئی کار کو دیکھ کر ہی خوش ہو رہی تھیں۔ اس کے بارے میں نفیس سے پوچھنے کا سوچ کر ٹیکسی منگوائی اور ”عظیم ہاؤس“ کا ایڈریس سمجھا کر ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔ چند منٹ بعد وہ ”عظیم ہاؤس“ میں قدم رکھ رہی تھیں۔ سمیرہ بیگم دھوپ میں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں‘ انہیں دیکھ کر حیرانگی اور خوشی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”ارے کنول بیٹی! آ گئیں تم‘ کیسی ہو؟“

”السلام وعلیکم پھپھو! میں ٹھیک ہوں آپ سنائیں سب ٹھیک ہیں ناں؟“ کنول نے ان سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

”اللہ کا بڑا کرم ہے سب ٹھیک ہیں‘ تندرست ہیں‘ بس ذرا عینی کی طبیعت بوجھل سی رہنے لگی ہے“۔ انہوں نے کنول کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے مسکرا کے بتایا تو وہ سمجھیں کہ ان دھمکی آمیز فون اور نفیس سے لڑ کر یہاں آنے پر اس کی طبیعت خراب رہتی ہے‘ جبھی دل ہی دل میں خوش ہوئیں مگر بظاہر بہت فکر مند ہو کر پوچھا۔

”خدا خیر کرے پھپھو جان! کیا ہوا عینی کو؟“

”عینی کا پاؤں بھاری ہے اور ایسی حالت میں تو طبیعت بوجھل ہو ہی جاتی ہے‘ پریشانی کی بات نہیں ہے‘ اللہ خیر سے میری بچی کی گود آباد کرے“۔ سمیرہ بیگم نے خوشی خوشی مسکراتے ہوئے بتایا مگر کنول کی سماعتوں پر جیسے بم پھٹ پڑا تھا۔ وہ سکتے کے سے عالم میں بیٹھی تھیں انہیں اس خبر کی توقع جو نہیں تھی۔

”تو جس بات کا خدشہ تھا وہ ہو ہی گئی‘ عینی ماں بننے والی ہے میرے بچوں کے حق میں اپنے بچے کا حق بھی شامل کرنے والی ہے‘ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ لیکن ایسا ہوا کیسے؟ وہ تو نفیس سے سیدھے منہ بات تک نہیں کرتی تھی تو...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے‘ وہ تو میرے سامنے ہی نفیس سے ناراض ہو کر یہاں میکے چلی آئی تھی اور میں نے میکے میں اس کی موجودگی کی تصدیق کیلئے جتنی بار بھی فون کیا اس نے مجھ سے بات بھی کی تھی‘ وہ ہمہ وقت میکے میں موجود تھی پھر یہ...... ہوں...... عینی بی بی! تم نے تو میرا کام اور بھی آسان کر دیا‘ اب دیکھنا میں تمہارے ساتھ کرتی کیا ہوں“۔ کنول نے بہت حاسدانہ اور سازشی انداز میں سوچا۔

”کنول! بیٹی کہاں گم ہو گئیں؟“ سمیرہ بیگم نے انہیں گم صم دیکھ کر پوچھا تو وہ چونک کر بولیں۔

”کہیں نہیں پھپھو جان! آپ کو بہت مبارک ہو‘ یہ عینی ہے کہاں میں اسے بھی مبارکباد دینا چاہتی ہوں اور یہ کچھ گفٹس میں آپ لوگوں کیلئے لائی ہوں‘ اس خوشخبری کا علم ہوتا تو ساتھ مٹھائی بھی ضرور لاتی“۔

”مٹھائی تو ہم آپ کو کھلا دیں گے مگر گفٹس کا آپ نے تکلف کیا“۔ ثوبیہ بھابی لان میں آ چکی تھیں‘ ان سے ملتے ہوئے خوشدلی سے بولیں۔

”تکلف کیسا بھابی! آپ لوگ بھی تو میرے اپنے ہیں اور یہ گفٹس اس بات کا ثبوت ہیں کہ میں آپ سب کو لندن جا کر بھی نہیں بھولی تھی“۔ کنول نے مسکراتے ہوئے کہا تو ثوبیہ بھابی نے انہیں اپنے دل میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”بھولتی بھی کیسے‘ ہماری گڑیا رانی عینی جو آپ کے شوہر کے دل میں بس چکی تھی‘ ان کی بیوی بن چکی تھی‘ خطرے کی گھنٹی بجنے لگی ہے آپ کی زندگی میں عینی کے آتے ہی‘ واویلا کیا‘ دوغلا پن ہے‘ بھئی فون پر کچھ ملاقات پر کچھ“۔

”بہت شکریہ کنول بیٹی! جیتی رہو‘ تم بیٹھو ثوبیہ سے باتیں کرو میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں“۔ سمیرہ بیگم نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو وہ ملائمت سے بولیں۔

”نہیں پھپھو جان! کوئی تکلف مت کیجئے گا میں ابھی ناشتہ کر کے گھر سے نکلی ہوں اور چائے کی بالکل بھی طلب نہیں ہے اس وقت تو عینی سے ملنے کی طلب محسوس ہو رہی ہے‘ کتنے دن ہو گئے اسے دیکھے ہوئے‘ سچ اس نے تو میرا دل ہی جیت لیا ہے‘ ماشاءاللہ بہت پیاری اور سگھڑ لڑکی ہے عینی‘ آپ نے تربیت بھی بہت خوب کی ہے اس کی‘ میں یہاں تھی تو اس نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا تھا“۔

”توبہ بس کیجئے کنول بھابی! اتنی منافقت سے کام مت لیں اور ہماری عینی آپ کو گھر کا کام سنبھالنے کیلئے یاد آ رہی ہے ہونہہ چالاک عورت“۔ ثوبیہ بھابی نے دل میں انہیں مخاطب کر کے کہا۔

”عینی شروع سے ہی بہت ایکٹو ہے‘ کنول بیٹی! تم اس سے مل لو جا کر‘ وہ اپنے کمرے میں ہو گی“۔ سمیرہ بیگم نے بتایا تو وہ ”جی اچھا“ کہہ کر اندر چلی گئیں۔

”میں ذرا نعیم کے گرم کپڑے تہہ لگا لوں“۔ ثوبیہ بھابی نے سمیرہ بیگم کی طرف دیکھ کر کہا اور اندر چلی گئیں۔

عینی ٹیپ ریکارڈر پر اپنی پسند کا گانا سن رہی تھی جب کنول کمرے میں داخل ہوئیں۔

”خوب آرام ہو رہا ہے میکے میں“۔ کنول نے بہت طنزیہ اور کاٹ دار لہجے میں کہا۔

”آپ...... آپ یہاں......“ عینی انہیں دیکھ کر حیرت زدہ ہو کر بولی‘ اس نے ٹیپ ریکارڈر بند کرنا چاہا مگر پھر اس خیال سے ہاتھ واپس کھینچ لیا کہ کنول کی الٹی سیدھی باتیں میوزک کے شور میں گم ہو جائیں اور باہر نہ جا سکیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بھابی اور امی کو کچھ علم ہو اور دکھ ہو‘ حالانکہ بھابی کو وہ اعتماد میں لے چکی تھی پھر بھی وہ مزید کوئی تلخ بات ان کے کانوں میں نہیں پڑنے دینا چاہتی تھی۔

''کیوں کیا میں یہاں نہیں آسکتی' تم تو ایسے حیران ہو رہی ہو جیسے میں کبھی اس گھر میں پہلے آئی ہی نہیں تھی' میں تو یہاں خود چل کر آئی تھی تمہارے ہاتھوں اپنے شوہر کا بٹوارا کرنے اور تم نے ذرا بھی دیر نہیں لگائی فٹ سے دلہن بنیں اور نفیس کے گھر میری سوتن بن کر چلی آئیں''۔ وہ تلخ اور طنزیہ لہجے میں بولیں۔

''آپ بار بار ایک بات کو کیوں دہراتی ہیں' آپ اور آپ کے شوہر مجھے اپنی مرضی سے دلہن بنا کر لے گئے تھے' آپ حقیقت سے نظریں چرا کر خود کو فریب اور تسلی دے رہی ہیں یا مجھے الزام اور دوش' جو بھی ہے اس گھر کے باہر ہے۔ برائے مہربانی میرے میکے میں اس قسم کی گفتگو سے پرہیز کیجیے ورنہ آپ کا یہ بھیانک چہرہ سب کے سامنے بے نقاب ہو جائے گا جسے آپ نے جھوٹی محبت' اپنائیت اور مسکراہٹ کے پیچھے چھپا رکھا ہے''۔ عینی نے مدھم مگر بے حد سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اور جو گناہ تم نے نفیس سے نکاح کے پیچھے چھپا رکھا ہے اس کے متعلق کیا کہو گی؟''

''کیا مطلب ہے آپ کا' کون سا گناہ صاف صاف بات کیجیے''۔ وہ الجھ کر بولی۔

''بھئی میں تو تمہیں مبارکباد دینے آئی تھی' سنا ہے کہ تم ماں بننے والی ہو''۔

''آپ نے درست سنا ہے''۔

''کس کے بچے کی ماں بننے والی ہو؟'' کنول کا لہجہ شک' الزام' تہمت پر مبنی تھا۔

''آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں' کیا آپ نہیں جانتیں کہ میں کس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں؟'' عینی نے سلگ کر غصے سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جانتی ہوتی تو پوچھتی کیوں؟'' وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسیں۔

''جس شخص سے میں نے شادی کی ہے وہی اس بچے کا باپ ہے''۔

''بے وقوف کسی اور کو بنانا' میں بننے والی نہیں ہوں۔ شروع دن سے تمہارے لچھن دیکھ رہی ہوں' نفیس کو تم نے اپنے سے ایسے دور رکھا ہوا تھا جیسے وہ کوئی دشمن ہوں' نامحرم ہوں' پھر روٹھ کر میکے آ بیٹھیں اب جب پتا چلا کہ ماں بننے والی ہو تو سارا گناہ نفیس کے نکاح میں چھپانے کی چالاکی دکھانے لگیں۔ ارے بی بی! نفیس سے شادی کر کے اپنے اس گناہ کو چھپانے کا بہترین موقع پا کر بہت خوش ہو''۔

''بکواس ہے یہ سب''۔ عینی غصے سے چیخ اٹھی' اسے لگا جیسے انہوں نے بھری دنیا کے سامنے اس کے جسم سے لباس اتار کر تار تار کر دیا ہو' اسے سر بازار رسوا کر دیا ہو۔

''آپ کی سوچ اتنی گھٹیا اور پست ہو گی یہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ کیا آپ نے بھی نفیس سے اپنا گناہ چھپانے کیلئے شادی کی تھی''۔

''شٹ اپ''۔ کنول غصے سے بولیں۔

''اپنا کیچڑ مجھ پر اچھالنے کی ضرورت نہیں ہے''۔

''کیچڑ پر کوئی کیا کیچڑ اچھالے گا۔ کنول تو کیچڑ میں رہ کر اپنی پاکیزگی سلامت رکھتی ہے' آپ پہلی کنول ہیں جن کی وجہ سے کیچڑ پھیلا ہو گا اور پھیلے گا''۔

''بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری' کاٹ کر رکھ دوں گی''۔ کنول نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''اور آپ کر بھی کیا سکتی ہیں' اپنی اصلیت ظاہر کیے بغیر کیسے رہ سکتی ہیں؟''

''بی بی! اصلیت تو اب تمہاری ظاہر ہو گی اور تم خود بتاؤ گی کہ نفیس سے شادی سے پہلے کس کو اپنی زلفوں کی

چھاؤں میں سلایا اور کس کا دل بہلایا جو جاتے جاتے یہ تحفہ بھی دے گیا''۔ وہ اتنی بڑی تہمت اس کے پاکیزہ کردار پر اتنی آسانی سے لگا رہی تھیں۔

''آپ اخلاقیات کی ساری حدود پھلانگ رہی ہیں' میں صرف آپ کو نفیس کی وجہ سے کچھ نہیں کہہ رہی''۔ عینی نے غصے اور احساس ذلت سے تپ کر کہا۔

''تمہارا کچھ کہنا کا منہ رہے گا تب کچھ کہو گی نا' اسی لیے تم نفیس سے نفرت کرتی تھیں' دور رہتی تھیں' محبت تو تمہیں کسی اور سے تھی' سچ سچ بتاؤ وہ دغا دے گیا...... یا تم نے کوئی اور شکار تاک لیا تھا''۔ کنول مسلسل اس کے کردار پر تہمتیں لگائے جا رہی تھیں اور وہ اپنا ضبط اپنا صبر آزما رہی تھی' غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا' تپ رہا تھا۔

''میں آپ کی اس ساری بکواس کے جواب میں صرف اتنا کہوں گی کہ خدا آپ کو نیک ہدایت دے اور گندگی اور غلاظت کے جس کنویں میں آپ گر چکی ہیں وہاں سے آپ کو باعزت نکال دے' ورنہ آپ ساری زندگی خود سے بھی شرم محسوس کرتی رہیں گی' پچھتائیں گی''۔ عینی نے بہت تحمل سے کام لیتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''خود سے شرم تم محسوس کرو گی میں نہیں' بہت جلد تمہیں تمہاری اس زبان درازی کا جواب بھی مل جائے گا' بائے بائے''۔ کنول نے انتقامی اور سازشی لہجے میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گئیں اور عینی کے ہاتھ بے اختیار دعا کے لیے پھیل گئے۔

''یا اللہ! مجھے کنول آپا اور ان کی والدہ کے سازشی منصوبوں' انتقام اور شر سے محفوظ رکھنا' میری عزت کی حفاظت فرمانا''۔

☆

''نفیس! آپ کب آئے؟'' کنول نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تو انہیں صوفے پر بیٹھا دیکھ کر حیرانگی سے پوچھا' وہ فائل میں کاغذات سیٹ کر رہے تھے۔

''ابھی آیا ہوں اور چند منٹ بعد جا رہا ہوں' منیجر صاحب گاڑی لے گئے ہیں' آتے ہی ہوں گے' مجھے چند ضروری پیپرز لینے تھے' تم کہاں سے آ رہی ہو؟''

''میں عینی سے ملنے گئی تھی بلکہ بھی سے ملنے گئی تھی''۔

''اچھا کیا تم نے''۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا۔

''لیکن عینی نے اچھا نہیں کیا''۔ وہ انہیں دیکھتے ہوئے بولیں۔

''تمہارے ساتھ''۔ وہ حیران ہوئے۔

''نہیں آپ کے ساتھ' آپ کو اس نے دھوکا دیا ہے' استعمال کیا ہے''۔

''کس مقصد کیلئے اور کہاں استعمال کیا ہے' کیسا دھوکا دیا ہے؟'' وہ پوچھنے لگے۔

''مجھے پھپھو جان نے بتایا ہے کہ عینی ماں بننے والی ہے اور عینی نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے''۔

''تو......'' نفیس نے توجہ سے ان کی بات سنتے ہوئے کہا تو وہ ان کے سکون پر جھنجھلا کر بولیں۔

''تو صاف ظاہر ہے کہ عینی کی آپ سے شادی سے پہلے کسی اور سے کمٹمنٹ تھی اور یہ بچہ اسی کمٹمنٹ کا نتیجہ ہے اس نے آپ سے شادی کر کے اپنے گناہ کو چھپایا ہے اسی لیے تو......''

''شٹ اپ''۔ نفیس نے غصے سے بلند آواز میں پہلی بار انہیں ٹوکا تھا' وہ لرز کر رہ گئیں' ان کا خیال تھا کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے مگر معاملہ اس کے برعکس تھا۔

(جاری ہے)

ردا کی ڈائری

افشاں علی کی ڈائری سے

پروین شاکر کی غزل

دھنک دھنک مری پوروں کے خواب کر دے گا
وہ لمس میرے بدن کو گلاب کر دے گا
قبائے جسم کے ہر تار سے گزرتا ہوا
کرن کا پیار مجھے آفتاب کر دے گا
جنوں پسند ہے دل اور تجھ تک آنے میں
بدن کو ناؤ لہو کو چناب کر دے گا
میں سچ کہوں گی، مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا
انا پرست ہے اتنا کہ بات سے پہلے
وہ اٹھ کے بند مری ہر کتاب کر دے گا
سکوتِ شہرِ سخن میں وہ پھول سا لہجہ
سماعتوں کی فضا خواب کر دے گا
اسی طرح سے اگر چاہتا رہا پیہم
سخن وری میں مجھے انتخاب کر دے گا
مری طرح سے کوئی ہے جو زندگی اپنی
تمہاری یاد کے نام انتساب کر دے گا

روشن ہاشم کی ڈائری سے

احمد فراز کی نظم

یہ کیسی رت ہے
کہ ہر شجر
صحنِ گلستاں میں
ملول و تنہا سلگ رہا ہے
طیور چپ چاپ کب سے منقار زیر پر ہیں
ہوائیں نوحہ کناں
کہ اس باغ کی بہاریں
گئیں تو پھر لوٹ کر نہ آئیں
یہ کیسی رت ہے
نہ برف باری کے دن
کہ شاخوں کے پیرہن پر
سپیدہ صبح کا گماں ہو
نہ فصلِ گل ہے
کہ ہر طرف شورِ جانفروشاں سے
کوئی محبوب کا سماں ہو
نہ دورِ پت جھڑ کا ہے
کہ بے جان کونپلوں کو
امیدِ فردائے مہرباں ہو
یہ کیسی رت ہے
کوئی تو بولے
کوئی تو دھڑکے
کوئی تو بھڑکے

ثمرین اسلام الدین کی ڈائری سے

احمد ندیم قاسمی کی غزل

کون کہتا ہے کہ موت آئے گی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
تیرا در چھوڑ کے میں اور کدھر جاؤں گا
گھر میں گھر جاؤں گا، صحرا میں بکھر جاؤں گا
تیرے پہلو سے جو اٹھوں گا تو مشکل یہ ہے
صرف اک شخص کو پاؤں گا جدھر جاؤں گا
اب ترے شہر میں آؤں گا مسافر کی طرح
سایہ ابر کی مانند گزر جاؤں گا
تیرا پیمانِ وفا راہ کی دیوار بنا
ورنہ سوچا تھا کہ جب چاہوں گا مر جاؤں گا
چارہ سازوں سے الگ ہے مرا معیار کہ میں
زخم کھاؤں گا تو کچھ اور سنور جاؤں گا
اب تو خورشید کو ڈوبے ہوئے صدیاں گزریں
اب اسے ڈھونڈنے میں تا بہ سحر جاؤں گا
زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

مسز ریما نور رضوان کی ڈائری سے

نامعلوم شاعر کی نظم

اپنی محبت کا کچھ حق ادا کر دو
ہمارے نام اپنی کچھ وفا کر دو
اگر یہ ممکن نہیں تیرے لیے تو
اپنی یادوں کو مجھ سے جدا کر دو
جو بول محبت کے بول کر
میری محبت کی آس رد کر دو
رفتہ رفتہ جا رہا ہوں موت کی طرف
مجھے بچانے کے لیے زندگی کی دعا کر دو
ایسا نہیں کر سکتے اگر تم تو
ہمیشہ کیلئے مجھے الوداع کر دو

کرن امیر بہادر کی ڈائری سے

عبیداللہ علیم کی غزل

جب سینہ غم سے بوجھل ہو اور یاد کسی کی آتی ہو
جب کمرے میں بند ہو جانا اور چپکے چپکے رو لینا
جب آنکھیں باغی ہو جائیں اور یادیں میری بھر آئیں
پھر خود کو دھوکا مت دینا اور چپکے چپکے رو لینا
جب پلکیں کب سے مشکی ہوں اور سب سمجھیں تم سوئے ہو
جب منہ پر تکیہ رکھ لینا اور چپکے چپکے رو لینا
یہ دنیا ظالم دنیا ہے یہ بات بہت پھیلائے گی
تم سامنے سب کے چپ رہنا اور چپکے چپکے رو لینا
جب بارش چہرہ دھو ڈالے اور اشک بھی بوندیں لگتے ہوں
وہ لمحہ ہرگز مت کھونا اور چپکے چپکے رو لینا

عانیہ نیازی کی ڈائری سے

وصی شاہ کی نظم

خواب اور خوشبو

خواب اور خوشبو
دونوں ہی آزاد رہیں
دونوں قید نہیں ہو سکتے
میرے خواب
تمہاری خوشبو

☆☆☆

اشعار

زویا خان .... اشرف نگر

نہ جانے کیوں مرے دل کو یہی احساس ہوتا ہے
جو مجھ سے دور بھی ہو تو، تو میرے پاس ہوتا ہے
مرے نادان دل نے تجھ کو اتنا ٹوٹ کر چاہا
تمہارے دم سے جیون کا مجھے احساس ہوتا ہے

رضوانہ اکبر .... لودھراں

رویا کریں گے پہروں آپ بھی اس طرح
اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی میری طرح

فرزانہ شوکت .... کراچی

پیار سے بڑھ کر نہیں دنیا میں کوئی روشنی
پی گئے یہ روشنی تو آئینہ ہو جاؤ گے
گفتگو میٹھی کرو ہر شخص سے جھک کر ملو
دشمنوں کے واسطے بھی دلربا ہو جاؤ گے

مسز ریما نور رضوان .... کراچی

چھو لے آسماں زمین کی تلاش نہ کر
جی لے زندگی خوشی کی تلاش نہ کر
تقدیر بدل جائیگی اپنے آپ ہی مرے دوست
مسکرانا سیکھ لے وجہ تلاش نہ کر

مائرہ فیاض .... ملتان

قریہ جاں میں کوئی پھول کھلانے آئے
وہ مرے دل پہ نیا زخم لگانے آئے
میرے ویران دریچوں میں بھی خوشبو جاگے
وہ مرے گھر کے در و بام سجانے آئے

حمیرا علی .... کراچی

اک شخص کو کلید محبت عطا ہوئی
تنہائیوں پہ شہر رفاقت کا در کھلا
اک سرخوشی میں چلتے رہے اس کے ساتھ ساتھ
منزل پہ آ گئے تو کمال سفر کھلا

سباس گل .... رحیم یار خان

ہم تو مر کے بھی تمہیں پیار کریں گے ہمدم!
ہم وہ خودغرض نہیں جو مشکل میں چھوڑ دیتے ہیں

سحر انجم .... کراچی

یہ کیسی مجھے ہے ملی سزا
کے میرے لب پر نہیں ہے کوئی دعا
تجھے مانگ لیتی میں باخدا
جو ہوتا مجھے زندگی کا آسرا

ایمان علی .... سکھر

وہ جو خلوت میں دل و جاں سے فدا رہتا ہے
ملے محفل میں تو کیوں مجھ سے جدا رہتا ہے
ہم تو انسان کی محبت کے نہیں ہیں قابل
کیسے مسجد کو چلیں وہاں تو خدا رہتا ہے

افشین مرتضیٰ .... سیالکوٹ

پانیوں پانیوں جب چاند کا ہالہ اترا
نیند کی جھیل پہ اک خواب پرانا اترا
آزمائش میں کہاں عشق بھی پورا اترا
حسن کے آگے تو تقدیر کا لکھا اترا

☆☆☆☆☆

شائستہ زاہد

اس ماہ میں

اس ماہ کا اقتباس

تلاش کا نام:

شب کے سناٹے میں جب دیوار پر سائے متحرک ہو جاتے ہیں جیسے جناب ہیولانی چل پھر رہے ہوں اور شیشم کے درخت ہم آواز ہو کر چیخنا شروع کر دیتے ہیں۔

زرد چاند اک کفن میں لپٹی ہوئی نعش کی طرح نظر آتا ہے اور ستارے پردہ سحاب ہٹا کر مغموم انداز سے جھانکتے ہیں تو میری روح عالم خیال کے راستوں پر پرواز کرنے کو بے قرار ہو جاتی ہے اور غیر مرئی وادیوں میں تمہاری تلاش کرتی پھرتی ہے۔ پر آہ! تم اسے وہاں نظر نہیں آتیں نہ ہی کوئی نشان خاک پا ملتا ہے۔ جس سے تمہارے قیام کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

آہ! میری روح! ملول و ناکام!!! بھٹکی ہوئی واپس آ جاتی ہے۔ پھر جب خواب کی حسین ملکہ مجھے اپنے لبادے میں چھپا لیتی ہے تا کہ کشاکش حیات کو کچھ دیر کیلئے بھول جاؤں اور اس کی تلخیوں کو فراموش کر سکوں۔ لیکن آہ! میری شوریدہ بختی! کہ مایوس تمنا روح کو تو اب بھی قرار نہیں۔ وہ تمہاری جستجو میں فضاؤں میں چکر کاٹتی ہے اس غریب الوطن پرند کی طرح! جس کا کہیں مسکن نہ ٹھکانا۔ وہ ایک ایک کنج ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ پر آہ! تم تو کہیں بھی نظر نہیں آتیں اور نہ ہی تمہاری کوئی یادگار! اپنی حرماں نصیبی پر وہ اس طرح بے چین ہو جاتی ہے جیسے ساز کے پرسکوت تاروں میں متلاطم نغمہ۔

اور پھر! میری مایوس و افسردہ روح!! وہ ناکام واپس آ جاتی ہے۔ محض تمہاری شیریں یاد کا سہارا لئے اور بازیافت کے بھروسے پر۔

محبت کے افسانے (خلیل جبران) سے اقتباس

انتخاب: گل ثمرین .... پشاور

جال میں مچھلی

ایک مچھیرے نے دریا میں جال ڈالا تو ایک بہت بڑی مچھلی اس کے جال میں پھنس گئی۔ ماہی گیر بہت خوش ہوا لیکن ہوا یہ کہ جب وہ جال کھینچنے لگا تو طاقت ور مچھلی جال گھسیٹ کر لے گئی اور مچھلی ہاتھ آنے کی جگہ وہ بے چارہ جال سے بھی محروم ہو گیا۔

ساتھی ماہی گیر اسے ملامت کرنے لگے کہ خوش قسمتی سے ایسا اچھا شکار تیرے جال میں آیا اور تو نے یونہی گنوا دیا۔ مچھیرے نے کہا ''اے بھائیو! اس معاملے میں مجھے ملامت نہ کرو۔ اصل بات یہ ہے کہ میری قسمت میں روزی نہ تھی اور اس مچھلی کا رزق ابھی پانی میں باقی تھا''۔ شکاری کی قسمت میں روزی نہ ہو تو

وہ دریائے دجلہ میں شکار نہیں کر سکتا اور مچھلی کی زندگی باقی ہو تو اسے خشکی پر موت نہیں آتی۔

حکایات سعدی سے انتخاب

پروین خالد...... بہاولپور

اس ماہ کی نظم

کھڑکی، چاند، کتاب اور میں
مدت سے اک باب اور میں
شب بھر کھیلیں آپس میں
دو آنکھیں اک خواب اور میں
موج اور کشتی ساحل پر
دریا میں گرداب اور میں
شام اداسی خاموشی
کچھ کنکر، تالاب اور میں
ہر شب پکڑے جاتے ہیں
گہری نیند، کتاب اور میں

ناصر عباس...... کراچی

اس ماہ کی کرنیں

☆ عقل نتائج کے ادراک سے حاصل ہوتی ہے۔

☆ اگر تم دوسروں کے مال و دولت کی طرف سے فکر مند نہیں ہو تو تم سے بڑا امیر کوئی نہیں ہے۔

☆ بے نیازی اور اعتماد مل جائیں تو کامیابی یقینی ہوتی ہے۔

☆ جس طرح کوئی شخص غیر اہم یا چھوٹا نہیں ہوتا اسی طرح کوئی کام غیر اہم نہیں ہوتا۔

☆ دنیا میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسان اپنی غلطی فوراً تسلیم کر لے۔

☆ جو بے صبرا ہوتا ہے اسے دگنا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

☆ ہر شخص مکمل نہیں ہوتا، ہمیشہ بہتری کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

☆ اسکول ایک ایسی عمارت ہے جس کی چار دیواری کے درمیان مستقبل پنہاں ہے۔

رفعت حسن...... حیدر آباد

اس ماہ کے سوالات

آپ بھی پوچھیے......!

☆ دنیا میں سب سے زیادہ مار کون کھاتے ہیں؟

O لو میرج کرنے والے۔

☆ کسی کو جنگ پر جانے یا شادی کرنے کا مشورہ کیوں نہیں دینا چاہیے۔

O کیونکہ جنگ خطرناک چیز ہے اور شادی خطرناک ترین۔

☆ انسان شادی کے بعد کیا کھاتا پیتا ہے؟

O کھانے میں چوبیس گھنٹے غم کھاتا ہے جبکہ پینے کے لئے صرف آنسو دستیاب ہوتے ہیں۔

☆ مرد اور عورت میں کیا فرق ہے؟

O بہت فرق ہے...... کوئی مرد مدد کے لئے چیخ چیخ کر پکارے تو کوئی نہیں آتا، جبکہ عورت کی ایک آواز پر سارا محلہ اکٹھا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مرد لفٹ مانگے تو نہیں ملتی، جبکہ عورت مانگے تو ہر گاڑی والا لفٹ دینے کو بے چین ہوتا ہے۔

☆ کیا نئی تہذیب نے ہم سب پر جادو کر دیا ہے۔

O جادو کیا کر دیا...... آنکھوں پر بھی وہ ڈال دیا کہ اماں پردے میں رہتی ہے اور بیٹی کے بوائے کٹ بال کٹواتی اور اسے جینز پہناتی ہے۔

☆ آج کے سیاستدان کا کیا رونا ہے؟

O یہی کہ فنڈ کیلئے التجا اور دعا وہ کرتے ہیں اور مل کسی اور کو جاتا ہے۔

☆ کیا شاعر اتنا بزدل ہوتا ہے کہ پٹاخے سے ڈر جاتا ہے؟

O کیونکہ اس کے ہاتھ میں خنجر نہیں قلم ہی بجتا ہے لہٰذا وہ ہر شے کو بم خیال کرتا ہے۔

☆ مرد کے لئے دل کے دورے سے بچاؤ کا کیا طریقہ صحیح ہے؟

O بیگم کے سامنے احترام سے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہا جائے۔

☆ اگر کسی شادی شدہ مرد کے چوبیس گھنٹے ہی گھر والوں کی تڑیاں سنتے ہوئے گزریں تو اسے کیا کہا جائے گا؟

O گھر داماد۔

ایس امتیاز احمد...... کراچی

اس ماہ کی غزل

بچھڑ کے مجھ سے کبھی تو نے یہ بھی سوچا ہے
ادھورا چاند بھی کتنا اداس لگتا ہے
یہ ختم وصل کا لمحہ ہے، رائیگاں نہ سمجھ
کہ اس کے بعد وہی دوریوں کا صحرا ہے
کچھ اور دیر نہ جھڑنا اداسیوں کے شجر
کسے خبر تیرے سائے میں کون بیٹھتا ہے
یہ رکھ رکھاؤ محبت سکھا گئی اس کو
وہ روٹھ کر بھی مجھے مسکرا کے ملتا ہے
کچھ اس قدر بھی تو آساں نہیں ہے عشق ترا
یہ زہر دل میں اتر کر ہی راس آتا ہے
میں تجھ کو پا کے بھی کھویا ہوا سا رہتا ہوں
کبھی کبھی تو مجھے ٹھیک تو نے سمجھا ہے
اسے گنوا کے میں زندہ ہوں اس طرح محسن
کہ جیسے تیز ہوا میں چراغ جلتا ہے

شاعر: محسن نقوی

انتخاب: صنوبر خرم...... کمالیہ

اس ماہ کی بات

کسی ایک مقصد کے حصول کا نام کامیابی نہیں، اس مقصد کے حصول کا نام ہے جس کے علاوہ یا جس کے بعد کوئی اور مقصد نہ ہو۔

سیدہ امبر ہاشمی...... کراچی

اس ماہ کا لطیفہ

اک لڑکی اک لڑکے سے بولی۔

لڑکی: او بھائی جان! پلیز راستہ دو۔

لڑکا: تم لڑکیاں اتنا کنفیوژ کیوں کرتی ہو۔

یا تو بھائی بولو

یا جان بولو......!

اس ماہ کی دعا

دعا اپنے لئے مانگنا عبادت ہے
اور
دعا دوسروں کیلئے مانگنا خدمت ہے
عبادت سے محبت ملتی ہے
اور خدمت سے اللہ ملتا ہے
پلیز مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں......!

مسز ریما نور رضوان...... کراچی

☆☆☆☆☆

خوشبو

ارشادات ربانی

مشرکوں کی باتیں:

"اور مشرک کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اس کے سوا کسی اور کی عبادت کرتے اور نہ ہمارے بڑے ہی کسی اور کو پوجتے اور نہ اس کے فرمان کے بغیر ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ اے پیغمبر ﷺ اسی طرح ان سے اگلے لوگوں نے کیا تھا، تو پیغمبروں کے ذمہ تو اللہ تعالیٰ کے احکام کھول کھول کر سنا دینے کے سوا اور کچھ نہیں اور ہم نے ہر جماعت میں اپنے پیغمبر بھیجے اور ان کے ذریعہ لوگوں کو سمجھایا کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کریں اور بتوں کی پرستش سے اجتناب کریں تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور بعض ایسے ہیں، جن پر گمراہی ثابت ہوگئی۔ سو زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ پیغمبروں کو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا؟"

(سورہ النحل۔ آیت 36-35 پارہ نمبر 14)

اللہ پر بھروسہ:

"جو مومن ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں، ان پر شیطان کا کچھ زور نہیں چلتا۔ اس (شیطان) کا زور ان لوگوں ہی پر چلتا ہے، جو اس کو اپنا ساتھی بناتے ہیں اور اس کے وسوسے کے سبب اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک مقرر کرتے ہیں"۔

(سورہ النحل۔ آیت 100 پارہ نمبر 14)

موت وحیات:

"اور اللہ تعالیٰ ہی نے تم کو پیدا کیا ہے، پھر وہی تم کو موت دیتا ہے اور تم میں سے بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ عمر کے نہایت خراب حصے کو پہنچ جاتے ہیں اور بہت کچھ جاننے کے بعد ہر چیز سے لاعلم ہو جاتے ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور قدرت والا ہے"۔ اور اللہ تعالیٰ نے رزق اور دولت میں بعض لوگوں کو بعض پر فوقیت دی ہے تو جن لوگوں کو فوقیت اور فضیلت دی ہے، وہ اپنا رزق اپنے خادموں اور ملازموں کو تو دے ڈالنے والے ہیں نہیں کہ سب اس میں برابر ہو جائیں تو کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمت کے منکر ہیں؟"

(سورہ النحل۔ آیت 71-70 پارہ نمبر 14)

بسمہ علی...... سکھر

لبوں سے نکلے جو لفظ

1: لفظ وہ نہیں جو زبان سے نکلے، لفظ تو وہ ہے جو دل میں اترے۔

2: الفاظ کی مار جوتے کی مار پہ بھاری ہے۔

3: کہانی پڑھتے ہوئے لفظوں میں ڈوب جانے

والا کبھی کہانی نہیں سمجھ سکتا۔

4: الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے دو باتوں کا خیال رکھو۔ الفاظ نہ تو زیادہ گرم ہوں اور نہ برفیلے۔ گرم الفاظ اپنے اندر کا غصہ بیان کرتے ہیں جبکہ برفیلے الفاظ گلے کا غصہ بڑھاتے ہیں۔

5: خوبصورت الفاظ سب عیب چھپا لیتے ہیں۔

6: بولنے کا ڈھنگ نہ آتا ہو تو پھر چاہے جتنے مرضی خوبصورت الفاظ کا استعمال کر لو سب بے سود ہیں۔

7: بولتے وقت اتنے الفاظ استعمال کرو جتنی اگلے کی برداشت ہو۔

فرزانہ عمر دراز...... کراچی

ہنس لیں

مریض ہاسٹل میں نرس سے کہتا ہے:

"I love you تم نے میرا دل چرا لیا ہے"۔

نرس آگے سے کہتی ہے۔

"چل جھوٹے ہم نے دل نہیں گردہ چرایا ہے"۔

نظر رکھیے

☆ اپنے خیالات پر، کیونکہ یہ الفاظ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

☆ اپنے الفاظ پر، کیونکہ یہ عمل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

☆ اپنے اعمال پر، کیونکہ یہ عادات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

☆ اپنی عادتوں پر، کیونکہ یہ شخصیت کا روپ دھار لیتے ہیں۔

☆ اپنی شخصیت پر، کیونکہ یہ آپ کا مقدر بن جاتی ہے۔

سیدہ امبر ہاشمی...... کراچی

دیوار

محبوب نے محبوبہ سے کہا: "تم سے ملنے کیلئے آج میں ایک نئی دیوار پھلانگ کر آیا ہوں"۔

محبوبہ نے پوچھا: "دیوار ٹوٹی تو نہیں، تمہیں کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

محبوب نے جواب دیا: "میں اینٹوں والی دیوار کی بات نہیں کر رہا بلکہ میں تمہیں اپنی بیگم کے متعلق بتا رہا ہوں، جس سے میری چند روز قبل ہی شادی ہوئی ہے"۔

بشریٰ طارق...... ٹوبہ ٹیک سنگھ

مال و دولت

☆ جب دولت محو گفتگو ہوتی ہے تو کوئی قطع کلامی نہیں کرتا۔

☆ مال جمع کرنا ایسا ہے گویا کسی بہت بڑے پتھر کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جانا اور خرچ کرنا ایسا ہے گویا اس پتھر کو نیچے لڑھکانا۔

☆ دولت انسان کو تباہ نہیں کرتی بلکہ دولت کا برا استعمال اسے تباہ کر دیتا ہے۔

☆ امیری دولت کو سمیٹنے سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ ضروریات کو گھٹانے اور کفایت شعاری سے حاصل ہوتی ہے۔

☆ امیر ہو کر مغرور نہ ہونا آسان ہے لیکن غریب ہو کر واویلا نہ کرنا مشکل ہے۔

فرزانہ شوکت...... کراچی

صرف ایک

ایک لڑکی نے اپنے محبوب سے کہا:
"اگر تم سمجھوتے کی دہلیز پر پہلے ہی لوٹ جاتے مگر اب جانے سے پہلے میرے آخری سوال کا جواب دے جانا۔ میں نے کب کہا تھا کہ میرے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لاؤ' مجھے خوابوں کے دیس لے چلو' بنگلے! میں حقیقت میں رہنے والی عام لڑکی ہوں' میں نے تو کچھ نہیں مانگا تھا' صرف ایک ہیرے کا سیٹ ہی تو مانگا تھا"۔

سیدہ امبر بخاری...... چندی پور

باپ پر گیا ہے

ماں...... مٹھائی کھاؤ گے؟
بیٹا...... نہیں۔
ماں...... کھانا کھاؤ گے؟
بیٹا...... نہیں۔
ماں...... ٹافی کھاؤ گے؟
بیٹا...... نہیں۔
ماں...... باپ پر گیا ہے جوتے ہی کھائے گا۔

ایس امتیاز احمد...... کراچی

اقوالِ زریں

☆ جاہل کی تواضع عالم کے غرور سے بہتر ہے۔ (ابن خلدون)

☆ بدترین وہ گھر ہے جس میں یتیم کے ساتھ بدسلوکی ہو۔ (ابن ماجہ)

☆ آزادی کی کوئی قیمت نہیں۔ (لیاقت علی خان)

☆ شہرت بہادری کے کارناموں کی مہک ہے۔ (سقراط)

☆ خاموش رہو یا ایسی بات کہو جو خاموشی سے بہتر ہو۔ (بیکن)

☆ مسکراہٹ محبت کی زبان ہے۔ (ہومر)

☆ تقدیر بہت کم تدبیر کا ساتھ دیتی ہے۔ (فیثا غورث)

☆ سچی سے سچی اور اچھی سے اچھی عقلمندی ارادہ ہے۔ (نپولین)

☆ انسان آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے درمیان لٹکا ہوا پنڈولم ہے۔ (بائرن)

☆ جو دوسروں کی آزادی سلب کرنے کی کوشش کرتے ہیں' وہ خود آزاد کہلانے کے حقدار نہیں۔ (لنکن)

رابعہ فاطمہ...... لاہور

عادت

اردو ادب کے مایہ ناز مشہور اور قدیم شاعر میر تقی میر کی عادت تھی کہ جب گھر سے باہر جاتے تو تمام گھر کے دروازے کھلے چھوڑ جاتے تھے اور جب اپنے گھر واپس آتے تو گھر کے تمام دروازے بند کر لیتے تھے۔ ایک دن مرزا اسد اللہ خان غالب نے وجہ پوچھی تو عظیم شاعر میر تقی میر نے جواب دیا: "میں ہی تو اس گھر کی واحد دولت ہوں"۔

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی...... کراچی

حلال کمائی

ایک بڑی فرم کے مالک نے اپنے دوست سے کہا۔ "میرا اکاؤنٹنٹ تنخواہ کی ایک ایک پائی حلال کھاتا ہے' اس نے تین بار مجھے انکم ٹیکس کے سلسلے میں جیل جانے سے بچایا"۔

ثریا جبیں...... بہاولپور

☆☆☆☆☆☆



یادیں

کبھی پرند کی پرواز تھی اس میں
کبھی خوشبو کی مہک تھی اس میں
کبھی کشمکش جاں تھی اس میں
کبھی فرشتوں کی صفت تھی اس میں
کبھی ہر خوف کا ٹکراؤ تھا اس میں
کبھی خاموش فضا تھی اس میں
کبھی چال میں تیز رفتار تھی اس میں
کبھی گرج چمک سے خوف تھا اس میں
کبھی خود کو اس کے رحم پر چھوڑنا
کبھی پہاڑ کی گہرائی دیکھنا
ڈرتے ڈرتے قدم بڑھانا
گھر کے اپنے قریب ہو جانا
ماں کا خوش ہو کر ہاتھ ہلانا

فرخ سلطانہ

نظم

عجب پاگل سی لڑکی ہے
مجھے ہر روز کہتی ہے
بتاؤ کچھ نہیں نیا لکھا؟
میں جب بھی اس سے کہتا ہوں
کہ میں نے نظم لکھی ہے
مگر عنوان دینا ہے
بہت بیتاب ہوتی ہے
وہ کہتی ہے سناؤ تم
میں اسے اچھا سا عنوان دیتی ہوں
وہ میری نظم سنتی ہے
نظم کو اک عنوان دیتی ہے
اور اس کے آخری مصرعے کے نیچے
اپنا نام لکھتی ہے
میں کہتا ہوں یہ نظم تو میری ہے
وہ کہتی ہے
بڑا سادہ سا رشتہ ہے
کہ جس طرح تم میرے ہو
اسی طرح یہ نظم بھی میری ہے

ناصر عباس

غزل

نہ ہو بے وفا نہ با وفا لگتے ہو
نہ جانے کیوں اس دل کو اچھا لگتے ہو
کس کو کیا تو نے تیر نظر سے گھائل

جو آج یوں خون با صبا لگتے ہو
نہیں معلوم کہ تم ہو بھی بناوٹ سے پاک
یا ہم کو ہی سارے زمانے میں بے ریا لگتے ہو
یوں اپنے فیصلے دوسروں پر کرتے ہو صادر
جیسے سارے زمانے کے تم ہی ناخدا لگتے ہو
تیرے بارے میں اس سے بڑھ کر اور کیا کہیں ہم
ہمیں تو تم خدا سے مانگی ہوئی دعا لگتے ہو

شاہین سجاد

جاناں

مجھے اعتماد دو جاناں
اپنی محبت کا کچھ
احساس دو جاناں
کہ......
اس احساس کے ذریعے
مجھے دل میں اترنا ہے
مجھے خواب بننا ہے
جو......
میں نے خواب دیکھے تھے
انہیں تعبیر دو جاناں
مجھے اپنی چاہت کی کوئی زنجیر دو جاناں

فرزانہ شوکت

غزل

ہم تمہیں دل سے پیار کرتے ہیں
دونوں عالم نثار کرتے ہیں
وہ ستم بار بار کرتے ہیں
ہم مگر پھر بھی پیار کرتے ہیں
ان کا آنا بھی کیا قیامت ہے
رات دن انتظار کرتے ہیں
ان کے وعدے ارے معاذ اللہ
ہم مگر اعتبار کرتے ہیں
اپنے دامن کو اپنے اشکوں سے
اور ہم لالہ زار کرتے ہیں
اے امتیاز حسن کی جفاؤں کو!
ہم وفائیں شمار کرتے ہیں

ایس امتیاز احمد

نظم

تم کو سوچا
تم کو چاہا
محبت کی ابتدا یہ تھی......
محبت کی انتہا یہ ہے......
رات کا اندھیرا ہو
دن کا اجالا ہو
شام کا دھندلکا ہو
صبح کا سویرا ہو
غم کی گھٹا ہو
یا
خوشیوں کی برسات

''صنم''
تمہی کو چاہتے ہیں
تمہی کو سوچتے ہیں
تمہی کو مانگتے ہیں
تم مری دنیا کا درپن
تم میں ہے وہ اپنا پن
تم میرا جیون
تم مرے ساجن
میری محبت کی انتہا یہ ہے......!!

سیما سحر

غزل

کب میں نے یہ کہا ہے محبت نہیں کرنا
پر دیکھنا اس فعل میں شدت نہیں کرنا
مذہب کے خدوخال سے مت کرنا چھیڑ خانی
کامل ترین چیز میں جدت نہیں کرنا
یہ جرم گر نہیں ہے تو ہے جرم کی مانند
حق بات کو کہنے کی بھی جرات نہیں کرنا
بھٹکا ہوا جو آئے کبھی سیدھی راہ پر
اس کو سراہنا کبھی حیرت نہیں کرنا
کرنا تم انتظار صحیح وقت کا ساجد
دشمن کو زیر کرنے میں عجلت نہیں کرنا

سید ساجد شفیع

نظم

اک مدت سے شام نہیں ڈھلی
اک مدت سے دن نہیں نکلا
اک مدت سے زندگی ہے ٹھہری ہوئی
اک مدت سے خواب راستوں پر کوئی نہیں چلا
اک مدت ہوئی
ستاروں سے بات کیے
چاند سے ملاقات کیے
اک مدت سے
تجھے جو نہیں دیکھا

روحان دانش

غزل

دل کو بنجر زمین کو سیراب کرتی ہے تیری یاد تیرا خیال
دل کو شاد تو کبھی ناشاد رکھتی ہے تیری یاد تیرا خیال
روز بھر جاتی ہیں بے چینیاں دامن میں
ہے دل نگر میں بسی آج بھی تیری یاد تیرا خیال
بھول نہیں پائے آج تک وہ گزرے ماہ و سال
مجھ کو ہے جس سے پیار وہ تیری چاہ تیرا خیال
عزیز تر ہیں یادوں کے وہ حسین لمحات
وفا کو ہے آج بھی تیری یاد تیرا خیال

وفا شاہ

ڈر

اکثر اکیلے میں......
لبوں پہ ابھرنے والی شوخ مسکراہٹ
معصوم حنائی ہاتھوں کی تھرتھراہٹ......
لبوں سے نکلنے والے
حسین لفظوں میں تیری بات

...ں میں بسی تیری تصویر
گا ہے بگا ہے.......
شوخ سروں کی گنگناہٹ.......
ہوا میں عجیب سنسناہٹ.......
حسین آنکھوں میں تیرے لمس کی خوشبو.......
ہر ایک سے وہ راز نہ کہہ دے غزلؔ
جسے میں نے خود سے چھپایا ہے!

سمیرا غزلؔ حکمت اللہ صدیقی

غزل

ملائمت، شوخی، ابر بلداں، چمن، صبا یا آفتاب مہتاب لکھوں
ہوا اذن مجھ کو تمہاری مدحت میں اور کیا کیا جناب لکھوں
میں حسن والوں کے ناز نخرے کہ عاشقوں کا عذاب لکھوں
گزرتے لمحوں کے کرب لکھوں کہ آنے والوں کے خواب لکھوں
کتاب اس کے بدن پر لکھوں کہ ہر ایک ادا کا نصاب لکھوں
سرورق ہو وہ چہرہ گل، پس ورق اپنی کتاب لکھوں
چرا کے قوس وقزح کے رنگوں سے کہ اس کے لبوں کا لکھوں
میں اس کے مژگاں کو پنکھڑی اور اس کے رخ کو گلاب لکھوں
جب اس کے طرزِ عمل کو دیکھوں تو واجدؔ اس کی نگاہیں چناب لکھوں
یہ حکم جاری ہوا ہے کہ اپنے خون کو بارنگِ آب لکھوں

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی

سب آوازیں تیری ہیں......

کیوں مجھ کو تم لکھتے ہو
میری خاطر جگتے ہو
مدھر مدھر نینوں میں
خواب میرے ہی بنتے ہو
خلوت میں تم سجتے ہو
ظریفؔ احسن سے ملتے ہو
گیت سریلے لکھتے ہو
بانسری ہو یا شہنائی
ہونٹوں سے آ لگتے ہو
ڈھاکہ ہو یا مظفر گڑھ
ہر جا ہر پل تو ہی تو
وشت و دریا بن میں تو
سانسوں میں تم بستے ہو
بنگال کا جادو تجھ میں ہے
پنجاب کی سرسوں تجھ میں ہے
مشرق و مغرب کی خوشبو
سارے گا ما پا دانی
میرے گیت ہی لکھتے ہو
سات سروں میں بجتے ہو
سا سا سا سا، سارے گا
پا دانی سا، سارے گا
سننے والے کہتے ہیں
سب آوازیں میری ہیں
یادِ سفر کی دنیا میں
پڑھنے والے کہتے ہیں
ظریفؔ احسن کو لکھتے ہو
ظریفؔ احسن سے بجتے ہو

ظریفؔ احسن

غزل

غم جن کے برسوں سے ہم اٹھاتے رہے
وہی ہمیں پھر سے بھول جاتے رہے
یہ اور بات تھی ورنہ زندگی میں
بیتے دن پھر مجھے بھی رُلاتے رہے
بدل گیا موسم تیری یادوں کے ساتھ
گلشن میں پھول رنگ برنگے کھلتے رہے
پاس رہ کے بھی وہ میرا دل دُکھاتے رہے
جو تھے دل کے قریب نظروں سے دور جاتے رہے
کس کو دلائیں ہم اپنی وفا کا یقین جاوید
عہد محبت پھر لوگ مر مر کے نبھاتے رہے

محمد اسلم جاوید

اے کاش

تم سے دور رہ کر جینا کیسا ہوگا
یہ اکثر سوچا کرتے تھے ہم
لیکن یہ نہیں ہمیں معلوم تھا
اتنی جلدی بچھڑ جائیں گے ہم
تم بن رہنا کتنا مشکل ہے
یہ اب ہم نے جانا ہے دوست
اے کاش وہ وقت وہ لمحے واپس آ جائیں
اے کاش وہ وقت وہ لمحے واپس آ جائیں

فرزانہ عمر دراز

غزل

اک تمنا وصل کی اور اک اداسی بے وجہ
اک ادھوری عاشقی اور خام خیالی بے وجہ
مل کے کہنا ہے مجھے یہ آخری ہی بار تھا
پھر پلٹ آتا ہے واپس بدکلامی بے وجہ
روٹھ جاتا ہے یونہی اور ہجر مانگے بارہا
ہاتھ تھامے پیار کی نظمیں پرانی بے وجہ
بڑھ رہا ہے شوق اب نئی صحبت کے لیے
پچھلے وعدے بے وجہ اور ذات پیاری بے وجہ
لطف آتا ہے مجھے اب عاشقی کی راہ میں
لاپتہ منزل یونہی لمبی مسافت بے وجہ

محمد کاشف

کچھ کھٹی میٹھی یادیں

یاد آتا ہے مجھ کو وہ کالج کا زمانہ
ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں اور موسم سہانا
گرم گرم سموسے اور ٹھنڈی ٹھنڈی بوتل
گراؤنڈ میں بیٹھ کر دعوتیں اڑانا
فری پیریڈ میں صالحہ آپی کی غزلیں پڑھنا
نگران کو دیکھ کر جھٹ ''ردا'' بیگ میں چھپانا
غزلیں پڑھ کر مسکرانا
''تیرا ہونے لگا ہوں'' پہ تبصرہ فرمانا
تھوڑی سی بات پہ لڑنا، لڑ کے روٹھ جانا
جلد مان بھی جانا پھر گلے سے لگانا
یاد آتا ہے مجھ کو وہ کالج کا زمانہ

عفیفہ مریم

......☆☆☆......

سندیسے

روشن ہاشم .... کراچی

صالحہ آپی آداب! ٹائٹل بہت خوبصورت تھا۔ سلسلے وار ناول سب ہی اچھے چل رہے ہیں۔ مکمل ناول میں ایمان علی کا ''بیٹیاں سیدوں کی'' نے بہت متاثر کیا ہے۔ ویسے میں بھی سید فیملی سے تعلق رکھتی ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جیسا ایمان نے کہانی میں سیدوں کی رسم و رواج کے بارے میں بیان کیا ہے، ہم لوگ ان چیزوں سے کوسوں آگے نکل چکے ہیں۔ ہوسکتا ہے کسی گاؤں یا دور دراز شہر میں ابھی بھی ایسے لوگ ہوں جو اپنی بیٹیوں پر ظلم کی حد توڑ دیتے ہیں، بہر حال کہانی اچھی تھی۔ جیا قریشی کا ''میں خدا اور تم'' بھی اچھا لگا۔ ناولٹ دونوں ہی اچھے تھے۔ افسانے بھی پسند آئے۔ ردا کی ڈائری میں ریما نور رضوان کی ڈائری کا صفحہ بہت پسند آیا، دل میں اتر گیا۔ ذرا پھر سے کہنا میں سب نے ہی اچھا لکھا۔ باتیں صحت کی بہت اچھی تھیں، مچھلی کی افادیت کا مضمون پسند آیا۔ نیا سلسلہ ''دوستوں کے نام پیغام'' اچھا سلسلہ ہے۔ اب میں آتی ہوں گوشہ آگہی کی طرف۔ دسمبر کے جانے کا دکھ اور طویل راتوں کے گزرنے کا تذکرہ کیا کچھ یاد دلانے لگتا ہے۔ دل میں ملال پھر سے بھرنے لگا کوئی یاد آنے لگا۔ ظاہر ہے جن کے اپنے دل سے قریب رگوں میں خون بن کر دوڑنے والے رشتے دور چلے جاتے ہیں، ان کے درد کا عالم تو کوئی صالحہ آپی جیسا لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ آپی زندگی میں بہت کہانیاں ہوتی ہیں۔ ہمارے آس پاس کہانیوں کا ذخیرہ ہے پر ڈھونڈنے والا دل ہونا چاہیے۔ نجانے گوشہ آگہی پڑھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے:

شاید کچھ مشترک سا ہے مجھ میں اور ان میں
جو ملال دسمبر کی طویل راتوں میں ان کے دل
میں آبستا ہے
جنوری میں وہی ملال میرے دل میں بھی پلتا ہے
یہ سچ ہے جانے والے پلٹ کر نہیں آتے پر
ان طویل سرد راتوں میں ہم یادوں کے چراغ
پھر بھی جلاتے ہیں
شاید کسی کیلئے دسمبر کی راتیں طویل ہیں
لیکن ہماری تو جنوری کی شامیں بھی طویل ہیں
یہ سچ ہے جانے والے پلٹ کر نہیں آتے

شاہین سجاد .... صوابی

ڈیئرسٹ آپی آداب! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ردا کو اتنی کامیابی سے آگے بڑھانے پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کریں۔ ردا کی ترقی ہماری ترقی ہے۔ ردا دن بدن نکھرتا جا رہا ہے۔ ردا کے تمام سلسلے زبردست ہوتے ہیں۔ سلسلے وار ناول سارے بہت اچھے جا رہے ہیں۔ ''اس دل میں بسے ہو تم'' انعم خان کی کہانی خوب ہی ہے۔ باقی تمام کہانیاں بھی بہت اچھی ہیں۔ تمام اسٹاف کو دعا، ان تمام قاری بہنوں کا بہت شکریہ جنہوں نے میری تحریر کو پڑھا اور پسند کیا۔ نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت۔

افشاں علی .... کراچی

ڈیئر اینڈ سوئٹ سی صالحہ آپی السلام وعلیکم! امید برحق ہے کہ آپ، ردا کا تمام اسٹاف، تمام رائٹرز اور قارئین سب خیریت سے ہوں گے، سب سے پہلے تو آپی میں آپ کی بہت بہت مشکور ہوں کہ آپ نے نا صرف میرے سندیسے کو جگہ دی بلکہ دوستوں کے نام پیغام میں میرا پیغام بھی شائع کیا شکریہ جی۔ اس امید کے ساتھ کہ اس بار بھی میرا خط سندیسے کی رونق بنے گا ایک بار پھر حاضر ہوں۔

اب آتی ہوں نومبر کے عید نمبر کی طرف، ٹائٹل بہت زبردست اور اٹریکٹو تھا۔ ڈریسنگ، ہیئر اسٹائل اور میک اپ غرض سب ایک دم پرفیکٹ گا، گوشہ آگہی اور ردائے جنت کے بارے میں کیا ہی کہیں، یہ تو روز اول سے ہی بیسٹ اینڈ بیسٹ ہی ہوتے ہیں۔ ان دونوں کو پڑھتے ہوئے میری ''ریڈنگ ایکسپریس'' آگے بڑھی تو پہلا اسٹیشن آپ کا مکمل ناول ہی تھا۔ صالحہ آپی! میں اس ناول کے لئے کیا کہوں؟ کیسے کہوں؟ الفاظ ہی سمجھ نہیں آ رہے۔ اتنی خوبصورت اور باریک بینی سے 18 اکتوبر کے سانحے پر آپ نے لکھا کہ کب میری آنکھوں سے آنسو چھلکے پتہ ہی نہ چلا، بس اتنا ہی کہوں گی ''یو آر دی بیسٹ'' بارش جب تھمی تو ہر سو دھنک رنگ ہی نظر آئے، جی میں ثنا خان صنعا کے اضافے کی بات کر رہی ہوں۔ چہرے پر یوں ہی مسکراہٹ سجائے، پھر جب ہم آگے بڑھے تو دل سے آہ نکلی۔ ہائے کبھی عشق ہو تو پتہ چلے، شازیہ جی کے خوبصورت قلم سے لکھی تحریر میں ہم یوں کھو گئے پتہ ہی نہ چلا کہ کب چاروں طرف سکوت چھا گیا۔ سنسان سڑک پر ٹھہرے سکوت میں گہرے سانس لینے کے بعد ہم اپنے فیورٹ اسٹیشن اعتبار عشق پر پہنچے۔ کچھ دیر رُکے اور ہر لفظ کو امرت کی طرح گھول کر پینے کے بعد جب ہم آگے بڑھے تو راستے میں باقی سر سبز اسٹیشن بھی آئے جن میں سے ایک تو ہمارے دل کو بہت بھا گیا، عائشہ ذوالفقار کا افسانہ ''ہم کسے مقدر کہیں''، ہمیں بہت ہی اچھا لگا۔ ویل ڈن عائشہ جی! سفر تو ہمارا بھی چل رہا تھا اور ''اس دل میں بسے ہو تم'' میں بھی چاروں سہیلیاں بچھڑ کر اپنی نئی زندگی کے سفر پر گامزن اور رواں دواں نظر آئیں۔ ہمیں بہت زوروں کی بھوک محسوس ہونے لگی اس لئے فوراً کچن میں گھس گئے۔ آئے ہائے منہ میں پانی آ گیا اس بار تو Yami Yami رسپی دیکھ کر سوچا ہے انشاء اللہ عید پر ٹرائی کروں گی جسے آنا ہو آ جائیے گا کھلی دعوت ہے۔ موسٹ ویلکم (ہاہاہا) اس کے بعد ہماری ریڈنگ ایکسپریس کا سفر اس ماہ میں، اشعار، باتیں صحت کی، ذرا پھر سے کہنا، خوشبو، سندیسے، گوشہ چشم، دوستوں کے نام پیغام پڑھتے ہوئے سنگھار پر اختتام پذیر ہوا۔

ذرا پھر سے کہنا میں ہمیں ''عید کے دن'' ا ''اسے روک لو'' جبکہ ردا کی ڈائری میں ہمیں عدنا

ملک کی نظم بہت بہت پسند آئی اور اچھی لگی' ساتھ ہی نئے سلسلے کا اضافہ چار چاند لگا گیا۔ اس بار سفر میں ہماری ملاقات قمروش شہک سے ہوئی۔ ان سے مل کر اور باتیں کر کے (آئی مین باتیں سن کر) بہت اچھا لگا۔ نومبر کا یہ سفر واقعی یادگار اور دلچسپ رہا' میری طرف سے ردا کے تمام اسٹاف' رائٹرز کو نئے سال کی ڈھیروں مبارکباد۔

عمارہ حامد .... اسلام آباد

پیاری صالحہ آپی! السلام علیکم! ردا ڈائجسٹ سے واقفیت کچھ ماہ پہلے ہوئی جو اب پسندیدگی اختیار کر چکی ہے۔ بلاشبہ ردا ڈائجسٹ ایک معیاری ماہنامہ ہے۔ آپی! میں ماہنامہ کرن اور ماہنامہ حنا میں ایک ایک کہانی لکھ چکی ہوں لیکن آپی "ردا" میں پہلی دفعہ شرکت کر رہی ہوں۔ میں نے آپ کے انٹرویو میں پڑھا تھا کہ آپ نے لکھا تھا کہ آپ نئے لکھنے والوں کو ایک موقع ضرور دیتی ہیں چنانچہ اسی امید پر میں آپ کو ایک افسانہ "میرا نصیب" بھیج رہی ہوں۔ پلیز آپی! میری حوصلہ افزائی ضرور کیجیے گا۔ آپ خطوط کے جواب بہت پیار سے دیتی ہیں اور آپ کے اسی مشفقانہ اور پیار بھرے انداز سے حوصلہ پا کر میں ردا میں شرکت کر رہی ہوں۔ اپنے افسانے کے متعلق مجھے آپ کی رائے کا انتظار رہے گا اور آپی یہ بھی ضرور بتایئے گا کہ کہانی بھیجنے کے کتنے عرصے بعد کہانی کے بارے میں پتہ کرنا ہوتا ہے۔ مجھے لکھنے کا بے انتہا شوق ہے۔ اب اجازت چاہوں گی۔

جیا قریشی .... کراچی

ڈیئر آپی اینڈ ڈیئرسٹ قارئین السلام وعلیکم! فرسٹ آف آل تھینک یو سو مچ آپی ناول شائع کرنے کے لئے اینڈ تھینکس ٹو ڈیئر ریڈرز "میں خدا اور تم" پر اپنی قیمتی آراء دینے کے لئے۔ یہ میرا اب تک کا بہترین ناول تھا' یہ میں نہیں کہتی یہ کہتے ہیں میرے کزنز' میرے بھائی اور میری مام جو تعریف کرنے میں خاصی کنجوس ہیں مگر اس بار کر ہی دی۔ آپ کی تعریفیں ہم رائٹرز کیلئے ٹانک کا کام کرتی ہیں اور تنقید ہمیں اپنی غلطیوں سے روشناس کراتی ہے۔

اب آ جاتی ہوں سال کے پہلے شمارے کے تبصرے پر۔ ماڈل کی جیولری بہت اچھی تھی مگر ماڈل کچھ بھائی نہیں۔ فہرست پر نظر ڈالی تو آپی کے نام پر نظر پڑی اور جہاں ناول دیکھ کر ہم خوش ہوئے وہیں دل نے ناول کے اتنے خوبصورت نام پر کہا واؤ...... ابھی پڑھ نہیں پائی کہ فرصت کے لمحات میسر ہیں اور اس بار ڈائجسٹ بھی کچھ لیٹ ملا۔ صرف گوشہ آگہی' ردائے جنت' اپنا اور روشنی فاطمہ کا ناولٹ "شکست صدائے دل" ہی پڑھ پائی ہوں۔ ہر ماہ میں اتنا خوبصورت اداریہ پڑھ کر حیرت میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ ایک تو نئے موضوع کا انتخاب اور پھر اتنے دلکش و خوبصورت لفظوں کو پرونا آپ ہر ماہ یہ کیسے لکھ لیتی ہیں۔ روشنی فاطمہ نے "شکست صدائے دل" خوبصورت پیرائے میں لکھا۔

آپی! گوشہ قارئین کیا ختم کر دیا گیا ہے؟ کئی مہینوں سے شائع نہیں ہوا اور کسی رائٹرز کا انٹرویو نہیں دیا گیا۔ پلیز آپی اس سلسلے کو ختم مت کریئے گا۔

عانیہ نیازی .... ربوہ

سوئٹ آپی! کیسی ہیں آپ؟ ردا کا سالِ نو نمبر اس سال بھی جھلملا رہا ہے اتنا خوبصورت ماہنامہ کیلئے مبارکباد قبول کریں۔ ماڈل سیتا تو اپنی مسکان کے ساتھ بہت ہی خوبصورت پنک کلر کے سوٹ میں حسین لگ رہی ہیں اور جیولری کی تو کیا ہی بات ہے۔ اندر داخل ہوئے تو سب سے پہلے جب فہرست پر نظر پڑی تو ٹھہر ہی گئی۔ آپی! اتنے دنوں کا انتظار آخر آپ نے ختم کر ہی دیا۔ ناول نام کی طرح خوبصورت لگا۔ میں آپ کو اس ناول کیلئے بہت ساری دعائیں اور وشز کرتی ہوں کہ یہ عمدہ سے عمدہ اور سرفہرست رہے۔ ناول کے کیریکٹرز اچھے لگ رہے ہیں۔ یہ مجھے اپنے ہی اردگرد کی کہانی لگ رہی ہے۔ بہت کچھ لکھنا چاہتی ہوں مگر مجھے معلوم ہے لیٹر طویل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ سلسلے وار ناولز سارے ہی اچھے جا رہے ہیں۔ مکمل ناول صنوبر فہیم کا پسند آیا۔ انعم خان بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ جیا قریشی کے ناول کا اینڈ اچھا لگا۔ ناولٹ روشنی فاطمہ کا بے حد پسند آیا۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ نئی رائٹرز بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ ثنا خان صنعا کی تحریریں اچھی ہوتی ہیں۔ تبسم فیاض کا افسانہ اچھا تھا۔ باقی سارے ہی رائٹرز نے بہت اچھی تحریریں لکھیں۔ مستقل سلسلوں میں سالِ نو پر نظمیں بہت اچھی تھیں۔ آپی کی نظم تو نمبرون پر تھی' باقی سارے سلسلے بہت اچھے جا رہے ہیں۔ دوستوں کے نام پیغام ایک اچھا سلسلہ ہے۔ اس کو پلیز جاری رکھئے گا۔ باتیں صحت کی اس کالم سے ہمیں بے حد معلومات ملتی ہیں۔ اب اجازت دیجئے۔

شبانہ شفیق سحر .... کراچی

ڈیئر صالحہ آپی اینڈ ردا اسٹاف اور تمام رائٹرز اینڈ قارئین السلام وعلیکم! سب کو میری طرف سے نیا سال مبارک ہو۔ اب آتے ہیں ردا کے تبصرے کی طرف تو جناب ٹائٹل گرل خوب اچھی تھی پسند آئی۔ گوشہ آگہی اور ردائے جنت سے مستفید ہوئے۔ صالحہ آپی! آپ کا نیا ناول "رگ جاں سے جو قریب تھے" ابھی پڑھا نہیں لیکن آپ کا نام ہی کافی ہے۔ نام بہت اچھا لگا۔ شازیہ مصطفیٰ عمران "عشق ہو تو پتہ چلے" بہت اچھا جا رہا ہے۔ سباس گل بھی اچھا لکھتی ہیں۔ انعم خان کا ناول بھی اچھا ہے اور ہمارا فیورٹ ناول سانس' سڑک اور سکوت نائلہ طارق بہت اچھا لکھتی ہیں' ہماری خواہش ہے کہ ہم نائلہ طارق کو روبرو دیکھیں اور ان کے جیسا اتنا اچھا لکھ سکیں۔ افسانے سارے اچھے تھے۔ جیا قریشی کا مکمل ناول "میں خدا اور تم" بہت زبردست تھا پڑھ کر بہت انجوائے کیا' شعر و شاعری تو جناب یہ تو ساری اچھی تھی اس لئے بھی کہ ہمیں شعر و شاعری پڑھنے کا شوق ہے کرنے کا بھی پر کر نہیں پاتے۔ صالحہ آپی! ہم تقریباً چار پانچ سال کے خاموش قاری ہیں آج پہلی نہیں (سوری) دوسری مرتبہ انٹری دے رہے ہیں اپنے افسانے کے ساتھ کہ آپ ہمیں جگہ دیں گی۔ آپ سب کیلئے دعا گو اور آپ سب کی دعاؤں کی طلبگار' اللہ تعالیٰ ردا کو ہمیشہ ترقی دے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

صالحہ محمود

گوشہ چشم

روشن ہاشم .... کراچی

پیاری روشن ہاشم! ردا کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ نیا سلسلہ دوستوں کے نام پیغام قارئین کو پسند آرہا ہے جس کیلئے بہت شکریہ۔ کوئی بھی قاری اس میں شامل ہو سکتی ہیں۔ آپ کی حوصلہ افزائی سے ہی نئے رائٹرز مزید بہتر سے بہترین لکھ پائیں گی۔ آپ اپنے سندیسوں کے ذریعے ہی اپنی رائے کا بہترین اظہار جاری رکھئے اپنا بہت خیال رکھئے۔

شاہین سجاد .... صوابی

سوئٹ شاہین سجاد! بہت بہت شکریہ۔ آپ کی تحریر ہمیں موصول ہو گئی ہے۔ آپ ردا سے یونہی جڑی رہیں اور سندیسے کے ذریعے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیجیے۔ اپنا بہت خیال رکھئے۔

افشاں علی .... کراچی

سوئٹ افشاں علی! آپ کا لیٹر بہت ہی لیٹ ملا جس کی وجہ سے دسمبر میں شائع نہیں ہو سکا۔ لیکن ہم خطوط کو ردی کی ٹوکری میں نہیں پھینکتے اس لئے آپ کا یہ لیٹر فروری کے شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ردا پر آپ کا تبصرہ واقعی اچھا لگا۔ ناول کی پسندیدگی کا بہت شکریہ۔ نئے کالم کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ جو بھی قارئین اس میں شرکت کرنا چاہیں وہ کر سکتے ہیں۔ نئے سال کی آپ کو بھی ڈھیروں مبارکباد۔

سعدیہ خان آفریدی .... کراچی

پیاری سعدیہ آپ کی کہانی ہمیں موصول ہو گئی ہے۔ آپ کو بہت مبارک ہو آپ کی شادی ہو گئی اور ایک بیٹی بھی ہے۔ آپ کی دعاؤں کا بے حد شکریہ۔ اپنا بہت خیال رکھئے، آپ فون کالز کے ذریعے اپنی تحریر کے بارے میں پوچھ سکتی ہیں۔

عمارہ حامد .... اسلام آباد

سوئٹ عمارہ حامد! ردا میں شمولیت کیلئے شکریہ۔ بالکل ردا نئے لکھنے والے رائٹرز کیلئے ہی بنا ہے۔ آپ بالکل مایوس نہ ہوں اسٹوری جلد ہی شائع کر دی جائے گی۔ آپ اپنے شوق کو مزید بڑھائیے اور لکھتی رہئے۔ بالکل ردا ایک موقع ضرور دیتا ہے۔

جیا قریشی .... کراچی

سوئٹ جیا قریشی! آپ کے بھیجے گئے ناولز ہمیں موصول ہو گئے ہیں کیونکہ آپ سلسلے وار بھیج رہی تھیں کمپلیٹ ہونے پر ہی شائع کیے جاتے ہیں اور بہت جلد ہی آپ کی تحریریں شائع کر دی جائیں گی۔ گوشہ قارئین کا سلسلہ بالکل جاری ہے یہ ختم نہیں کیا گیا۔

عظمیٰ عابدی .... اسلام آباد

پیاری عظمیٰ! جس خوبصورتی سے آپ نے ناول کی تعریف کی ہے بہت ہی اچھا لگا۔ آپ کا ردا سے تعلق بہت خوبصورت ہے قارئین کی ہی حوصلہ افزائی

سے رائٹرز میں مزید اچھا لکھنے کا جوش پیدا ہوتا ہے۔ ہماری بھی یہ دعا ہے کہ نئے سال میں ملک میں امن و سلامتی کا سورج چمکتا رہے۔ اور ہر شخص ایک آزاد شہری کی طرح کھلی فضا میں سانس لے۔ اپنا بہت خیال رکھئے۔ آپ مستقل سلسلوں میں شامل ہونا چاہتی ہیں، ضرور۔ ردا آپ کا ہی ماہنامہ ہے جو کہ آپ کی پرخلوص محبتوں سے ہی چل رہا ہے۔

عانیہ نیازی .... ربوہ

سوئٹ عانیہ! آپ کا تبصرہ تو ہمیشہ ہی اچھا ہوتا ہے۔ جس خلوص سے آپ لکھتی ہیں یہ ردا کیلئے بہت اچھی بات ہے۔ آپ اسی طرح اپنی رائے کا اظہار کرتی رہئے۔ بالکل نئے کالم کو ہم آگے بھی جاری رکھیں گے۔ اس کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ اپنا بہت خیال رکھئے، ردا سے جڑی رہئے۔

شبانہ شفیق سحر .... کراچی

پیاری شبانہ شفیق سحر! جنوری کے ردا پر آپ کا تبصرہ اچھا لگا۔ آپ کے پیغامات رائٹرز تک آپ کی تحریر کے ذریعے پہنچ جاتے ہیں۔ آپ کی تحریر ہمیں موصول ہو گئی ہے۔ ردا بالکل نئے لکھنے والوں کے لئے گائیڈ کارنر ہے۔ آپ کوشش جاری رکھئے اور اپنا بہت خیال رکھئے۔

انعم خان .... ہری پور ہزارہ

پیاری انعم خان! آپ کی تحریریں ہمیں موصول ہو گئی ہیں۔ آپ کے پیپرز کے لئے بیسٹ آف لک۔ آپ کو میرا نیا سلسلے وار ناول پسند آیا جس کے لئے بہت شکریہ۔ اپنا بہت خیال رکھئے۔

ام فروا .... کراچی

پیاری ام فروا! ردا میں سندیسہ لکھنے کے لیے بہت بہت شکریہ۔ میرے سلسلے وار ناول کی پسندیدگی کا بہت شکریہ۔ ردا پر آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آپ ردا بہت شوق سے پڑھتی ہیں یہ جان کر خوشی ہوئی۔ آپ ہمارے سلسلوں میں شامل ہوتی ہیں آئندہ بھی آپ کوشش کریں کہ ردا سے منسلک رہیں۔ اپنا بہت خیال رکھئے گا۔

ماہ نور نواز .... ملتان

سوئٹ ماہ نور! مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ اتنی کم عمر میں ردا بہت شوق سے پڑھتی ہیں لیکن ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی پر توجہ دیں۔ آپ کو ہماری سبھی رائٹرز کی سلسلے وار کہانیاں پسند آ رہی ہیں جس کے لیے شکریہ۔ اگر آپ لکھنے کی شوقین ہیں، ردا گائیڈ کارنر نئے لکھنے والوں کے لیے ہے۔ آپ ہمارے سلسلوں میں بھی شامل ہو سکتی ہیں اور ہمارا نیا سلسلہ "دوستوں کے نام پیغام" میں بھی اپنی دوستوں کو وش کر سکتی ہیں۔ یہ میسج سب قارئین کے لیے ہے۔

ماہین زہرہ .... کراچی

پیاری ماہین! آپ کا لیٹر بہت ہی لیٹ ملا اس لیے جنوری میں شامل نہیں ہو سکا لیکن ہم اس ماہ اس کا جواب دے رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا تھا کہ میں لکھنے کی شوقین ہوں اور اپنا افسانہ بھیجنا چاہتی ہوں تو ضرور بھیجئے۔ کیونکہ ہم نئے لکھنے والوں کو نظر انداز نہیں کرتے اور ایک موقع ضرور دیتے ہیں۔ اپنا بہت خیال رکھئے گا اور سندیسہ لکھتی رہیں، ساتھ ساتھ اپنی رائے کا بھی اظہار ضرور کریں۔ آپ کی تنقید اور تعریف سے ہی ہماری رائٹرز بہتر سے بہترین لکھ پائیں گی۔

☆☆☆

دوستوں کے نام پیغام

میری پیاری کزن امبرین! آپ کو شادی کی بہت بہت مبارکباد ہو۔ میں آپ کو بہت مس کر رہی ہوں۔ آپ کب ملنے آئیں گی۔

ہما خان...... اسلام آباد

☆☆☆

مائی فیورٹ رائٹر سباس گل! میں ردا کے ذریعے آپ کو وش کرنا چاہ رہی تھی آپ کو شادی کی مبارکباد قبول ہو۔ آپ میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ آپ کی اسٹوری میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور یہ وش کرتی ہوں کہ نیا سال آپ کیلئے خوشیاں لے کر آئے۔

نادیہ اظہر...... سکھر

☆☆☆

سوئٹ فرینڈ شبینہ! تم کب تک مجھ سے ناراض رہو گی؟ میں تم سے سوری کرتی ہوں اب تو تم مجھ سے خفا نہیں ہو۔ ردا کا یہ کالم بہت اچھا ذریعہ ہے دوستوں کو منانے کا۔ پلیز اپنی ناراضگی دور کرو۔

طلعت اقبال...... کراچی

☆☆☆

السلام وعلیکم صالحہ آپی! ردا میرا پسندیدہ ماہنامہ ہے آپ میری پسندیدہ رائٹر۔ آپ کا نیا ناول پڑھ کر میرا دل چاہا کہ میں آپ کو اسپیشل مبارکباد دوں تو "دوستوں کے نام پیغام" کے ذریعے میں آپ کو وش کرتی ہوں۔ آپ کی یہ کہانی بہت منفرد ہے میری دعا ہے کہ یہ آگے چل کر اور بھی خوبصورت موڑ لے

آمنہ فاروق...... لاہور

☆☆☆

پیاری شازیہ مصطفیٰ! اب تو آپ شازیہ مصطفیٰ عمران بن گئی ہیں لیکن آپ لکھنا کبھی نہیں چھوڑیے گا نئی خوشیوں کیلئے بیسٹ آف لک۔

تبسم گل...... خانیوال

☆☆☆

سوئٹ سسٹر رشا ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ میں نے سوچا اس بار تمہیں کیا تحفہ دوں تو خیال آیا کہ تمہیں نئے طریقے سے وش کروں۔ میں نے ایڈوانس ہی تمہیں وش کر دیا۔ اب تو خوش ہو ناں۔

شمائلہ معین...... کراچی

☆☆☆

ردا کی رائٹرز کے نام! میرا بہت ہی خلوص سے ردا کی تمام رائٹرز کو محبت اور پیار بھرا اسلام۔ ردا میرا فیورٹ میگزین ہے اس میں لکھنے والی تمام ہی رائٹرز بہت عمدہ لکھتی ہیں۔ میری دعا ہے کہ 2012ء میں بھی ردا کی رائٹرز اپنے قلم سے ردا کو سجاتی رہیں اور ردا ترقی کرتا رہے آمین۔

صبا ملک...... ہری پور ہزارہ

☆☆☆

مائی سوئٹ رائٹرز نائلہ اور انعم جی! میں آپ کو بے حد پسند کرتی ہوں آپ کا انداز تحریر مجھے بے حد پسند ہے۔

ثنا خان حنا...... ملتان

☆☆☆

پیاری سسٹر سحرش! آپ کی زندگی میں آنے والی خوشیوں کے لئے میں بہت دعا گو ہوں۔ ایک ماہ بعد آپ کی شادی ہے جس کیلئے میں بہت خوش ہوں اور ڈھیر ساری دعائیں آپ کیلئے۔ آپ ہمیشہ یونہی ہنستی اور مسکراتی رہیں آمین۔

جمیلہ اعوان...... فیصل آباد

☆☆☆

ڈیئر کرن! سالگرہ مبارک۔ تم میری دوست ہی نہیں بلکہ میری عزیز ترین کزن بھی ہو۔ تم مجھے سالگرہ پر نہ بھی بلواؤ تب بھی میں ضرور آؤں گی کیک تیار رکھنا سوئٹ۔

حبیبہ طارق...... اسلام آباد

☆☆☆

سوئٹ فرینڈ ہانیہ! مجھے طوبیٰ سے پتہ چلا کہ تمہاری منگنی ہو گئی ہے جس کیلئے میں بہت خوش ہوں اور تمہیں مبارکباد دیتی ہوں لیکن تم نے یہ خوش خبری مجھ سے کیوں چھپائی اس کیلئے میں تم سے ناراض ہوں۔ ردا کے ذریعے میں اپنی اس ناراضگی کا اظہار کر رہی ہوں لیکن واقعی میں بہت خوش ہوں اب جلدی سے تم میری ناراضگی کو ختم کرو اور مجھ سے بات کرو۔ مجھے بہت خوشی ہو گی۔

بینا طاہر...... کراچی

☆☆☆

صالحہ محمود اور ردا اسٹاف کیلئے! میں اسپیشل وش کرنا چاہتی تھی سو میں نے سوچا کیوں نہ میں دوستوں کے نام پیغام کے ذریعے ردا کے اسٹاف سے مخاطب ہو جاؤں۔ ردا بہت نکھرتا جا رہا ہے اور آنے والے دنوں میں یہ مزید سنور کر سامنے آئے اس کیلئے میں اور میری تمام فرینڈز بہت زیادہ دعا گو ہیں اور جس طرح سے پچھلے سال میں ہماری رائٹرز نے بہت محنت سے ردا کو نکھارا اس سال بھی ہمیں ان سے ڈھیروں امیدیں وابستہ ہیں۔ یہ سال بھی سب کے لئے خوشیاں لے کر آئے اور ردا مزید ترقی کرے آمین۔

یسریٰ شہزادہ...... لاہور

☆☆☆

السلام وعلیکم! ڈیئر سباس گل کیسی ہیں آپ؟ آپ کو شادی کی بہت بہت مبارک ہو۔ میری دعا ہے کہ آپ کی آئندہ کی زندگی نہایت شاندار گزرے۔ ڈیئر سسٹر انعم خان کو بھی سلام اور جناب ذرا اسٹڈیز پر بھی توجہ دو۔ اگلے مہینے تمہارے پیپرز ہیں کچھ خیال کرو۔ 24 جنوری کو تمہاری اور شاہد بھائی کی سیکنڈ ویڈنگ اینیورسری ہے۔ میری دعا ہے کہ تم دونوں زندگی کی ڈھیروں ہزاروں بہاریں دیکھو اور ایک ساتھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہر مسافت طے کرو (آمین) میری تمام دوستوں کو بیسٹ آف لک۔ صالحہ آپی! آپ کے نئے ناول کو پڑھ کر بے حد مزہ آیا۔ آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ اللہ حافظ۔

کنول خان...... ہری پور

☆☆☆

"زویا خان فرام اشرف نگر کے نام"

السلام وعلیکم زویا! کیسی ہو؟ تمہاری آفر بلکہ سوال سر آنکھوں پر۔ مجھے تمہاری دوستی قبول ہے اور میں بہت خوش ہوں کہ اپنی پہلی ہی آمد پر تم نے مجھے مخاطب کیا۔ دوستی پکی سمجھو اور اپنے بارے میں بتاؤ کیا کرتی ہو وغیرہ وغیرہ...... میں انتظار کروں گی اب تمہارے جواب کا۔ اینڈ مائے ڈیئرسٹ فرینڈ سدرہ! کیسی ہو؟ اب کے تمہیں تمہاری پیاری بیٹی ہادیہ کو بہت بہت سارا پیار اور تمہاری طرف سے مجھے خالہ بننے پر بہت زیادہ مبارکباد (ہاہاہا) میری بھانجی میری جان حورین کو بہت سارا اور مہ روش اور ایشال کو ڈھیروں پیار۔ سب کے لئے دعا گو اور دعاؤں کی طلبگار۔

انعم خان...... ہری پور ہزارہ

☆☆☆

باتیں صحت کی

پودینہ

عام طور پر لوگ پودینے کو ایک معمولی سبزی تصور کرتے ہیں، مگر یہ ایک سستے داموں ملنے والی زود ہضم، معدہ اور آنتوں کو طاقت دینے والی غذا ہے۔ معدہ اسے دو تین گھنٹوں میں ہضم کر لیتا ہے۔

افادیت

یہ خوشبودار سبزی ہے۔ اس کی خوشبودار لذیذ چٹنی بے حد پسند کی جاتی ہے، یہ ہاضم ہوتی ہے۔ پودینے کا رائتہ بھی خوش ذائقہ، ہاضم اور طاقت بخش ہوتا ہے۔

بدہضمی، ڈکاروں کی کثرت، ریاح، گیس، منہ کی بدبو دور کرنے والی یہ غذا شافی دوا بھی ہے۔ قدرت نے غذائی نالی کو مضبوط بنانے کے لیے اس میں تھوڑی مقدار میں نشاستہ دار گلوکوز بنانے والے اجزا شامل کر دیئے ہیں۔

وہ افراد جو بھوک کی کمی کا شکار رہتے ہیں، وہ کھانے کے وقت مولی، شلجم، گاجر، سیب، امرود کسی بھی ایک چیز میں اتنا ہی پودینہ ملا کر اس میں لیموں کا رس نچوڑ کر سلاد بنا کر کھائیں تو بھوک خوب کھل اٹھے گی۔ کمزور اور ضعیف افراد کو صحت بھی حاصل ہو جائے گی۔ نیند کم آنے کی شکایت والی خواتین اگر اس میں ہرا دھنیا اور پیاز بھی شامل کر لیں تو نیند کی کمی یا نیند نہ آنے کی شکایت بھی رفع ہو جائے گی۔

پودینے کے پتے معدے کی جلن اور غذائی نالی کی جلن میں بہت مفید ہوتے ہیں، متلی، قے میں اس کے پتے پیس کر سرکہ ملا کر صبح ناشتے کے طور پر استعمال کرنے سے ایسی تکلیف ختم ہو جانے کے ساتھ ساتھ صحت بھی اچھی ہو جاتی ہے۔ پودینہ علاج کے علاوہ ٹھنڈک دیتا ہے۔

جلد کیلئے بہترین ٹانک

یہ جلد کے داغ دھبوں، چھائیوں کو صاف کرنے کے لیے مشہور ہے۔ چکنی جلد کو شگفتگی بخشنے اور نکھارنے کیلئے بطور ٹانک استعمال ہوتا ہے۔ چہرے کی خوب صورتی کیلئے پودینہ لاجواب ہے۔ اس کیلئے پودینے کے پتوں کو دھو کر پیس کر روزانہ چہرے پر لیپ کیا جائے اور تھوڑی دیر بعد سادے پانی سے چہرہ دھو لیں تو اس سے چہرہ بے حد خوبصورت ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پودینہ کی پتیاں لے کر انہیں ابالیں اور اس کا پانی نہار منہ پئیں، اس سے رنگت نکھر کر گوری ہو جائے گی۔ اگر چہرے کو سرخ سفید بنانا ہو تو اس کیلئے صاف پودینے کی پتیاں لے کر انہیں خوب ابالیں۔ ان کا پانی کھلے منہ کے برتن میں ڈال کر ٹھنڈی جگہ پر رکھ دیں اور روزانہ چائے کا چوتھائی کپ بلاناغہ صبح نہار منہ استعمال کریں، مسلسل استعمال سے چہرہ سرخ سفید ہو جاتا ہے۔

پودینہ کی پتیاں پانی میں ابال کر اسے پینے اور اس کی کلیاں کرنے سے منہ کی بدبو دور ہو جاتی ہے اور سانس میں خوشگوار مہک پیدا ہو جاتی ہے۔ بڑھتے ہوئے پیٹ کو بڑھنے سے روکنے میں بھی پودینہ بہترین ہے۔ پودینہ کے اجزا ٹوتھ پیسٹ، ماؤتھ واش، چیونگم وغیرہ میں شامل ہیں اگر پودینہ کے ٹوتھ پیسٹ سے دانت صاف کر کے پودینے کے ماؤتھ واش سے کلیاں کی جائیں اور چائے کافی وغیرہ کے بعد پودینے کی چیونگم چبائی جائے تو اس سے منہ کی ناخوشگوار بو کے مسئلے سے نجات ہو سکتی ہے۔ ☆☆☆☆☆

ثریا اقبال

کچن

سبزیوں کا مزے دار سوپ

اجزاء۔

آلو	آدھا کلو
گاجر	ایک پاؤ
شلجم	ایک پاؤ
پیاز	ایک عدد
پودینہ	تھوڑے سے پتے
مکھن	چائے کا ایک چمچہ
پانی	تین پاؤ
تیز پات	دو عدد
نمک	حسب ضرورت
سیاہ مرچیں	حسب پسند
دودھ	آدھا کلو
دھنیا	حسب ضرورت

ترکیب۔

آلو گاجر، شلجم اور پیاز چھیل لیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں، پودینہ صاف کر کے دھو لیں اور باریک کتر لیں، ایک دیگچی میں مکھن گرم کریں اور اس میں آلو، پیاز اور پودینہ ڈال کر پانچ منٹ تک فرائی کریں، سبزیاں ہلکی سی نرم ہو جائیں گی، بقیہ سبزیاں شامل کر کے مزید پانچ منٹ اور تلیں پھر پانی شامل کر لیں، تیز پات، نمک اور سیاہ مرچ پیس کر ڈال دیں، ابال آ جائے تو آنچ دھیمی کر دیں اور ڈھکن سے ڈھانپ کر پندرہ سے بیس منٹ پکنے دیں سبزیاں گل جائیں تو تیز پات کو نکال کر پھینک دیں، سوراخ دار کفگیر سے کھانے کے دو بڑے چمچے کے برابر سبزیاں نکال کر کچل کر لیں، اب بقیہ سبزیوں اور ان کے شوربے کو ...... باریک پیس کر یکجان کر لیں اگر گرائینڈر نہیں ہے تو کفگیر کی مدد سے کچل لیں پھر باریک چھلنی میں چھان لیں اور سوپ میں دودھ شامل کر کے چمچہ سے اچھی طرح ملائیں پھر سوپ چھان لیں، مکھن ڈال کر کالی مرچ چھڑکیں، مزے دار سوپ تیار ہے، یہ چھ افراد کے لئے کافی رہے گا۔

ٹماٹر کا مسالے دار سوپ

اجزاء۔

ٹماٹر	آدھا پاؤ
پیاز	دو عدد
لونگ	چار عدد
دار چینی	ایک ٹکڑا
چنے کی دال	ایک چوتھائی پیالی
ثابت سیاہ مرچ	چھ عدد
ہلدی	چٹکی بھر
گھی	کھانے کا ڈیڑھ چمچہ
لیموں کا رس	حسب پسند

نمک — حسب ضرورت

پانی — آدھا جگ

ترکیب۔

پانی کو ایک ساس پین میں ڈال دیں اور جب جوش آجائے تو ہلدی ڈال دیں اور ایک چائے کا چمچہ گھی اور اچھی طرح دھلی ہوئی دال شامل کرلیں دال کے نرم ہونے تک خوب ابالیں اور پھر گھوٹ لیں اور اسے چھان کر علیحدہ برتن میں انڈیل لیں' کٹی ہوئی پیاز' لونگ' دار چینی اور ثابت سیاہ مرچ اور ٹماٹر کاٹ کر ڈال دیں' اب ان سب کو ابال لیں اور چمچہ سے ٹماٹر کو گھوٹ لیں' اب اسے چھان کر کسی تیسرے برتن میں ڈال دیں' لیموں کا رس ڈال دیں اور حسب پسند نمک چھڑکیں اور ایک چمچہ گھی بھی اس آمیزے میں ڈالیں اور جب گھی گرم ہوجائے تو تھوڑی سی کٹی ہوئی پیاز اور شامل کردیں' جب پیاز براؤن ہوجائے تو سوپ میں ڈال دیں اور سوپ کو ڈھانپ کر چولہے سے اتارلیں۔

آلو اور پنیر کا سوپ

اجزاء۔

آلو — دو عدد (درمیانے سائز)

پیاز — آدھی کٹی ہوئی

نمک — چائے کا ایک چمچہ

پانی — آدھی پیالی

دودھ — دو پیالی

کارن فلور — کھانے کا ایک چمچہ

کالی مرچ — چائے کا ایک چوتھائی چمچہ

پنیر — ایک پیالی

دھنیا — چند پتے

ترکیب۔ آلو اور پیاز چھیل لیں' انہیں ٹکڑے کرکے ابال لیں اور بعد میں ان دونوں کا بھرتہ بنالیں' آدھی پیالی دودھ لیں' اس میں کارن فلور ڈال کر اچھی طرح ملائیں' باقی بچا ہوا دودھ آلو کے بھرتے میں ڈال دیں' کڑاہی لے کر اس مرکب کو پکائیں اور چلاتی رہیں' ایک وقت آئے گا کہ ان میں بلبلے بننے لگیں گے' تب نمک اور کالی مرچ اس میں شامل کرلیں اچھی طرح پک جائے تو اتارلیں۔

چائنیز سوپ

اجزاء۔

چکن (بون لیس) — آدھا کلو

کارن فلور — کھانے کے تین چمچے

پیاز — ایک عدد (باریک کٹی ہوئی)

انڈے — دو عدد (صرف سفیدی)

کالی مرچ — چائے کا ایک چمچہ

چائنیز نمک — کھانے کا ایک چمچہ

ہری مرچ — دو عدد

سویا ساس — کھانے کا ایک چمچہ

نمک — حسب ذائقہ

ترکیب۔ مرغی کے پیس اچھی طرح دھولیں' ایک ساس پین میں مرغی' باریک کٹی ہوئی پیاز' سیاہ مرچ' نمک اور پانی ڈال کر یخنی تیار کریں' گوشت گل جائے تو یخنی چھان کر الگ نکال لیں' ابلی ہوئی بوٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں' ایک پیالی پانی میں کارن فلور کو اچھی طرح سے حل کریں' یخنی میں کارن فلور کا آمیزہ اور چھوٹے چھوٹے گوشت کے ٹکڑے ڈال کر دھیمی آنچ پر چند منٹ تک پکائیں' جب سوپ آپ کی پسند کے مطابق گاڑھا ہوجائے تو انڈے کی سفیدی ملادیں اور چمچہ سے سوپ میں خوب اچھی طرح مکس کریں مزے دار چائنیز سوپ تیار ہے۔

وائٹ کیک

اجزاء۔

میدہ — 1-3/4 کپ

بیکنگ پاؤڈر — ایک کھانے کا چمچ

مکھن — ایک چھوٹی ٹکیہ

چینی — ایک کپ

انڈے — دو عدد

ونیلا ایسنس — ایک چائے کا چمچ

دودھ — تھوڑا سا

نمک — چٹکی بھر

ترکیب۔ میدہ' بیکنگ پاؤڈر اور نمک چھان کر ایک طرف رکھ لیں' پھر مکسچر سے باریک شدہ چینی اور مکھن خوب پھینٹ لیں پھر انڈے اور ونیلا ایسنس کو مزید پھینٹیں تقریباً پانچ منٹ تک' اب آہستہ آہستہ میدہ ملادیں اور ساتھ ہی مناسب مقدار میں دودھ بھی' اب دو عدد 8 سائز کے گول سانچے جن کو چکنا کرکے میدہ چھڑک لیا گیا ہو' مرکب کو برابر مقدار میں ان سانچوں میں ڈال دیں اور سطح ہموار کرلیں' 180°C پر پہلے سے گرم شدہ اوون میں رکھ کر 30 سے 35 منٹ تک بیک کریں (اگر اوون چھوٹا سا ہے تو درجہ حرارت 170°C پر رکھیں) کیک کو انگلی سے دبا کر دیکھیں اگر اسفنج کی طرح دب جاتا ہے تو تیار ہے' چند منٹ سانچے میں رکھ کر ٹھنڈا ہونے دیں پھر پلیٹ میں پلٹ کر سجاوٹ کریں' سفید کیک کی اس بنیادی ترکیب کو مختلف طریقوں سے مختلف ذائقوں میں بھی بنایا جاسکتا ہے۔

گاجر کا حلوہ

اجزاء۔

گاجر — دو کلو

شکر — ایک پاؤ

چھوٹی الائچی — چند عدد

پستے — حسب پسند

اخروٹ — حسب پسند

بادام — حسب پسند

گھی — آدھا پاؤ

ترکیب۔ گاجر کو سامنے سے پکڑ لیں اور پھر چھری سے کھرچیں اور پیچھے کا حصہ کاٹ دیجئے' سب گاجریں اسی طرح سے کرکے آپ انہیں پانی سے دھولیں' بیچ سے چار عدد کریں اور موٹے موٹے کاٹ کر دیگچی میں ڈالیں' اتنا پانی اس میں ڈالیں کہ وہ گل جائیں' کچھ دیر دھیمی آنچ پر پکنے دیں ڈھکنا بند رکھیں' لیکن تھوڑا سا کھول دیں تاکہ گاجروں کا کلر مدھم نہ پڑے گل جانے کے بعد اسے خشک کرلیں اور چمچہ چلا کر اسے بھون لیں اچھی طرح سے کچل کر پھر گھی ڈال کر اسے مزید بھونیں تھوڑی دیر کے بعد اس میں الائچی کے دانے ڈال دیں' چولہا آہستہ کریں اور پھر اس میں شکر ڈال کر دو منٹ چلائیں اب دیکھیں کہ اگر شکر کم لگ رہی ہے تو اور ڈال دیں' اس کے بعد اس میں جتنا میوہ ڈالنا چاہیں ڈالیں اور پھر چولہا بند کردیں' مزیدار حلوہ تیار ہے' بے حد آسان ترکیب' منفرد انداز اور آزمودہ حلوہ ہے آپ آزما کر دیکھیے۔

☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆

شہلا مشائق

سنگھار

موسم سرما کا بیوٹی پلان

نمک کے استعمال سے آپ کی جلد معمولی پھوڑے پھنسیوں سے محفوظ رہے گی یعنی صرف ایک منٹ کی محنت سے آپ نہ صرف اپنی جلد کی خوبصورتی کو برقرار رکھ سکتی ہیں بلکہ اس میں مزید نکھار بھی پیدا کرسکتی ہیں۔

جلد کی حفاظت:۔

سردیوں میں جلد کی دیکھ بھال ایک اہم مسئلہ ہے جو خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ اس موسم میں اکثر خواتین جلد کی خشک ہونے کی شکایت کرتی ہیں۔ بیسن میں لیموں کے پسے ہوئے چھلکے اور دودھ ملا کر دن میں ایک مرتبہ اس سے منہ دھوئیں، ٹماٹر کا لوشن تیار کرنے کیلئے تازہ پکے ہوئے ٹماٹروں کا رس نکال لیں اور اس میں برابر مقدار میں لیموں کا عرق ملائیں۔ روزانہ رات کو یہ لوشن اپنے چہرے پر لگائیں لیکن یاد رہے کہ لوشن روزانہ نیا اور تازہ تیار کریں۔ اس کے استعمال سے جلد چند ہی دنوں میں نکھر جائے گی۔

گاجر کا ماسک بھی جلد کی حفاظت کیلئے نہایت مفید ہے، گاجروں کو پیس کران کا رس نکال لیں۔ اس میں دودھ اور انڈے کی زردی ملا کر روزانہ اس ماسک کو چہرے پر لگائیں اور 15 منٹ بعد دھولیں۔ یہ ماسک روئی کی مدد سے چہرے پر لگائیں اور پھر چہرہ ساکت رکھیں، ورنہ جھریاں پڑ جائیں گی۔ یہ ماسک چہرے کی خشکی دور کرکے جلد کو چمکدار بناتا ہے۔ اس کے علاوہ جھریوں اور کیل مہاسوں سے نجات کیلئے چقندر کا رس لیں۔ انہیں اچھی طرح مکس کریں اور روزانہ پئیں۔ اس کے استعمال سے بہت جلد چہرے سے داغ، دھبوں، کیل مہاسوں اور جھریوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔ تازہ دہی چہرے پر لگانے سے جلد کی خشکی دور ہوتی ہے۔ مکھن کا استعمال بھی خشک جلد کو ملائم کرتا ہے۔ پیشانی کی شکنیں دور کرنے کیلئے خالص زیتون کے تیل کی آہستہ آہستہ مالش کریں۔

گردن کی حفاظت:۔

اکثر خواتین چہرے کو حسین اور دلکش بنانے کیلئے ہزاروں جتن کرتی ہیں لیکن گردن کو نظر انداز کردیتی ہیں۔ سردیوں میں گردن کی صفائی اور خوبصورتی کا خاص خیال رکھیں۔ آٹے میں دودھ اور لیموں کا عرق ملا کر گردن پر لیپ کرلیں 15 منٹ بعد ٹھنڈے یا نیم گرم پانی سے دھو ڈالیں۔ یہ عمل ہر قسم کی جلد کی حامل خواتین کرسکتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں دلکش نتائج سامنے آئیں گے۔ خصوصاً خشک جلد کی حامل خواتین بالائی میں تھوڑا سا شہد ملا کر ہفتے میں دوبار گردن پر لگائیں اس سے جلد ملائم ہوجائے گی۔

ہاتھ، بازو اور کہنیاں:۔

سردیوں میں ہاتھ، بازو اور کہنیوں کی حفاظت بھی لازمی ہے، ورنہ یہ کھردرے اور بے رونق ہوجائیں گے۔ عموماً پانی کے ساتھ کام کرنے سے ہاتھ کھردرے اور سخت ہوجاتے ہیں۔ سردیوں میں ہاتھوں کو زیادہ دیر پانی میں نہ رکھیں۔ کپڑے اور برتن دھوتے ہوئے چمڑے کے دستانوں کا استعمال کریں کام کے ختم ہوتے ہی ہاتھوں اور بازوؤں کو تولیے سے خشک کرلیں اور اچھی طرح سے کولڈ کریم لگائیں تاکہ جلد پھٹنے سے محفوظ رہے۔ بادام کے چار دانوں کو تھوڑے سے دودھ میں ملا کر پیس لیں اور یہ آمیزہ سونے سے قبل روزانہ ہاتھوں پر ملیں اس سے ہاتھ نرم و ملائم ہوجائیں گے۔ سردیوں میں شہد، گلیسرین اور لیموں کا عرق برابر تعداد میں ملا کر کہنیوں، بازوؤں پر لگانے سے حیرت انگیز نتائج حاصل ہوں گے۔